FICTION HOUSE

برٹرینڈرسل

میں مسیحی کیوں نہیں؟

مترجم: صفدر حسین

مصنف کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

کتاب کی کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی جاتی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو یا متن درست نہ ہو تو از راہ کرم مطلع فرمائیں۔ تا کہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے۔ (ناشر)

"Why I Am Not a Christian"

by: Bertrand Russell

نام کتاب	:	میں مسیحی کیوں نہیں؟
مصنف	:	برٹرینڈ رَسل
مترجم	:	صفدر حسین
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس لاہور
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	ریاض ظہور
اشاعت	:	2019ء
قیمت	:	500/-

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-36307550-1,37249218-37237430

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 022-2780608

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 021-32603056

فکشن ہاؤس

لاہور ● کراچی ● حیدر آباد

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

فہرست

تعارف

برٹرینڈ رسل کو آپ فلسفے کی تاریخ کا آخری بڑا فلسفی قرار دے سکتے ہیں۔ زندگی میں ہی اس کی شہرت تمام براعظموں تک پھیل گئی تھی اُس کی شہرت صرف علمی اور فکری حلقوں تک محدود نہ رہی تھی بلکہ ارباب ادب وفن اور تعلیم یافتہ عوام تک بھی پہنچی تھی۔ رسل کی تحریروں کو چاہنے والوں کے علاوہ ان کی مخالفت کرنے والے بھی ہر جگہ موجود تھے۔ بہت سے ایسے لوگ تھے جو رسل کو بیسویں صدی کے ضمیر کی آواز سمجھتے تھے اور اس کو تہذیب اور انسانیت کا نمائندہ خیال کرتے تھے۔ اس کی وفات کے لگ بھگ نصف صدی بعد کسی اور فلسفی کو یہ اعزاز اور یہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی ہے۔

برٹرینڈ رسل کی زیر نظر کتاب چند مضامین کا مجموعہ ہے جو مذہب اور انسانی زندگی میں اس کے کردار پر رسل کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ کتاب ''Why I am not a Christan?'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی جو اس میں شامل ایک مضمون کا عنوان بھی ہے۔ یہ رسل کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں شامل ہے۔

تاریخ کی سب زیادہ ہنگامہ خیز بیسویں صدی کے آغاز پر، جب کہ رسل ابھی نوجوان تھا، اس نے اپنی ایک تحریر میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ بیسوی صدی آزاد خیالی، عقل پسندی اور سیکرلرازم کی صدی ہوگی جب کہ انسان مقدس رہنماؤں سے بے نیاز ہو کر سائنسی اور معروضی انداز سے اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل حل کرنا چاہیں گے۔ دنیا کے کئی کونوں میں بھی اِس امید کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اس امید کے ساتھ یہ دعوے بھی کئے جا رہے تھے کہ مذہب کی بالادستی کے زمانے ختم ہونے کو ہیں۔

وہ دن بیت گئے۔ وہ زمانے ماضی کا حصہ بن گئے۔ آج ہم اکیسویں صدی کی تیسری دہائی کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ رسل کی رائے صرف جزوی طور پر صحیح ثابت ہوئی کیونکہ عالمی سطح پر گزشتہ صدی کے پہلے چھ عشروں میں اگر چہ لبرل خیالات فروغ پاتے رہے لیکن بعد میں تبدیلی کی ہوا چلنے لگی۔ اول اول مسلمانوں میں احیائے مذہب کی تحریکیں نمایاں ہونے لگیں اور مسلم دنیا کے مختلف حصوں میں ان کا اظہار کئی طریقوں سے ہوا۔

پھر ہندو اور مسیحی دنیاؤں میں بھی مذہبی رجحانات منظر عام پر آنے لگے۔

خیر، اس کا یہ مطلب نہیں کہ رسل کی اس کتاب کی اہمیت ختم ہو گئی ہے۔ ہماری زندگیوں میں مذہب کے کردار خود مذہب کی ماہیت کے موضوع پر بیسویں صدی کے ممتاز ترین ترین دانش ور کے خیالات کے مرقع کے طور پر اس کتاب کی اہمیت برقرار ہے۔ گویا یہ ایک اہم خیال انگیز کتاب ہے جو غیر روایتی طریقے سے دنیا اور زندگی کو دیکھنے کی تحریک دیتی رہے گی۔

یہ کتاب، رسل کی دوسری کتابوں کی طرح، دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ اردو ترجمہ تاخیر سے منظر عام پر آیا ہے، لیکن یہ ایک معیاری اور قابل فہم ترجمہ ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ مترجم قارئین کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ وہ قارئین سے محبت کرتا ہے اور کتاب کے مندرجات کو سمجھنے میں ان کی مدد کرنے پر آمادہ ہے۔ کتاب ''فکشن ہاؤس'' کے وسیلے سے بازار میں آئی ہے جو ہمارے ملک میں فکری ادب کی اشاعت کا ممتاز ادارہ ہے۔

قاضی جاوید

دیباچہ

پروفیسر ایڈورڈ نے میرے اُن بہت سے مضامین جن کا تعلق مذہبی نقطہ نظر سے تھا دوبارہ چھاپ دیئے ہیں اِس کے لئے میں اُن کا بے حد مشکور ہوں۔ خاص طور پر اُن قابل تعریف خیالات کے اظہار پر جو اُنہوں نے اپنے تمہیدی تبصرے میں تحریر کئے ہیں مجھے اس اَمر پر بطور خاص خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ مجھے اپنے پختہ نقطہ نظر کے اظہار کا دوبارہ موقع فراہم ہو رہا ہے۔

میں پہلے یہ اَمر واضع کر دوں کہ پچھلے چند سالوں میں میرے بارے میں افواہیں گردش کرتی رہی ہیں کہ اب میں مذہبی قدامت پرستی کا اُتنا بڑا نقاد نہیں رہا جتنا کے ماضی میں ہوا کرتا تھا۔ اِس قسم کی افواہیں قطعی طور پر بے بنیاد ہیں۔ حالانکہ ہمیشہ سے میرے نزدیک تمام بڑے بڑے مذاہب مثلاً بدھ ازم، عیسائیت، ہندو ازم، اسلام اور کیمونزم نہ صرف جھوٹے ہیں۔ بلکہ انسانیت کے لئے ضرر رساں بھی اس منطق کی رُو سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ چونکہ اِن میں کسی قسم کی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی اِس لئے یہ سب کے سب بے بنیاد ہیں اور یہ کسی کام کے نہیں۔ مثلاً چند ایک استثناء چھوڑ کر ہر شخص کا وہی مذہب ہوتا ہے جس کمیونٹی میں وہ پیدا ہوتا ہے جس سے یہ ثابت ہے کہ ماحول ہی ہوتا ہے جو اُس کو صرف وہیں رائج مذہب کو قبول کرنے میں مجبور کرتا ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ بے شمار قسم کے روائتی دلائل جو خدا کے وجود کو ثابت کرتے ہیں بہت سے ممتاز عالم اُنہیں مزید "قابل قبول بنا کر آگے بڑھاتے ہیں۔ لیکن وہ منطق جس کے تحت یہ دلائل قبولیت اختیار کرتے ہیں ارسطو کی طرز کا نہائیت دقیانوسی طریقہ کار ہے جسے سوائے کیتھولک چرچ تمام فلسفہ دان مسترد کر چکے ہیں باقی صرف ایک ہی دلیل رہ جاتی ہے اور وہ ہے لوحِ ازل پر لکھا ہوا جو کسی طرح بھی منطق پر پوری نہیں اُترتی ہاں یہ دلیل اُسی وقت منطقی اعتبار سے کسی قدر وزن رکھ سکتی ہے جب خدا کی مطلق العنانیت ہی کو خیر باد کہہ دیا جائے۔ تاہم کوئی بھی دلیل برمحل ہو یا معتدل اِس سے قطع نظر مجھے اُن لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جو مجموعی طور پر کائنات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی قادرِ مطلق ہر شے جاننے والے اور سب سے عظیم خیر

خواہ دیوتا نے کروڑوں سال اِس بے رُوح دھرتی کو ایسا اکھاڑہ بنانے میں صرف کر دیئے کہ جب اُس نے مناسب سمجھا اس میں ہٹلر، سٹالن اور ہائیڈروجن بم ظاہر کر دیئے۔ اس سب کے باوجود یہ بات طے ہے کہ کسی مذہب کا سچا ہونا ایک الگ بات ہے جبکہ اس کی افادیت دوسری، اس نقطے پر میں یہی کہوں گا کہ جتنا مجھے یہ یقین ہے کہ مذہب ضرر رساں ہوتا ہے اُتنے ہی یقین سے میں یہ کہتا ہوں کہ یہ غلط اور بے بنیاد ہے۔

مذہب کی ضرر رسانی دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جس کا انحصار اِس پر ہوتا ہے کہ وہ عقیدہ کس قسم کا ہے اور جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اُسے کیا ہونا چاہیے اور اُس میں کیا متعارف کرایا گیا ہے اور دوسرا وہ ہے جس میں کچھ طے شدہ اصول ہوتے ہیں جن پر ایمان رکھنا لازم ہے۔ جہاں تک عقیدے کی قسم کا تعلق ہے۔ یہی خیال کیا جاتا ہے کہ جو پارسا اور پرہیز گار ہو وہی ایمان والا ہوتا ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس عقیدہ پر ایمان ناقابل شکست ہونا چاہیے اور کہیں متزلزل نہیں ہونا چاہیے اور اگر کہیں کوئی مخالفانہ شہادت شکوک وشبہات پیدا بھی ہوں تو اُس شہادت کو وہیں دفن کر دینا چاہیے چہ جائیکہ اِس پر غور وفکر کر لیا جائے۔ اس قسم کے عقیدے کے ہوتے ہوئے نوجوانوں پر مخالفانہ نقطہ نظر کو سننا سرکاری طور پر ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے مثلاً روس میں سرمایہ داری کے حق میں کچھ کہنا سختی سے منع ہے تو امریکہ میں کمیونزم کے حق میں بات کرنا منع ہے اِس قسم کے عقیدہ مخالف دھڑوں کے اندر جنگی جنون کی جکڑ بندی کی وجہ سے اتحاد برقرار رہتا ہے تو دوسری طرف یہ دھڑے بندی باہمی جنگ وجدل کی طرف مائل کرتی ہے۔ قصہ مختصر کوئی بھی ایسا عقیدہ جو اس بات کا پرچار کرے کہ فلاں فلاں پر ایمان رکھنا لازم ہے چاہے آزادانہ تحقیق کا نتیجہ اِس کے برعکس ہی کیوں نہ ہو اس قسم کا رویہ تقریباً تمام مذاہب میں ایک مشترکہ لازمے کی حیثیت رکھتا ہے جس سے ریاستی تعلیمی نظام بُری طرح متاثر ہوتا ہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوانوں کی ذہنی وفطری نشوونما ایک نقطے پر آ کر رُک جاتی ہے۔ اِن کے ذہنوں میں دوسری طرف کے جنونیوں کے خلاف آگ بھڑکا دی جاتی ہے بلکہ اُس سے بھی زیادہ شدت سے اُن کے خلاف نفرتیں اُمڈ آتی ہیں جو ہر قسم کے جنون اور تعصب کے خلاف سینہ سپر ہوتے ہیں اگر نظریات سے متعلق اچھی طرح چھان بین اور جانچ پڑتال کی عادت ڈال دی جائے اور اُن پر اُتنا ہی یقین کیا جائے جتنا کہ اُن کے بارے میں دستیاب شہادتیں تصدیق کریں اگر اس قسم کی عادت معاشروں میں ایک معمول بن جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ آج دُنیا جس قسم کی مصیبتوں میں گھری ہوئی ہے اُن کا کافی حد تک ازالہ ہو سکتا ہے لیکن بدقسمتی سے موجودہ حالات میں اکثر وبیشتر ممالک میں تعلیم اِس پیرائے میں دی جاتی ہے کہ ایسی عادت کہیں بھی کسی طرح بھی پنپنے نہ پائے اگر کوئی شخص کسی ایسے نظام میں بے بنیاد لگے بندھے

نظریات کو قبول کرنے اور اُن کا پرچار کرنے سے انکار کردے تو اُسے نوجوانوں کو تعلیم دینے کے اہل ہی نہیں سمجھا جاتا۔

مندرجہ بالا میں بیان کی گئیں برائیاں محض کسی مخصوص قسم کے عقیدے کا خاصہ نہیں بلکہ ہر اُس نظریے، عقیدے اور مذہب کا یہی حال ہے جو رٹے رٹائے جملوں اور اقوال پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر و بیشتر مذاہب میں کچھ مخصوص قسم کے ایسے اخلاقی قوانین و اصول موجود ہیں جو ضرر رسانی کا باعث ہوتے ہیں مثلاً اگر برتھ کنٹرول کی مخالفت کے متعلق کیتھولک نقطہ نظر غائب ہو جائے تو غربت اور جنگ پر قابو پانا ممکن ہو جائے گا اِسی طرح ہندازم میں گائے کو مقدس قرار دینا یا بیوہ کی دوسری شادی کو لعنت قرار دینا معاشرے میں لاتعداد اذیتوں کا باعث ہوتا ہے اس طرح کیمونزم پر پختہ یقین رکھنے والی اقلیت کی مطلق العنانیت نے دُنیا میں انسانوں کے درمیان نفرتوں کی ایسی بے مثال دیوار کھڑی کر دی ہے جو گرنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

بعض دفعہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ آفادیت کے حوالے سے جنون ہی ایک سماجی گروہ کو مؤثر بنا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تاریخ کے اسباق کے بالکل برعکس ہے۔ ایسے خیال کی تعریف و حمائت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اندھا دُھند غلامانہ ذہنیت کے زیر اثر صرف کامیابی کی پُوجا کرتے ہوئے اُس کے موثر ہونے کی تعریف کیے جاتے ہیں اُنہیں اِس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اُن کے اِس روّیے سے کیا متاثر ہو رہا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں چاہوں گا کہ ایک چھوٹی سی اچھائی کر دوں نہ کہ بہت بڑا نقصان، میری خواہش ہے کہ میں ایسی دُنیا دیکھ پاؤں جو گروہی تصادموں سے پاک ہو جہاں ہر شخص ایک دوسرے کے لئے تنازعات و تصادموں کی بجائے باہمی تعاون کے ذریعے خوشیاں تلاش کرے۔ میں ایک ایسی دُنیا کا خواہشمند ہوں جہاں تعلیم کا مقصد نوجوانوں کے اذہانوں کو گھڑے گھڑائے نظریات کے دائرے میں مقید کرنے کے بجائے ایسا آزادنہ و غیر جانبدارانہ ماحول مہیا کیا جائے تاکہ وہ اپنی بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے دُنیا کو آگے بڑھا سکیں۔ اِس وقت کھلے دلوں اور تعصّبات سے پاک کھلے اذہان کی ضرورت ہے یہ اُسی وقت ممکن ہے جبکہ نوجوانوں پر اُوپر سے کوئی نیا یا پرانا سخت گیر نظام مسلط نہ کیا جائے۔ یہی وہ شرط لازم ہے جس سے اِس دنیا کو خوبصورت بنایا جا سکتا ہے۔

برٹرینڈ رسل

باب ـــ ۱

میں مسیحی کیوں نہیں؟

چیئرمین کی وساطت سے آپ کو آگاہی ہو چکی ہو گی کہ آج کی نشست کا موضوعِ گفتگو ''میں مسیحی کیوں نہیں؟'' اِس بات کی وضاحت کے لیے سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے کہ ظاہری اور عملی طور پر لفظ ''مسیحی'' سے کیا مراد ہے۔ میرے نزدیک موجودہ دور میں اِس نُقطہ کے متعلق اکثر لوگوں کا اِدراک بہت مبہم اور غیر واضع ہے۔ کچھ لوگ تو محض یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص ایمانداری سے صاف سُتھری زندگی گزارتا ہے وہی مسیحی ہے۔ اِس حوالے سے تو تمام عقائد و مسالک کے لوگوں کو مسیحی مان لینا چاہیے۔ مگر میرے فہم کے مطابق یہ نقطۂ نظر دُرست نہیں کیونکہ اِس سے یہی مُراد لی جائے گی کہ مسیحیوں کے علاوہ دوسرے تمام مذاہب مثلاً بُدھ مت، اِسلام، ہندومت اور کنفیوشس کو ماننے والے صاف سُتھری زندگی گزارنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ میں سمجھتا ہوں وہ شخص مسیحی نہیں ہوسکتا جو محض صاف سُتھری زندگی گزارتا ہو۔ میرے خیال میں کسی اِنسان کے مسیحی ہونے کے لیے مخصوص عقائد کا حامل ہونا لازمی بات ہے۔ سینٹ آگسٹائن اور سینٹ تھامس آکینس کے ادوار میں جس شدومد کے ساتھ مسیحی ہونے کا مطلب لیا جاتا تھا آج وہ شدت نظر نہیں آتی۔ اُس زمانے کے حالات ایسے تھے کہ اگر کوئی کہتا کہ میں مسیحی ہوں تو اِس سے یہ اخذ کرلیا جاتا کہ وہ شخص پورے جوش وجذبے اور خلوص کے ساتھ اُن تمام عقائد پر بے کم وکاست یقین رکھتا ہے جو عیسائیت کے ساتھ مُنسلک تھے۔

تو پھر اصل میں مسیحی کون اور کیا ہوتا ہے؟

موجودہ دور کے معاملات مختلف ہیں۔ آج مسیحیت کے معنی کیا ہیں اِس سِلسلے میں غور کرنے کے لیے اِبہام کو مزید وسعت دینی ہوگی۔ میرے خیال میں مسیحی کہلانے کے لیے دو مختلف عناصر کا ہونا لازم ہے۔ کٹڑپن پر مبنی عقیدہ جس میں ترمیم کی گنجائش نہ ہو اور اِس کے ساتھ ہی خدا اور اُس کی ابدیت پر پختہ یقین وایمان۔ اگر آپ اِن دو عناصر (خُدا اور اُس کی ابدیت) پر یقین نہیں رکھتے تو پھر میرے خیال میں

آپ مناسب طور پر خود کو مسیحی نہیں کہلا سکتے۔ اس کے علاوہ کرائسٹ کے بارے میں کسی نہ کسی قسم کا عقیدہ بھی لازم ہے۔ کیونکہ مسلمان بھی خدا اور اُس کی ابدیت پر یقین رکھتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ خود کو مسیحی نہیں کہلواتے۔ میرے خیال میں مسیحی ہونے کے لیے آپ پر لازم ہے کہ کرائسٹ کو اگر کوئی خدا کا مثل نہ بھی سمجھے تو پھر بھی اُسے کم از کم دُنیا کا بہترین اور ذہین ترین شخص کا درجہ ضرور دینا ہوگا اور اگر آپ کرائسٹ کے بارے میں ایسا عقیدہ نہیں رکھتے تو میرے خیال میں آپ مسیحی کہلانے کے کسی طور پر حقدار نہیں ہو سکتے۔ دُنیا بھر کے نقشہ جات کے علاوہ جغرافیائی طور پر پوری دُنیا عیسائیوں، مسلمانوں، بُدھوں اور فٹیش پجاریوں وغیرہ میں بٹی ہوئی ہے اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس خطے میں بسنے والے ہم تمام لوگ مسیحی ہیں۔ تاہم اس حوالے کو بھی میں سمجھتا ہوں نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے جب میں کہتا ہوں کہ میں مسیحی کیوں نہیں تو مجھے آپ کو دو مختلف چیزوں کے بارے میں آگاہ کرنا ہوگا۔ پہلی یہ کہ میں خدا اور اُس کی ابدیت پر یقین کیوں نہیں رکھتا۔ دوسرا یہ کہ میں کرائسٹ کو بہترین اور ذہین ترین شخص کیوں نہیں سمجھتا۔ اگر چہ میں اُس کے اعلیٰ اِخلاق کی وجہ سے اُسکا بے حد احترام کرتا ہوں۔

اگر ماضی میں ناستک حضرات کی کامیاب کوششیں شاملِ حال نہ ہوتیں تو میں مسیحیت کے معنوں کو اِتنے لچکدار انداز میں یوں بیان نہ کر پاتا جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ پرانے وقتوں میں مسیحیت کو بڑی شدومد سے مانا اور جانا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر اس کا اِنجام جہنم پر ہوتا تھا، ابدی جہنم پر ایمان مسیحیت کا لازمی جزو تھا اور جہنم میں آگ ایک لازمی جزو تھی۔ اِس عقیدے پر ماضی قریب تک ایسے ہی تصورات غالب رہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ پریوی کونسل کے فیصلے کے بعد سے آگ کے عنصر کو ختم کر دیا گیا۔ لہٰذا آگ اب لازمی نہیں۔ اگر چہ آرچ بشپ آف کنٹربری اور آرچ بشپ آف یارک نے اس سے شدید اختلاف ظاہر کیا تاہم اِس مُلک میں مذہب کیا ہو یا کیسا ہو پارلیمنٹ کے وضع کردہ قوانین سے طے ہوتا ہے اسی لیے پریوی کونسل اِس قابل تھی کہ وہ بشپوں کی مخالفت رَد کرنے میں کامیاب رہی۔ نتیجتاً ایک مسیحی کے لیے جہنم پر ایمان رکھنا لازمی نہیں رہا اور آخر میں میں اِس بات پر اِصرار نہیں کروں گا کہ ایک مسیحی پر لازم ہے کہ وہ جہنم پر ایمان رکھتا ہو۔

خدا کا وجود

جہاں تک خدا کے ہونے کا تعلق ہے۔ یہ بہت سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اگر میں اِس مسئلے پر تفصیل سے اپنے خیالات کا اِظہار شروع کر دوں تو بیان اِتنا طویل ہو جائے گا کہ مسیحی بادشاہت بھی آ جائے تو بیان ختم نہ ہو سکے گا۔ اِس لیے آپ مجھے اِجازت دیں کہ میں اِس کو مختصر الفاظ میں بیان کر دوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ

کو یقینی طور پر معلوم ہے کہ کیتھولک چرچ نے عقیدے کے طور پر دعویٰ کیا ہے کہ خدا کے وجود کو بغیر دلیل کے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک عجیب و غریب منطق ہے۔ اگرچہ یہ بھی اور دوسرے بہت سے عقیدوں میں سے ایک عقیدہ ہے۔ چرچ کو بلا دلیل اس عقیدے کو اس لیے متعارف کرانا پڑا کہ اُن دنوں آزاد خیال لوگوں نے خدا پر یقین رکھنے کے باوجود یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ فلاں فلاں دلائل کی رُو سے خدا کے تصور کو رَد کیا جا سکتا ہے۔ اِس طرح ایک طویل بحث شروع ہو گئی تھی۔ ایسی صورتِ حال میں کیتھولک چرچ نے محسوس کیا کہ ایسی بحث کو فوری طور پر بند ہو جانا چاہیے اِس لیے اُنہوں نے اعلان کر دیا کہ خدا کو تسلیم کرنے کے لیے کسی دلیل یا جواز کی ضرورت نہیں۔ تاہم پھر بھی اُنہیں اُس کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے ایسے دلائل کا سہارا لینا پڑا جو اُنکے نزدیک واقعی دلائل تھے۔ اگرچہ اِس طرح کے دلائل کی فہرست بہت طویل ہے لیکن میں اُن میں سے محض چند ایک کا ذِکر کروں گا۔

اِبتدائی وقوع پذیری کی دلیل

اِبتدائی وقوع پذیری کی دلیل شائد سب سے زیادہ سادہ اور سمجھنے میں سب سے زیادہ آسان ہے۔ اِس کے مطابق دُنیا میں ہر چیز جس کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں اِس کا کوئی نہ کوئی موجب ہے۔ یا کوئی نہ کوئی اِس کا بنانے والا ہے اور جیسے جیسے ہم پیچھے کی طرف کڑیوں کو مِلاتے چلے جاتے ہیں تو آخر میں ہم ایک ایسے تخلیق کار تک پہنچ جاتے ہیں جس کو آپ خدا کا نام دیتے ہیں۔ میرے نزدیک اِس دلیل میں کوئی وزن نہیں رہا موجب Cause کے معنی گزرے دور میں وہ نہیں لیے جاتے تھے جن معنوں میں یہ آج اِستعمال ہوتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفیوں اور سائنسدانوں نے ''موجب ہونے'' Cause پر بے حد کام کیا لیکن اِس میں ناگزیریت جیسی کوئی بات نہیں پائی گئی جیسا کہ ماضی بعید میں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اِن سب باتوں سے قطع نظر یہ دلیل کہ یہ جہان سب سے پہلے کس نے بنایا ہوگا اِس میں کوئی صداقت نہیں مجھے اعتراف ہے کہ جب میں نوجوان تھا میں اِس سوال پر بڑی سنجیدگی سے غور و فکر کیا کرتا تھا اور بڑے طویل عرصے تک اِس دلیل کی صحت کو درست تصور کیا کرتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اٹھارہ سال کی عُمر میں جان سٹیورڈ کی آپ بیتی پڑھتے ہوئے یہ تحریر میری نظر سے گزری ''میرے والد نے مجھے زور دے کر بتایا'' کہ ''مجھے کس نے بنایا'' کا جواب دیا ہی نہیں جا سکتا کیونکہ اِس کے ساتھ ہی یہ سوال کھڑا ہو جاتا ہے کہ ''خُدا کو کس نے بنایا'' اِس سیدھے سادے فقرے نے مجھ پر اِس دلیل کی لغویت عیاں کر دی۔ اگر لازم ہے کہ ہر شئے کا کوئی بنانے والا ہو تو پھر خدا کو بنانے والا لازم ٹھہرتا ہے۔ یوں اِس دلیل میں کوئی وزن نہیں رہتا۔ اگر کوئی شئے بغیرِ کسی مقصد کے ہے تو پھر خدا بھی بغیر کسی مقصد کے ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک ہندو کا خیال تھا کہ دُنیا ایک ہاتھی پر کھڑی ہے اور

پھر خود ہاتھی ایک کچھوے پر کھڑا ہے اور جب اُس سے پوچھا گیا کہ خود کچھوے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو جب کوئی جواب نہ سوجھا تو بولا ''چلو کوئی اور بات کریں'' میرے خیال میں کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے کہ کسی بنانے والے کے بغیر بھی دُنیا وجود میں آسکتی تھی۔ دوسری طرف یہ کہ کیوں نہ فرض کر لیا جائے کہ دُنیا ہمیشہ سے موجود تھی۔ مزید یہ کہ ایسی کوئی وجہ موجود نہیں جس کی بنیاد پر فرض کر لیا جائے کہ دُنیا کا کوئی آغاز بھی تھا اور یہ خیال کہ ہر شئے کا آغاز ہوتا ہے محض ہمارے تصور کی پسماندگی ہے۔ اِس لیے ''اس جہان کو کوئی بنانے والا ہے'' جیسی دلیل پر مزید بحث کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

قدرتی قانون کی دلیل

قدرتی قانون سے متعلق ایک اور بھی عام قسم کی دلیل موجود ہے جو لوگوں میں خاصی مقبول ہے۔ خاص طور پر اٹھارویں صدی میں اِزاق نیوٹن کے تخلیق کائنات کے تصور کے زیرِ اثر اِس کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ لوگوں کا مشاہدہ تھا کہ کششِ ثقل کے قانون کے تحت سیارے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں تو اِس سے اُنہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خدا نے سیاروں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ اُسی خاص انداز سے سورج کے گرد گھومتے رہیں اور یوں وہ ایسا کرنے میں مگن ہیں درحقیقت یہ ایک آسان اور سادہ سی وضاحت تھی جس سے وہ اِتنے مطمئن ہو گئے کہ اُنہوں نے کششِ ثقل کے قانون میں کسی مزید تحقیق کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن ایک زمانہ گذرنے کے بعد آجکل ہم آئن سٹائن کے متعارف کردہ قوانین کی روشنی میں قدرے پیچیدہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ میں یہاں آئن سٹائن کے دریافت کردہ قوانین کو بیان کرنے کی ضرورت اِس لیے نہیں سمجھتا کہ بات غیر ضروری طور پر طویل ہو جائے گی۔ تاہم نیوٹن کے دریافت کردہ وہ قوانین متروک ہو چکے ہیں جس سے مخصوص وجوہات کی بناء پر یہ سمجھ نہیں آسکتی تھی کہ قدرت کا رویہ ہمیشہ یکساں ہوتا ہے۔ ہم بہت سی ایسی چیزوں کو جانتے ہیں جن کو ہم ماضی میں قدرتی قانون کے طور پر جانتے اور پہچانتے تھے لیکن یہ بہت بعد میں پتہ چلا کہ دراصل وہ اُس وقت کے لوگوں کی اکثریت کی حتمی رائے ہوا کرتی تھی۔ مثال کے طور پر آپ کائنات کی وسعتوں میں کتنا ہی دُور دراز سفر کرتے ہوئے چلے جائیں ایک گز میں تین فٹ ہی پائیں گے گو کہ یہ ایک ناقابلِ استرداد حقیقت ہے اِس کے باوجود اِس کو ایک قدرتی قانون قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن جب آپ عِلمی تحقیق میں مصروف ہو کر ایٹموں کی حرکت کا مطالعہ کرتے ہیں تب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اُن کی حرکت لوگوں کی توقعات سے بہت ہی کم کسی قانون سے مشروط ہوتی ہے ایسی بنیاد پر آپ جو بھی قانون وضع کریں گے ایک طرف تو وہ اعداد و شُمار کے اعتبار سے لگ بھگ نوعیت کا ہوگا اور دوسری طرف وہ محض اِتفاق پر مبنی۔ اِس کی مزید وضاحت لُڈو میں استعمال ہونے

والے پانسے سے ہوتی ہے اگر 36 دفعہ پانسہ پھینکنے سے صرف ایک دفعہ 6 آئے تو پانسے کے گرنے کے نتیجے کو کسی طرح بھی کسی منصوبہ بندی سے جڑا ہوا قرار نہیں دے سکتے ہاں اگر اس کے برعکس 36 دفعہ پھینکنے سے 36 دفعہ ڈبل 6 آئے تب تو ہمیں لازمی طور پر سوچنا پڑے گا کہیں نہ کہیں منصوبہ بندی موجود ہے۔ قدرت کے قوانین کی نوعیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ ایک تو وہ لگ بھگ قسم کے ہوتے ہیں جبکہ اُن میں چانس کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اِسی لیے ماضی میں قدرتی قوانین جتنے مرعوب کُن ہوا کرتے تھے آج وہ اُتنے اثر انگریز نہیں رہے سائنس کی رُو سے جن قوانین کو ہم آج درُست سمجھتے ہیں کل اُسی کی رُو سے غلط بھی ثابت ہو سکتے ہیں لہٰذا وہ قدرتی قوانین جن سے آج ہم آشنا ہیں اُن کی عارضی جانکاری سے قطع نظر یہ خیال کہ قدرتی قانون اِس امر کی دلالت کرتا ہے کہ کوئی قانون دینے والا ہے اِس اُلجھن کے باعث پیدا ہوتا ہے کہ قدرتی قوانین اور اِنسانی قوانین میں اِمتیاز نہیں کیا جاتا۔ اِنسانی قوانین کُچھ اِس طرح سے ہوتے ہیں کہ آپ کو حکماً ایک خاص سمت میں طرزِ عمل اِختیار کرنا ہوتا ہے۔ آیا آپ ویسا طرزِ عمل اِختیار کرتے ہیں یا نہیں یہ آپ پر منحصر ہے۔ جبکہ قدرتی قانون محض بیان ہوتا ہے کہ چیزوں کا طرزِ عمل کیسا ہوتا ہے اور یوں حقیقت میں چیزیں کیسے حرکت کرتی ہیں کے بیان کی بُنیاد پر یہ دلیل ہرگز نہیں دی جاسکتی کہ کوئی ایسا ہے جو اُن چیزوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایسا کریں۔ کیونکہ اِس سے فوراً یہ سوال کھڑا ہو جاتا ہے کہ خدا نے محض اُنہیں قوانین کا اجراء کرنے پر اِکتفا کیوں کیا اور یہ کہ دوسرے قوانین کیوں جاری نہیں کیے؟ اگر آپ کا یہ کہنا ہے کہ ''اُس کی مرضی جیسا چاہے کرے'' جب بات مرضی پر آ جائے تب قدرتی قوانین کی گاڑی وہیں ٹھپ ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر آپ کہتے ہیں (جیسا کہ مذہبی پیشواؤں کا کہنا ہے) کہ خدا کے جاری کردہ تمام قوانین میں کوئی نہ کوئی وجہ پنہاں ہوتی ہے اور وہ وجہ لازمی طور پر یہ ہے کہ کائنات کو بہترین بنایا جائے لیکن یہ کتنی بہترین ہے آپ شائد اِس پر ایک نظر ڈالنا بھی گوارہ نہ کریں۔ مزید یہ کہ اگر اُن قوانین کو جاری کرنے کی کوئی اور وجہ موجود ہے تو پھر خدا بھی کسی قانون سے مشروط ہو سکتا ہے لہٰذا خدا کے حکم کو بیچ میں لا کر کسی بھی قسم کی افادیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ البتہ قانون تو ہوتا ہے لیکن یہ الٰہی فرمان کے دائرہ سے باہر ہوتا ہے بلکہ مخالف سمت میں واقع ہے۔ یوں خدا آپ کے مقصد میں کام نہیں آ سکتا کیونکہ وہ قانون دینے والا ہے ہی نہیں قصہ مختصر قدرتی قانون کے تمام دلائل میں مجموعی طور پر اِتنی قوت نہیں رہی جتنی ماضی میں ہوا کرتی تھی۔ وہ دلائل جو خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے دیئے جاتے ہیں وقت گذرنے کے ساتھ بتدریج اپنی خصوصیت اور اہمیت کھو رہے ہیں۔ پہلے وہ بہت سخت ہوا کرتے تھے جس میں بے شُمار فضولیات بھی شامل تھیں۔ جب سے جدید دور کا آغاز ہوا ہے اُن دلائل میں جہاں عقل و دانش کے اعتبار سے مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے وہاں اُن پر اِخلاقیات کی دُھند زیادہ تیزی سے سیاہی مائل ہو رہی ہے۔

حکمت اور لوح ازل پر لکھے ہوئے کی دلیل

اِس سلسلے میں اگلی دلیل حکمت کی دی جاتی ہے۔ اِس دلیل کے مطابق یہ دُنیا اِس حکمت کے تحت بنائی گئی ہے تا کہ ہم اِس میں مناسب طریقے سے زندگی گزار سکیں۔ اگر یہ دُنیا اِس سے ذرا سی بھی مختلف ہوتی تو ہم اِس میں بالکل بھی نہ رہ پاتے۔ یہی دلیل حکمت کی رُوح ہے۔ اِس دلیل کو اگر قبول کر بھی لیا جائے تو اِس کے تحت بعض اوقات بڑی مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے مثال کے طور پر خرگوش کی دُم سفید اِس لیے بنائی گئی ہے کہ اِس کو شکاری آسانی سے نشانہ بنا سکیں مجھے نہیں معلوم کہ اِس حکمت کا خرگوش کو علم ہو جائے تو اُس کا رَدِّعمل کیا ہوگا کیونکہ خدا تو خرگوش کا بھی ہے۔ یہ ایک ایسی مضحکہ خیز دلیل ہے جیسے والٹیئر نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ناک بنانے میں قدرت کی یہ حکمت ہے کہ اِس پر عینک فِٹ آ جائے۔ اِس قسم کا مزاحیہ جُملہ اٹھارویں صدی میں اِتنا موزوں نظر نہیں آتا تھا جتنا کہ یہ آج حسبِ حال معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہم ڈارون کی وساطت سے جانتے ہیں کہ زندہ اجسام کیوں ماحول کے مطابق ڈھلتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ ماحول ایسا بنایا گیا کہ زندہ اجسام اُس میں مناسب طور پر رہ سکیں۔ بلکہ اصل میں ہوتا یہ ہے کہ زندگی ماحول کی مناسبت سے خود کو ڈھالتے ہوئے پھلتی پھولتی اور پرورش پاتی ہے اور یہی اصول اختراع کی بنیاد ہے۔ اس لیے اس میں کِسی قسم کی حکمت نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ جب آپ قدرت کو حکمت کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ حیران کُن پہلو سامنے آئے گا کہ وہ جو ہر شئے جاننے والا ہے اور وہ جو قادرِ مطلق ہے اُسے اِس دُنیا کو اپنی تمام تراشیا اور خامیوں سمیت بنانے میں کروڑوں سال لگ گئے۔ عام لوگ تو اِس کو بہترین جان اور مان سکتے ہیں لیکن میں اس پر یقین نہیں کر سکتا۔ ذرا تصور کریں اگر آپ کے پاس علم کُل ہوتا اور قدرت کاملہ بھی میسر ہوتی اور اس دُنیا کو بہترین بنانے کی لیے کروڑوں سال بھی تو کیا آپ ایسی ہی دُنیا تخلیق کر پاتے جس میں غُربت، افلاس، جہالت اور فاشزم اپنے عروج پر ہوتا! تو کیا یہ مضحکہ خیز نہیں ہے؟ تو کیا یہ آپ کی بیچارگی یا بے بسی نہ ہوتی مزید یہ کہ اگر آپ کو سائنس کے عام قوانین کی جانکاری ہے تو پھر آپ کو یہ بھی فرض کرنا پڑے گا کہ اِس سیارے میں نہ صرف اِنسانی زندگی بلکہ ہر قسم کے جیون کا ایک خاص عرصے میں خاتمہ ہونے والا ہے کیونکہ اِس وقت کائنات میں ہمارا نظامِ شمسی زوال کے مرحلے میں ہے۔ اِس کے زوال کے ایک خاص مرحلے پر آپ اِس سیارے میں ایک خاص درجہ حرارت اور دوسرے ایسے لوازمات پاتے ہیں جو زندگی کی نشوونما کے لیے سازگار ہوتے ہیں تاہم یہ صورتِ حال ایک طویل عرصے تک جوں کی توں نہیں رہے گی۔ نظامِ شمسی کی پوری زندگی کے مقابلے میں جیون نہایت مختصر عرصہ تک ہی پنپ سکے گا اور بالآخر اِس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ سیارہ زمین پر مستقبل میں چاند جیسی تبدیلیاں رُونما ہونے جا

رہی ہیں ایسی مکمل منجمد فضا جس میں کسی ذی رُوح کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مجھے کہا جاتا ہے کہ اِس قسم کے خیالات نہایت تکلیف دہ ہیں۔لوگ بعض اوقات کہتے ہیں کہ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں رہیں گے تو اِس پر یقین کرنے کی ضرورت نہیں یہ سب بکواس ہے۔کسی کو بھی اِس بات سے لینا دینا نہیں کہ اب سے کروڑوں سال بعد کیا ہونے والا ہے۔اِس پر کسی کو بھی کِسی قسم کی پریشانی نہیں البتہ اگر کُچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہاں آج سے کروڑوں سال بعد جو کُچھ ہونے والا ہے اُس سے ہم بڑے پریشان ہیں تو وہ خود کو دھوکہ دیتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ لوگ بے حد معمولی باتوں پر ہی پریشان ہو جاتے ہیں چاہے وہ معمولی قسم کی بدہضمی ہی کیوں نہ ہو لیکن کسی کو بھی اِس خیال سے سروکار نہیں ہوتا کہ اب سے کروڑوں سال بعد اِس دُنیا کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔میں بعض دفعہ سوچتا ہوں کہ جس طرح لوگوں کا اپنی زندگی کے بارے میں رویہ ہوتا ہے یہ خیال اُنکے لیے باعثِ اطمینان بھی ہوتا ہے۔ایسا قطعی نہیں ہوتا کہ وہ اِس بارے میں بیچارگی کا شکار ہو جائیں۔بلکہ اُنہیں یہ خیال دوسرے مسائل کے حل کے لیے توجہ دینے کی طرف موڑ دیتا ہے۔

دیوتا کے بارے میں اِخلاقی دلائل

اب ہم ایک قدم مزید آگے بڑھتے ہیں جس کو میں عقل وفہم کی تنزلی کا نام دیتا ہوں جس میں خدا کے وجود کے بارے میں آستک حضرات وہ دلائل دیتے ہیں جنہیں اِخلاقی دلائل کہا جاتا ہے۔یہ باتیں عام ہیں کہ پرانے زمانوں میں خدا کے وجود کے بارے میں تین طرح کے دانشوارانہ دلائل پیش کئے جاتے تھے اُن سب کو امانوئیل کانٹ نے اپنی کتاب ”کریٹِک آف پیور ریزن“ (Critique of Pure Reason) میں پُوری طرح مُسترد کر دیا تھا۔لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ جونہی اُس نے اُن دلائل کو رد کیا ایک نئی اِخلاقی دلیل تراش دی جس سے وہ بڑا متاثر اور مطمئن تھا۔وہ بہت سے لوگوں کی طرح دانش وارانہ معاملات میں روایت پرستی پر مبنی خیالات کے بارے میں شکوک وشبہات کا اِظہار تو کرتا تھا لیکن جو خیالات اُسے ماں کی آغوش میں وِرثے میں مِلے تھے اُن سے پیچھا چُھڑانے میں ناکام رہا اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمِ نفسیات کے ماہرین کیوں اِس بات پر زور دیتے ہیں کہ اِنسان کی ابتدائی رفاقتیں اُس کی آنے والی زندگی پر گہرے اثرات مُرتب کرتی ہیں۔

میں پہلے ہی کہہ چُکا ہوں کہ خدا کے وجود کے بارے میں کانٹ نے ایک نئی دلیل ایجاد کی اور یہ دلیل کسی نہ کسی شکل میں 19ویں صدی میں بے حد مقبول رہی۔اُس دلیل کی بہت سی شکلیں ہیں جس میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دُنیا میں اگر خدا نہ ہوتا تو کُچھ بھی صحیح نہ ہوتا اور کُچھ بھی غلط نہ ہوتا۔صحیح اور غلط میں کیا فرق ہے؟

اور یہ کہ صحیح اور غلط میں کوئی فرق ہے بھی یا نہیں یہ ایک الگ سوال ہے۔ فی الحال میری دلچسپی اِس نقطہ پر مرکوز ہے کہ اگر آپ کو یقین ہے کہ صحیح اور غلط میں فرق ہے تو پھر آپ ایک خاص قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ اب لازمی طور پر آپ کو اِس سوال کا جواب تلاش کرنا ہوگا کہ آیا صحیح غلط کا فرق خدا کے حکم سے ہے یا یہ کہ خدا کے حکم کی وجہ سے نہیں۔ اگر خدا کے حکم کی وجہ سے ہے تو پھر خدا کے نزدیک تو کچھ بھی صحیح نہیں ہے اور کُچھ بھی غلط نہیں۔ نتیجتاً اِس بیان کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی کہ خدا اچھا ہے اور اگر آپ دینی امور کے ماہرین کی طرح کہتے ہیں کہ خدا اچھا ہے تو پھر اِس نتیجے پر پہنچنا لازم ہے کہ صحیح اور غلط کے اپنے اپنے معانی ہیں تب یہ معانی خدا کے حکم سے ماورائی ہیں کیونکہ خدا کے احکام اچھے ہی ہوتے ہیں بُرے نہیں نہ صرف اپنی ہیت میں منطقی نقطہ نگاہ سے یہ دونوں تصورات خدا کے پیش نظر ضرور تھے۔ حقیقت میں اگر آپ پسند کریں تو ایسا بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے کسی اعلیٰ درجہ کے دیوتا کے حکم پر یہ دُنیا بنائی یا پھر آپ اپنے مؤقف میں ذرا سی تبدیلی لاتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ کُچھ باطنی یا پُر اِسرار قوتوں نے یہ کام سرانجام دیا۔ ایسا مؤقف میرے نزدیک زیادہ معقول ہے۔ درحقیقت یہ دُنیا جسے ہم جانتے ہیں شیطان نے اُس وقت بنائی ہوگی جب خدا ذرا سا غافل تھا۔ اِس وقت اِس بارے میں بہت کُچھ کہنے کو ہے۔ لیکن مجھے اِس میں کوئی دِلچسپی نہیں کہ اِس کو مسترد کرنے کے لیے کُچھ کہوں۔

نا اِنصافی کے تدارک کی دلیل

یہ اِخلاق کے رُوپ میں ایک انوکھی دلیل ہے جس کے مطابق یہ مؤقف پیش کیا جاتا ہے کہ دُنیا میں اِنصاف کا بول بالا کرنے کے لیے خدا کے وجود کی ضرورت ہے۔ کائنات کے اِس حصے میں جہاں ہم مقیم ہیں، بے پناہ نا اِنصافی ہو رہی ہے۔ یہاں شریف لوگ اکثر مصائب میں گھرے رہتے ہیں۔ جبکہ اکثر مکار اور عیار لوگ پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔ یہ اندازہ لگانا مُشکل ہے کہ اِن دونوں مذکورہ صورتوں میں سے کونسی زیادہ تکلیف دہ صورتِ حال ہے۔ لیکن اگر آپ مجموعی طور پر اِس پوری کائنات میں اِنصاف لانے جا رہے ہیں تو آپ کو فرض کرنا پڑے گا کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ یہ اس لیے فرض کر لیا جائے کہ اِس زمین پر جو نا اِنصافیاں ہوئی ہوں اُنکا ازالہ ہو سکے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ نہ صرف خدا کا ہونا لازم ہے بلکہ جنت اور جہنم بھی بہت ضروری ہیں تاکہ بالآخر زندگی میں اِنصاف کے نقطہ نظر سے توازن اور تلافی ہو سکے۔ یہ بڑی عجیب وغریب منطق ہے۔ اگر آپ سائنسی نقطہ نظر سے غور کریں توں آپ یقیناً کہیں گے کہ مجھے تو اسی دُنیا کا علم ہے اور میں باقی کائنات کے بارے میں کُچھ نہیں جانتا۔ اِس دلیل کی صحت کو اِمکانات کی کسوٹی پر ہی ماپا جا سکتا ہے۔ اِسی کی بُنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ خود یہ دُنیا ہی ایک روشن مثال ہے اِس دُنیا میں اگر نا اِنصافی

ہے تو پھر دوسری دُنیا میں بھی ناانصافی کے قوی اِمکانات ہیں۔فرض کریں کہ آپ سنگتروں کی پیٹی خریدنے جاتے ہیں وہاں جب ایک پیٹی کو کھولا جاتا ہے تو اُوپری سطح پر پڑے سنگتروں کو گلا سڑا پاتے ہیں تب پھر یہ دلیل نہیں دی جاسکتی کہ نیچے کی سطحوں پر پڑے سنگترے لازمی طور پر اچھے ہونگے۔ بلکہ آپ یقینی طور پر کہیں گے کہ یہ ساری کی ساری پیٹی خراب ہے۔ایک سائنسی سوچ کا حامل شخص بھی باقی کائنات کے بارے میں اِسی نقطہ نظر سے غور کرتے ہوئے دلائل پیش کرے گا۔وہ کہے گا ''یہاں ہمیں بے پناہ نااِنصافی دیکھنے کو ملتی ہے اِسی بُنیاد پر ہم یہ فرض کرنے میں حق بجانب ہیں کہ پوری کائنات میں کہیں بھی اِنصاف کا بول بالا نہیں ہے'' مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اِس قسم کے دانشورانہ دلائل جو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اِن سے عام لوگوں پر اثر نہیں پڑتا۔حقیقت یہ ہے کہ خدا پر یقین کرنے کے لیے کوئی معقول دلیل موجود نہیں ہے۔نہ ہی وہ کسی مناسب دلیل کی بنیاد پر خدا پر بھروسہ کرنے کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ بلکہ لوگوں کی اکثریت محض اِس لیے خدا پر یقین رکھتی ہے کہ اُنہیں اُنکے بچپن میں ایسی تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ ایسا کریں اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ تحفظ کی خواہش اِس سلسلے میں دوسرا بڑا عامل ہے۔

عدم تحفظ جتنا شدید ہوتا ہے تحفظ کی خواہش اُسی قدر شدید ہوتی ہے یہ اِس قسم کا اِحساس ہوتا ہے کہ کوئی بڑا بھائی ہو جو آپ کی نگہداشت کرے اور یہ خواہش لوگوں کی پوری زندگی میں اِتنے طاقتور اثرات مرتب کرتی ہے کہ وہ خدا پر یقین کیے رکھتے ہیں۔

کرائسٹ کا کردار

اب میں چاہتا ہوں کہ اِس موضوع پر کُچھ کہوں جس کے متعلق عقلیت پسندوں نے ضرورت سے بہت کم ذِکر کیا ہے اور وہ موضوع یہ ہے کہ کیا کرائسٹ دُنیا بھر میں عقل و دانش کے اعتبار سے بلند ترین درجہ رکھتا تھا۔عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ ہاں وہ ایسا ہی تھا۔لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ مجھے کرائسٹ کے بہت سے نقاط پر اُن سے زیادہ اِتفاق ہے جو خود کو مسیحی ہونے کے دعویدار بیان کرتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کرائسٹ کے ساتھ آخر تک جاسکتا ہوں یا نہیں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اُس کے مقلدین کے مقابلے میں میں اُس کے ساتھ بہت دور تک جاسکتا ہوں۔آپ کو یاد ہوگا کہ اُس نے کہا تھا کہ ''بدی کی مزاحمت مت کرو۔ بلکہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو اُسے دوسرا گال بھی پیش کردو'' یہ کوئی نیا تصور یا نیا اُصول نہیں تھا۔ بلکہ ایسا تو کرائسٹ سے پانچ یا چھ سو سال قبل لاؤزے (Lao Tze) اور بُدھا بھی کہہ چکے تھے۔لیکن حقیقت میں یہ اُصول خود مسیحیوں کیلئے عملاً ناقابلِ قبول ہے۔مثال کے طور پر موجودہ وزیر اعظم سٹینلے بالڈون Stanley Baldwin بلاشُبہ نہایت مخلص مسیحی ہیں۔لیکن آپ میں سے میں کسی کو یہ مشورہ نہیں

دوں گا کہ جائیں اور اُس کے ایک گال پر تھپڑ جڑ کر دیکھیں تو پھر کیا ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ (وزیر اعظم) مذکورہ قول میں پیش کیے گئے متن کو محض استعارے کے طور پر ہی سمجھے گا۔ ایک اور نقطہ بھی ہے جس کو میں شاندار ترین سمجھتا ہوں آپ کو یاد ہوگا کہ کرائسٹ نے کہا تھا ''فیصلہ مت کرو کہ کہیں تمہارا فیصلہ نہ ہو جائے'' میرا خیال ہے کہ اِس اُصول کی عیسائی ملکوں کی عدالتوں میں کہیں بھی مقبولیت نہیں پائیں گے۔ میں اپنے زمانے کے کئی ایک ججوں کو جانتا ہوں جو بڑے سنجیدہ قسم کے مسیحی تھے لیکن وہ جو کرتے رہے ہیں اُس حوالے سے اُنھوں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ مسیحی اُصولوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں یا یہ کہ کبھی اُنھوں نے خلاف ورزی کی ہے۔ پھر کرائسٹ کا کہنا ہے، ''دے دو اُسے جو آپ سے مانگے، اور جو تم سے اُدھار مانگے اُس سے منہ مت موڑو'' ہے تو بہت اچھا اُصول لیکن!

آپ کے چیئرمین یاددہانی کرا چکے ہیں کہ ہم یہاں سیاست پر بحث کرنے کے لیے نہیں آئے لیکن اِس سلسلے میں یہ مشاہدہ بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جو پچھلے الیکشن گزرے ہیں اُن میں سب سے زیادہ پسندیدہ بات یہ تھی کہ جو آپ سے قرض مانگے اُس سے منہ موڑ لیا جائے۔ چُنانچہ یہ فرض کر لینا لازم ہے کہ ہمارے مُلک کی نہ صرف اعتدال پسند پارٹی بلکہ لبرل پارٹی بھی ایسے عناصر پر مُشتمل ہے جو کرائسٹ کی تعلیمات سے اِتفاق نہیں کرتے کیونکہ دونوں پارٹیوں نے متفقہ طور پر طے کر لیا تھا کہ کسی کو کوئی قرض نہ دیا جائے۔

کرائسٹ کا ایک اور بھی قول ہے ''اگر آپ کامل ہیں تو جاؤ وہ سب کُچھ بیچ دو جو بھی تمہارے پاس ہے اور غریبوں میں بانٹ دو'' عملاً اِس قول پر ایک بھی مسیحی عمل کرنے کے لیے تیار نہیں۔ قِصہ مختصر مذکورہ بالا تمام اقوال اعلیٰ درجے کے ہیں لیکن اِن پر پورا اُترنا خاصا مُشکل ہے میرا اپنا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ میں اِن پر پورا اُترتا ہوں اور یہی بات ہر مسیحی پر فِٹ آتی ہے۔

کرائسٹ کی تعلیمات میں نقائص

کرائسٹ کے اقوال کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے بعد میں کُچھ مخصوص نقاط کا ذِکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انجیل کے بیان میں جس طرح کے کرائسٹ کا نقشہ کھینچا گیا ہے اُس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ عقل وفہم کے اعتبار سے غیر معمولی شخص نہ تھا اور نہ ہی اچھائی یا نیکی کا اعلیٰ نمونہ۔ ہمارے یہاں اِس کے بارے میں کسی کو اِس تاریخی سوال سے کوئی غرض نہیں کیونکہ اِس حوالے سے یہ خاصا مشکوک امر ہے کہ آیا کرائسٹ کا کبھی کوئی وجود بھی تھا یا نہیں۔ اگر وہ کہیں تھا بھی تو اُس کے بارے میں ہمیں کُچھ بھی معلوم نہیں۔ مجھے تو صرف اُس کرائسٹ سے غرض ہے جو انجیل کے ذریعے ہم پر ظاہر ہوتا ہے۔ اُس میں اُس کے بارے میں کُچھ چیزیں پائی گئیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی غیر معمولی عقل ودانش کا مالک نہیں تھا۔ اُس کے بارے

میں ایک بات تو طے ہے کہ اُس نے یہ یقینی طور پر سوچا ہوگا کہ اُس کی دُوسری بار آمد بڑی شان وشوکت سے ہوگی اور یہ کہ متذکرہ آمد اُن سب لوگوں کی موت سے قبل ہوگی جو اُس وقت زندہ تھے۔ اِس کو ثابت کرنے کے لیے بے شمار حوالے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے ''تم اسرائیل کے شہروں میں کسی طور پر نہیں جاسکتے جب تک مسیح نہیں آجاتا'' تب وہ کہتا ہے ''تم میں سے کچھ لوگ یہاں موجود ہیں جنہیں اُس وقت تک ہرگز موت نہ آئے گی جب تک مسیح اپنی بادشاہت میں داخل نہیں ہو پاتا'' اِس طرح بے شمار حوالے موجود ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے یقین تھا کہ اُس کی دوسری بار آمد بہت سے موجود لوگوں کی زندگی ہی میں ہوگی۔ اُس کے ابتدائی پیروکاروں کا بھی یہی عقیدہ تھا اور یہ اُس کی اِخلاقی تعلیمات کی بنیاد تھی۔ لیکن جب اُس نے کہا کہ ''کل کی فکر مت کرو'' اور مزید اِس قسم کی بہت سی چیزیں کہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ اُس کے خیال میں اُس کی دوسری بار آمد بہت جلد ہونے والی ہے۔ لہٰذا معمولی قسم کی دُنیاوی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی اُن پر توجہ دینی چاہیے۔ میں کچھ مسیحیوں کو جانتا ہوں جن کا ایمان ہے کہ مسیح کی دوبارہ آمد بہت جلد ہونے والی ہے۔ میں ایک ایسے پادری کو بھی جانتا ہوں جو اپنے سامنے اجتماع کو خوف زدہ کرتے ہوئے تنبیہ کر رہا تھا کہ بس مسیح کی آمد ہونے والی ہے۔ لیکن مجمع میں موجود لوگوں کو اُس وقت خاصا اطمینان محسوس ہوا جب اُنہوں نے اُس پادری کو اپنے باغیچہ میں درخت لگاتے ہوئے پایا۔ مسیح کے ابتدائی پیروکاروں کو اُس کی دوبارہ جلد آمد پر پختہ ایمان تھا اس لیے وہ اس قسم کی حرکتوں سے پرہیز کیا کرتے تھے۔ درخت لگانا اُنکے ہاں منع تھا۔ کیونکہ اُنہوں نے مسیح سے یہ تعلیم حاصل کر رکھی تھی جو اُنکے ایمان کا حصہ بن گئی۔ اِس لحاظ سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی اتنا بڑا عاقل نہیں تھا جس طرح کہ دوسرے لوگ تھے اور یہ بات تو طے ہے کہ وہ کسی طرح بھی عقلِ کُل نہیں تھا۔

اِخلاقی مسئلہ

آیئے اب ہم اِخلاقی سوال پر توجہ دیں۔ میرے نزدیک کرائسٹ کے کردار میں ایک بہت بڑی خامی یہ تھی کہ وہ جہنم پر یقین رکھتا تھا۔ میں یہ خود محسوس کرتا ہوں کہ کوئی ایسا شخص جو اِنتہائی درجہ کا نرم خُو اور نرم دِل ہو کس طرح ابدی سزا پر یقین رکھ سکتا ہے۔ لیکن انجیل میں جس طرح کا ظاہر ہوتا ہے اُس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لازمی طور پر ابدی سزا پر یقین رکھتا تھا۔ انجیل کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کو لازماً احساس ہوگا کہ اُس کے مزاج میں اُن لوگوں کے لیے کینے سے بھرپور کس قدر غیض وغضب پایا جاتا تھا جو اُس کی تبلیغ غور سے نہیں سُنتے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ تقریباً ہر مبلغ کا ایسا ہی رویہ ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ایسا رویہ ہے جو اِنسان کو اِنسانِ کامل بننے میں مانع ہوتا ہے۔ مثلاً سقراط کے ہاں ایسا مزاج نہیں ملے گا۔ سقراط کا اپنے

ناقدین کی طرف رویہ نہایت اِخلاق اور بُردباری پر مبنی ہوتا تھا۔ میرے خیال میں اختلاف رائے کی صورت میں اِخلاق اور شائستگی کا رویہ برہمی اور اشتعال انگیزی سے کہیں بہتر ہوتا ہے اُمید ہے کہ آپ سب کو یاد ہوگا کہ سقراط جب اپنے آخری ایام میں اُن لوگوں سے جو اُس کے نقطہ نظر سے اختلاف رکھتے تھے، کس پیرائے میں گفتگو کیا کرتا تھا۔

اِس کے برعکس انجیل میں کرائسٹ اپنے مخالفین سے خطاب کرتے ہوئے یوں مخاطب ہوتا ہے''تم سانپ اور زہریلے سانپوں کی اولاد، کس طرح جہنم کے ابدی عذاب سے بچ سکو گے!'' میرے خیال میں یہ طرزِ تکلم کسی طرح بھی دُرست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح رُوح القدس کے خلاف گناہ کے بارے میں اسی قسم کے متن موجود ہیں مثلاً ''جو بھی رُوح القدس کے خلاف بات کرے گا اُسے اِس دُنیا میں بخشا جائے گا اور نہ ہی آخرت میں بخشا جائے گا'' اِس متن نے تو پوری دُنیا کو نا قابلِ بیان ذہنی اذیت میں مبتلا رکھا۔ کیونکہ محض اِسی وجہ سے ہر قسم کے لوگوں نے تصور کرنا شروع کر دیا کہ انہوں نے رُوح القدس کی بے حُرمتی کی ہے اور یہ کہ اُنہیں اس دُنیا میں معاف کیا جائے گا اور نہ ہی آنے والی دُنیا میں بخشا جائے گا۔ میرا نہیں خیال کہ دُنیا میں ایسا بھی کوئی شخص ہو سکتا ہے جس کی فطرت میں ذرا سی بھی ملائمیت پائی جاتی ہو وہ اِس دُنیا کو اِس قسم کے خوف اور دہشت میں مبتلا کرنے کی کوشش کرے۔

کرائسٹ کا مزید کہنا تھا کہ ''مستقبل قریب میں اپنے فرشتوں کو لازمی طور پر بھیجنے والا ہے جو اُس کی بادشاہت سے وہ تمام اشیا اکٹھی کریں گے جو اُس کو ناپسند ہیں اور وہ بھی جو شَر کا باعث بنتی ہیں۔ اُن سب کو آگ کی بھٹی میں پھینک دیں گے۔ تب وہاں دانتوں کے کٹکٹانے اور شدتِ تکلیف سے واویلا کا شور برپا ہوگا'' دانتوں کے کٹکٹانے اور چیخ و پُکار کا ذکر کیے بعد دیگرے مختلف صورتوں میں اِس پیرائے میں دُہرایا جاتا ہے کہ قاری پر فوراً یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ اُس واویلا اور چیخ و پُکار کے تصور سے گویا لُطف اندوز ہوا جا رہا ہو۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلنا لازم ہے کہ ''گناہ کا بدلہ جہنم کی آگ ہے'' یہ نُسخہ ظلم و جبر کا نُسخہ ہے۔ اِس نُسخے کے دُنیا میں متعارف ہونے سے تاریخ میں ظُلم و تشدد کا ایک نہ ختم ہونے والا بھیانک سلسلہ شروع ہو گیا اور اگر ہم انجیل والے کرائسٹ کو وہی سمجھیں جس کی نُمائندگی کلیسائی پیشوا کرتے ہیں تو وہ بھی جزوی طور پر مذکورہ ظلم و ستم کے ذمہ دار ٹھہرتے ہیں۔

بہت سے مزید معاملات موجود ہیں جو قدرے کم اہمیت کے حامِل ہیں۔ گیڈرین Gadarene سؤر کی مثال ہے جہاں سؤروں کے لیے یقیناً مناسب بات نہ تھی کہ اُنکے اندر شیطان داخل کر کے اُنہیں پہاڑی سے سمندر کی طرف دوڑایا جائے۔ آپ کو لازمی طور پر یہ یاد ہوگا کہ وہ (کرائسٹ) قادرِ مطلق تھا۔ وہ چاہتا تو شیطانوں کو یونہی جانے دیتا۔ لیکن اُس نے اُنکو سؤروں کے اندر بھیج دیا۔

مزید یہ کہ انجیر کے درخت کے بارے میں بھی ایک عجیب وغریب قصہ ہے جو ہمیشہ مجھے پریشان کیے رکھتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اُس انجیر کے درخت کا کیا ہوا ''مسیح کو بہت بھوک محسوس ہو رہی تھی اُسے کہیں دُور ایک انجیر کا درخت نظر آیا جس کے محض وہاں سے پتے نظر آ رہے تھے۔ وہ وہاں خاصے تیز قدموں سے اِس اُمید کے ساتھ پہنچا کہ شاید وہاں کچھ کھانے کو مل جائے لیکن اُسے پتوں کے سوا کچھ نہ مِلا کیونکہ وہ پھل کا موسم ہی نہ تھا۔'' اِس پر مسیح نے اُس (درخت) سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''اب کے بعد کبھی تمہارا پھل کوئی شخص نہیں کھائے گا.........'' اور پیٹر نے مسیح کو بتایا.........''اے مالک دیکھو کہ وہ درخت جس پر آپ نے لعنت بھیجی بُری طرح سے مُرجھا گیا ہے'' یہ بڑی عجیب وغریب داستان ہے کیونکہ اُس وقت تو انجیر کے درخت پر پھل دینے کا موسم ہی نہ تھا۔ اِس میں آپ حقیقتاً درخت کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ اُسے خواہ مخواہ بدُعا دے دی۔ آپ سب کو بلاشبہ بھیڑ بکریوں کے بارے میں یاد ہوگا کہ مسیح کی دوسری آمد پر بھیڑوں اور بکریوں کو علیحدہ کرتے ہوئے کرائسٹ بکریوں کو کہتا ہے ''اے.........بکریو مجھ سے دُور ہو جاؤ اور جاؤ اُس جلتی ہوئی آگ میں'' اور پھر اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اِن پر لازم ٹھہر گیا ہے کہ یہ ابدی آگ ہی میں جائیں'' تب وہ دوبارہ کہتا ہے ''اگر تمہارے ہاتھ سے کوئی جرم سرزد ہوتا ہے تو اُسے کاٹ دو کیونکہ ایک ہاتھ کے ساتھ زندگی میں شامل ہونا اُس سے کہیں بہتر ہے کہ آپ دونوں ہاتھوں سمیت جہنم میں داخل ہوں۔ ایک ایسی آگ میں جو کبھی ٹھنڈی نہ ہوگی۔ جہاں کیڑے مکوڑے کبھی نہ مریں گے اور جہاں کبھی آگ نہ بجھے گی'' اور پھر وہ اِس کا بار بار اعادہ کرتا ہے۔ اسلئے میں سمجھتا ہوں کہ کرائسٹ نہ تو عقل وفہم کے اعتبار سے اور نہ ہی اِخلاقی اعتبار سے اِتنا بلند تھا جتنا کہ تاریخ میں دوسروں کو جانا جاتا ہے۔ میں اِس لحاظ سے بُدھا اور سقراط کو اُس سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ پاتا ہوں۔

جذباتی عامل

قبل ازیں یہ بتایا جا چکا ہے کہ مذہب قبول کرنے کا کسی بھی دلیل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لوگ اسے محض نفسیاتی بنیادوں پر قبول کرتے ہیں۔ اکثر وبیشتر کہا جاتا ہے کہ مذہب کو تنقید کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔ کیونکہ یہ اِنسانوں کو نیک اور پارسا بناتا ہے۔ اِس سلسلے میں سیموئیل بٹلر کی کتاب Erowhon Revisited میں دلیل کے طور پر مزاحیہ خاکہ درج ہے آپ کو یاد ہوگا اُس میں ہگز Higgs کے نام سے ایک مخصوص کردار ہے۔ جو ایک دُور دراز علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد وہ وہاں سے ایک غبارے کے ذریعے فرار ہو جاتا ہے بیس سال بعد جب وہ دوبارہ اُسی جگہ آتا ہے تو وہاں ایک نیا مذہب رواج پا چکا ہوتا ہے جس میں سن چائلڈ Sun Child کے نام سے اُسی کی پُوجا ہو رہی ہوتی ہے اور وہاں مشہور تھا کہ خود ہگز

کی آسمانوں کی طرف اُڑان کی یاد میں ایک مذہبی تہوار بھی بہت جلد منایا جانے والا ہے اِس سلسلے میں اُسے پروفیسر ہینکی اور پینکی کے درمیان ہونے والی گفتگو سُننے کا بھی اِتفاق ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو کہہ رہے ہوتے ہیں کہ اُنہوں نے ہگز نامی شخص کو کبھی دیکھا ہی نہیں اور اُنہیں یہ بھی یقین تھا کہ وہ ایسے شخص کو کبھی دیکھ بھی نہیں پائیں گے۔ دراصل وہ سن چائلڈ نامی مذہب کے سب سے بڑے پروہت تھے۔ اُن پروہتوں کی باتوں پر وہ بہت برہم ہوا اور اُنکے پاس آ کر کہنے لگا ''میں تمہاری اِس ساری فریب کاری کو بے نقاب کرنے جا رہا ہوں۔ تم نے یہ کیا پاکھنڈ بازی رچا رکھی ہے۔ میں ایبرَ ہون Erewhon کے لوگوں کو آگاہ کروں گا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کا نام ہگز ہے اور یہ کہ میں ہی غبارے کے ذریعے اوپر گیا تھا'' جواب میں اُنہوں نے کہا کہ ''ایسا ہرگز نہ کرنا کیونکہ اِس علاقے کی تمام روایات اور اِخلاقی بندھن اسی فرضی تصور کے ساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ اگر اُنہیں ایک دفعہ پتہ چل گیا کہ تم آسمانوں پر نہیں گئے تو پھر یہ سب کے سب لوگ عیار اور چالباز ہو جائیں گے'' تب وہ اُن کی باتیں سُن کر مان گیا اور پھر وہ خاموشی سے وہاں سے چل دیا۔

یہی وہ تصور ہے جس کے تحت اگر ہم مسیحی مذہب کو نہیں مانتے تو پھر ہم چالباز اور مکار ہیں۔ لیکن مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جو اِس کو مانتے ہیں وہی اکثر و بیشتر حالتوں میں مکار اور عیار پائے گئے ہیں۔ یہ بھی ایک عجیب و غریب حقیقت ہے کہ جب بھی کسی مذہب میں جتنی شدت سے اِنتہا پسندی و عقیدہ پرستی کے عناصر داخل ہوتے ہیں اُتنی ہی شدت سے ظلم و جبر بڑھتا ہے اُتنے ہی حالات بدتر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اُن زمانوں میں جب مذاہب کا ہر طرف بول بالا تھا۔ جب لوگ مسیحیت کی پوری آب و تاب سے پابندی کرتے تھے تو کسی کی طرف سے ذرا سی مبینہ خلاف ورزی پر اِنتہائی پُرتشدد تحقیقات ہوا کرتی تھی۔ لاکھوں کی تعداد میں بدقسمت عورتوں کو چڑیلیں قرار دیتے ہوئے زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ غرض مذہب کے نام پر ہر طرح کا ظلم و تشدد ہر قسم کے لوگوں پر روا رکھا جاتا رہا۔

اگر آپ ذرا سا غور کریں تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ دُنیا بھر میں بشری اوصاف میں بہتری لانے کی ہر کوشش یا جنگ اور اِس کی تباہ کاریوں کو روکنے کی ہر سعی غرض نسلی امتیاز کو ختم کرنے کے ہر عمل اور ہر قسم کے اِخلاقی اِرتقاء کو دُنیا بھر کے منظم چرچوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ میری یہ پختہ رائے ہے کہ یہاں مسیحی مذہبی نقطہ نظر چرچوں کی صورت میں منظم ہے جو نہ صرف ماضی میں ہمیشہ سے دُنیا کے اندر اِخلاقی ترقی کا سب سے بڑا دُشمن رہا ہے بلکہ اب بھی یہی کردار ادا کر رہا ہے۔

چرچ ترقی کی راہ میں کیسے رکاوٹ ڈالتے ہیں

جب میں کہتا ہو کہ اب بھی چرچ کا یہی کردار ہے تو شاید آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں قدرے

مبالغے سے کام لے رہا ہوں۔ لیکن میں خود ایسا نہیں سمجھتا میری یہ ہرگز خواہش نہیں کہ میں کسی ناخوشگوار حقیقت کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں۔ لیکن کیا کیا جائے کہ جب چرچ اتنا ہی مجبور کر دے تو پھر مجبوری میں اُن حقائق کا ضرور ذِکر کیا جانا چاہیئے جو چاہے کِتنے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں۔ اِس ترقی یافتہ دُنیا میں جس میں آج ہم رہ رہے ہیں یہاں فرض کریں کہ ایک ناتجربہ کار بچی کی شادی ایک آتشک زدہ شخص سے ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں کیتھولک چرچ کا یہی کہنا ہوتا ہے کہ ''یہ ایک ناقابل تنسیخ مقدس بندھن ہے۔ آپ پر لازم ہے کہ ساری زندگی اکٹھے رہیں'' کسی صورت کوئی ایسا قدم اُس عورت کی جانب سے نہ اُٹھایا جائے جو اُس کو آتشک زدہ بچوں کو جنم دینے کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔ کیتھولک چرچ کا تو یہی کہنا ہوتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک اُس کا یہ کہنا خباثت سے بھرپور ظالمانہ فعل ہوگا۔ بلکہ کوئی بھی شخص ایسی صورتِ حال کو درست اور مناسب وقرار دے کر یہ نہیں چاہے گا کہ یہ سلسلہ جاری رہے بشرطیکہ وہ کسی عقیدے کے ہاتھوں اندھا نہ ہو گیا ہو یا پھر اُس کی فطرت اِنسانی ہمدردی سے بالکل عاری نہ ہو گئی ہو۔

یہ تو محض ایک مثال ہے۔ آج بھی چرچ کئی طریقوں سے لوگوں کو اِبتلاء میں مبتلاء کیے رکھتا ہے۔ یہ خواہ مخواہ بعض باتوں کو اِخلاقیات کا نام دے کر اُس پر اصرار کرتا ہے اور یوں لوگ غیر ضروری طور پر ایسے مصائب کا شکار ہو جاتے ہیں جن کے وہ کسی طور پر بھی حقدار نہیں ہوتے حقیقت میں ترقی جیسا کوئی بھی عمل جس سے لوگوں کی تکلیف یا مصیبتوں میں کمی آئے کی مخالفت میں اب بھی چرچ کا بہت بڑا کردار ہے۔ کیونکہ اِس نے تنگ نظری پر مبنی ایسے اصولوں کی فہرست مُرتب کر رکھی ہے جس کو وہ اِخلاقیات قرار دیتا ہے اور جس کا اِنسانی خوشی و مسرت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اور جب آپ یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں کام ہونا چاہیے تا کہ اِنسانی زندگی میں خوشی آ سکے تو اُن کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ''اُس معاملے میں اِس کا کوئی تعلق نہیں''، ''بھلا اِنسانی مسرت کا اِخلاقی اصولوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ درحقیقت اِخلاقی اصولوں کا یہ مقصد ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ لوگوں کو خوش وخرم بنائیں۔''

خوف۔۔۔ مذہب کی بنیاد

میرے خیال میں مذہب کی پوری عمارت بنیادی طور پر خوف پر کھڑی ہے کچھ تو اس میں انجانی دہشت پائی جاتی ہے اور کچھ ایسے احساس کا عنصر پایا جاتا ہے جس میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ایسا بڑا بھائی ہو جو ہر دُکھ اور تکلیف میں آپ کے ساتھ کھڑا ہو غرض یہ معاملہ خوف کے ساتھ جُڑا ہوا ہے۔ خوف کئی طرح کا ہوتا ہے اسراریت کا خوف، شکست کا خوف، موت کا خوف، قصہ مختصر کہ خوف ظلم کی ماں ہے۔ لٰہذا یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ظلم اور مذہب ساتھ ساتھ چلتے آئے ہیں ایسا اِس لیے ہوتا آیا ہے کہ اِن دونوں عناصر

کی یکساں بنیاد خوف ہے۔ اِس دُنیا میں لوگ اب سائنس کی مدد سے جُوں جُوں تھوڑا بہت سمجھنا شروع ہوئے ہیں اور کُچھ کُچھ معاملات پر حاوی ہونے لگے ہیں۔ یہ سلسلہ اِتنا زبردست ثابت ہو رہا ہے کہ ہم قدم بہ قدم آہستگی سے مسیحیت کے خلاف، اِس کے چرچوں کے خلاف اور تمام قدیم تصورات کے خلاف منطقی طور پر مائل ہو رہے ہیں۔ سائنس ہمیں اُس بزدلی پر قابو پانے میں مدد دے سکتی ہے جسکا اِنسانیت نسل در نسل شکار ہوتی رہی ہے۔ سائنس ہمیں تعلیم دے سکتی ہے اور میرے خیال میں اب تو خود ہمارا شعور بھی یہ تعلیم دے سکتا ہے کہ ہم کسی طور پر بھی ادھر اُدھر کسی غیبی یا تصوراتی مدد پر بھروسہ کرنے یا اِس کے انتظار میں نہ رہیں اور نہ ہی آسمانوں میں اپنے مددگار کی تلاش کریں۔ بلکہ نیچے خود اپنی کوششوں پر بھروسہ کر کے اِس دھرتی کو اِس طرح سنواریں کہ یہ رہنے کے قابل ہو جائے۔ اِس کے بجائے ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ایسی جگہ کے متلاشی بنے رہیں جس کے بارے میں چرچ صدیوں سے پروپیگنڈہ کر رہا ہے۔

ہمارا فرض

ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں۔ دُنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں اُن حقائق کو بھی دیکھیں جو اچھے ہیں۔ اُنکا جائزہ بھی لیں جو بُرے ہیں۔ اِس کی رعنائیوں پر بھی نگاہ ڈالیں۔ اِس کے بھدے پن کو بھی مدِ نظر رکھیں۔ غرض دُنیا کو ویسا ہی دیکھیں جیسی کہ یہ ہے اِس سے گھبرائیں مت اس سے ٹپکتی ہوئی دہشت سے مغلوب ہو کر غلامانہ طرزِ عمل اِختیار مت کریں۔ بلکہ آگے بڑھ کر اپنے علم اور ذہانت سے اِسے فتح کریں۔ خدا کا پورے کا پورا تصور قدیم مشرقی مطلق العنانیت سے مستعار لیا گیا ہے۔ یہ تصور ایک آزاد منش انسان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ جب آپ چرچ میں لوگوں کو خود پر ملامت کرتے ہوئے یہ کہتے ہوئے سُنتے ہیں کہ وہ تو بیچارے خستہ حال اور گنہگار وغیرہ ہیں۔ اِس طرح کے مناظر اِنسانیت کی تذلیل نہیں تو اور کیا ہے؟ اس طرح کے طرزِ عمل سے اِنسان کی عزت مجروح ہوتی ہے۔ ہمیں اپنے تئیں اپنے احوال کو بہترین بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر یہ دُنیا اُتنی اچھی نہیں جتنی ہم چاہتے ہیں تب بھی بہر حال اُس سے نسبتاً بہتر ہو سکتی ہے جو پہلے لوگ کئی زمانوں میں بنا چکے ہیں۔ ایک بہتر دُنیا کو علم جرأت اور شفقت کی ضرورت ہوتی ہے اِسے نہ تو ماضی پرستی کی ضرورت ہے اور نہ اُن اقوال کی ضرورت ہوتی ہے جو ماضی بعید میں جُہلاء نے اِنسانوں کی ذہانت کو پابہ زنجیر کرنے کے لیے تراشے تھے۔ اِس سیاہ پہلو کو دیکھنے کے لیے نڈر اور بے باک قسم کا نقطہ نظر ہونا چاہیے۔ ایک آزاد و خود مختار ذہانت چاہیے ایک اُمید بھرا مُستقبل چاہیے۔ پیچھے مُڑ کر ماضی کی طرف دیکھنے کی قطعی ضرورت نہیں جو کہ پہلے ہی مُردہ ہو چکا ہے۔ بلکہ آگے بڑھ کر اپنی ذہانت اور قابلیت کے بل بوتے پر آج اور آنے والے کل کو ماضی کے مقابلے میں کہیں بہتر بنانا ہوگا۔

باب ۔۔۔ ۲

کیا مذہب نے تہذیب کی ترقی کے سِلسلے میں کوئی مثبت کردار ادا کیا ہے؟

مذہب کے بارے میں میرا نقطہ نظر لیوکریٹس Lucretius سے مطابقت رکھتا ہے۔ میں تو اسے ایک خاص قسم کی بیماری سمجھتا ہوں جو خوف سے پیدا ہوتی ہے یہ ہمیشہ سے پوری اِنسانی نسل کے کیے دُکھوں اور مصیبتوں کا سرچشمہ رہی ہے پھر بھی مجھے اِس سے اِنکار نہیں کہ اِس نے تہذیب کے سِلسلے میں تھوڑا بہت مثبت کردار بھی ادا کیا ہے۔ اِس نے اپنے ابتدائی ایام میں کیلنڈر بننے میں بہت مدد کی۔ اِس کے علاوہ مصری پروہت کیلنڈر کی بدولت گرہن کے بارے میں ترتیب وار اندراج کرتے رہے حتیٰ کہ ایک وہ وقت بھی آیا کہ وہ گرہن کے بارے میں ٹھیک ٹھیک پیشن گوئی کرنے لگے۔ مذہب کی اِن دونوں خدمات کا تو مجھے اعتراف ہے۔ لیکن اگر کوئی اِس کے علاوہ دوسری کوئی افادیت ہے تو اُسکا مجھے علم نہیں۔

لفظ ''مذہب'' آجکل بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کُچھ لوگ تو کلیساء کی اِصلاحی تحریک کے زیرِ اثر اِس لفظ کو سنجیدہ قسم کے ذاتی عقائد، اِخلاق یا کائنات کی کیفیت کی نشاندہی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اِس لفظ کا ایسا استعمال تاریخی طور پر بالکل غلط ہے۔ مذہب بنیادی طور پر ایک سماجی حقیقت ہے۔ کلیساء کا اپنا نقطہ آغاز پختہ عقائد کے اساتذہ کا مرہونِ منت تو ہوسکتا ہے۔ لیکن جو خود کلیساء کے بانی تھے اُن کا کلیساء پر کبھی کوئی اثر نہیں رہا۔ جبکہ کلیساء کو اُن معاشروں میں بے پناہ اثر ورُسوخ حاصل تھا جن کے اندر وہ خود پھلتے پھولتے اور ترقی پاتے رہے۔ خود مغربی تہذیب کا معاملہ بڑا دلچسپ ہے کہ کرائسٹ کی تعلیمات (جیسے کہ انجیل سے ظاہر ہوتی ہیں) کا غیر معمولی طور پر مسیحیوں کے ضابطہ اِخلاق سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر سماجی اور تاریخی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مسیحیت کا تعلق کرائسٹ کی بجائے پاپائیت سے جُڑا ہوا ہے اور اگر ہم مسیحیت کو ایک سماجی قوت کے طور پر جانچنے کی کوشش کریں تو اِس سے متعلقہ مواد تلاش کرنے کے لیے انجیل کی طرف توجہ دینا قطعی ضروری نہیں رہتا۔

کرائسٹ نے تو کہا تھا کہ اشیاء غریبوں میں تقسیم کر دو۔ تمہیں آپس میں نہیں لڑنا چاہیے۔ تم چرچ میں نہ جاؤ اور زنا پر سزا مت دو لیکن کیتھولک اور نہ ہی پروٹسٹنٹ نے اِن تعلیمات پر عمل کرنے کی کسی شدید خواہش کا کبھی اظہار کیا ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ کچھ فرانسسکنز Franciscans نے درویشانہ فقیری کے انداز کا پرچار کرنے کی کوشش کی لیکن پوپ نے اُن کی شدید مذمت کرتے ہوئے اُنکے اندازِ فکر کو ملحدانہ قرار دے دیا اور پھر آپ غور کریں کہ ''جانچو مت کہ کہیں تمہاری ہی جانچ نہ ہو جائے'' اور خود سے سوال کریں کہ ایسے متن کی اثر پذیری کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ جو بات مسیحیت کے بارے میں سچ ہے اُسی بات کا اِطلاق بُدھ مذہب پر بھی ہوتا ہے۔ بُدھا خاصہ خوش مزاج اور روشن خیال تھا وہ اپنے بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے اپنے ارادت مندوں پر اِس خیال سے خوب ہنسا کہ وہ اُسے لافانی سمجھتے تھے۔ لیکن بُدھ پروہت اِنتہائی تنگ نظر اور پرلے درجے کے ظالم و جابر تھے جیسے کہ تبت میں اِس کی زندہ مثال موجود ہے۔ کلیساء اور اُس کے بانی میں یہ فرق محض اتفاق نہیں ہے۔ جونہی یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ کسی خاص شخص نے کوئی حتمی سچائیاں بیان کر دی ہیں تو ایک خاص گروہ اُس کے اقوال کی تشریح شروع کر دیتا ہے اور پھر وہ تشریح کے ماہرین یقینی طور پر بزعم خود مقتدر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ سچائی کی کُنجی اُنہی کے قبضے میں ہوتی ہے اور پھر وہ کسی بھی مراعات یافتہ طبقے کی طرح اِختیارات اپنے مفاد میں استعمال کرنے لگتے ہیں۔ چونکہ ناقابلِ (تردید) کامل سچائی ایک دفعہ ہمیشہ کے لیے بیان کر دی گئی ہو تو اُس کی تفسیر و تشریح اُنکا کاروبار بن جاتا ہے لہٰذا وہ ہر فہم و فراست پر مبنی اِخلاقی ترقی کی راہ میں دیوار بن جاتے ہیں۔ اِس لحاظ سے اِس طبقے کا اِقتدار دوسرے مراعات یافتہ طبقات کے اقتدار کے مقابلے میں بدتر ہوتا ہے۔ چُنانچہ چرچ کی طرف سے گلیلیو، ڈارون اور فرائڈ کی مخالفت ہمارے سامنے کی بات ہے۔ اُن وقتوں میں جب چرچ کا اقتدار عروج پر تھا وہ علم و دانش کی مخالفت میں آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ سخت گیر تھا۔ اُن دِنوں ایک دفعہ پوپ گریگری دی گریٹ نے کسی بِشپ کو ایک خط لکھا جس کی شروعات کچھ اِس طرح تھیں ''ہمیں ایک رپورٹ موصول ہوئی ہے جس کے ذکر سے ہی ہمارا سر شرم سے جھک گیا ہے کہ تم اپنے کچھ دوستوں کو گرائمر سکھا رہے ہو'' لہٰذا بشپ نے کلیسائی اِختیار کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور مجبور ہو کر اس ''شرمناک حرکت'' کو ترک کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک احیائے علوم کی آمد تک لاطینی طرزِ تحریر درست نہ ہو سکا۔ مذہب نہ صرف دانشورانہ پہلو سے بلکہ اِخلاقی اعتبار سے بھی تباہ کُن ثابت ہوتا ہے۔ اِس سے میری مراد یہ ہے کہ یہ ایسے اِخلاقی ضابطوں کی تعلیم دیتا ہے جن کا اِنسانی راحت یا مسرت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ چند سال قبل جرمنی میں رائے شُماری ہوئی کہ آیا معزول شاہی خاندان کی جائیداد کو اُنہی کے قبضہ میں رہنے دی جائے یا نہیں۔ اِس پر جرمنی کے

چرچ نے سرکاری طور پر بیان دیا کہ شاہی خاندان کو اُن کی جائیداد سے محروم کرنا مسیحیت کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ چرچ نے جب تک اُس میں ہمت تھی غلامی کے خاتمے کی مخالفت کرتا رہا۔ چند ایک اچھی طرح سے مشتہر اِستثناء چھوڑ کر وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح کسی بھی معاشی اِنصاف کے لیے لڑی جانے والی تحریک کا مخالف ہے۔ پوپ سرکاری طور پر سوشلزم کی مذمت کر چُکا ہے۔

مسیحیت اور جنس

مسیحیت کی بدترین خصوصیت وہ رویہ ہے جو اِس نے جنس کے بارے میں اِختیار کر رکھا ہے اِس کا یہ مریضانہ اور غیر فطری رویہ اُسوقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک ہم اِس کو رومن ایمپائر کی زوال پذیری اور اُس عہد کی مذہبی دُنیا کے عارضہ کے درمیان تعلق کو پیشِ نظر نہ رکھیں۔ بعض دفعہ ہمیں یہ سُننے کو ملِتا ہے کہ مسیحیت نے عورت کا مرتبہ بُلند کر دیا ہے۔ میرے خیال میں ایسا سوچنا بھی تاریخ کا اِتنا بڑا جھوٹ ہوگا کہ اِس سے بڑا اور جھوٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں اِس اَمر کی بے حد اہمیت ہو کہ عورت کسی مقررہ سخت گیر ضابطوں کی خلاف ورزی نہ کر پائے۔ وہاں اُس کو کوئی معقول مقام حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ راہب ہمیشہ عورت کو مجموعی طور پر ترغیب کا سرچشمہ قرار دیتے رہے ہیں۔ وہ اُسے بنیادی طور پر ناپاک شہوت لُبھانے والی کوئی شئے سمجھتے ہیں۔ چرچ ماضی میں بھی اور اب بھی کنوار پن کو بہترین قرار دیتا ہے۔ لیکن جہاں کنواری ناپید ہو تو صرف اُسی صورت میں کسی دوسری سے شادی جائز قرار دیتا ہے۔ اِس سِلسلے میں سینٹ پال نے نہایت بربریت سے اعلان کیا کہ ''جل مرنے سے بہتر ہے کہ شادی کر لی جائے'' اور پھر شادی کے بندھن کو ناقابلِ تنسیخ قرار دیتے ہوئے محبت کے فن سے متعلق علم کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ یوں جنس کی آزادی کے بارے میں چرچ نے یہ خصوصی اہتمام کر دیا کہ اِس سے کوئی لُطف اندوز تو نہ ہونے پائے البتہ اِس میں دُکھ اور تکلیف کا عنصر خاص طور پر شامل کر دیا۔ درحقیقت بچے کم پیدا کرنے کی تدابیر کی مخالفت بھی اِسی مقصد کے پیشِ نظر کی گئی کہ اگر کوئی عورت ہر سال ایک بچے کو جنم دیتی ہو آخر کار ناکارہ ہو جائے یا وفات پا جائے تو اِس کے بارے میں تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے کبھی لُطف اندوز بھی ہوئی ہو۔ اِسی لیے برتھ کنٹرول کی مخالفت لازم ٹھہری۔

کرسچن اِخلاقیات سے جُڑے ہوئے گناہ کا تصور بے پناہ ضرر کا باعث بن رہا ہے چونکہ یہ اذیت پسندی کے اِظہار کا ذریعہ مُہیا کرتا ہے جس کو وہ نہ صرف جائز سمجھتے ہیں بلکہ لائقِ تحسین بھی۔ مثال کے طور پر آتشک کی روک تھام کے مسئلے کو ہی لیں ہر کوئی جانتا ہے کہ اگر احتیاطی تدابیر اِختیار کر لی گئیں ہوں تو اوّل یہ کہ اِس بیماری کے پھیلنے کا اِمکان ہی نہیں رہتا لیکن اگر ہو بھی تو اِتنا کم ہوتا ہے کہ اُسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے

تاہم مسیحی حضرات اِس بیماری کی روک تھام کے علم کی نشرواشاعت پر بے حد معترض ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ گنہگار کو سزا ضرور ملنی چاہیے سزا کا دائرہ چاہے اُس کے بیوی بچوں تک ہی وسیع کیوں نہ ہو جائے۔ اِسوقت بھی دُنیا بھر میں ہزاروں بچے ایسے موجود ہیں جو پیدائشی طور پر اِس مرض میں مبتلاء ہیں۔ یہ بچے شاید کبھی پیدا ہی نہ ہوتے۔ لیکن وہ محض اِس لیے پیدا ہوئے تاکہ مسیح کو نہ ماننے والے گنہگاروں کو سزا پاتے ہوئے دیکھیں اور اُنکے اذیت پسند مزاج کو تسکین مِل سکے۔ میری سمجھ سے باہر ہے کہ یہ سزا جو ظلم و بربریت پر مبنی نسخہ ہے کس طرح اخلاقیات پر کِس قسم کا خوشگوار اثر ڈال سکتی ہے۔

نہ صرف جنس کے متعلق بلکہ جنس کے علم کے بارے میں بھی مسیحیوں کا رویہ اِنسانیت کی فلاح و بہبود کے اعتبار سے اِنتہائی خطرناک ہے۔ ہر وہ شخص جو تعصب سے مبّرا ہو کر اِس سوال پر ذرا سا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا کر لے تو وہ جان جاتا ہے کہ کس طرح جنس کے موضوع پر ایک گویا مصنوعی لاعلمیت جن راسخ العقیدہ مسیحی نوجوانوں پر مسلط کر دی جاتی ہے اُنکے لیے کِتنی ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے ضرر رساں ثابت ہوتی ہے اور اُن بچوں پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں جنہیں محض ''غیر مناسب'' گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ جنس کیا ہوتی ہے اور وہ بیچارے یہی جان پاتے ہیں کہ جنس شاید بذات خود نازیبا یا کوئی مضحکہ خیز عمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ علم کو کسی بھی حالت میں ناپسندیدہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ علم کے حصول کے سلسلے میں میرے نزدیک کسی بھی شخص پر کسی بھی قسم کی قدغن نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی عُمر کی کوئی حد ہونی چاہیے۔ لیکن خاص طور پر جہاں تک جنس کے بارے میں علم کا تعلق ہے۔ اِس کے حق میں دوسرے علوم کے مقابلے میں زیادہ وزنی دلائل موجود ہیں۔ ایک بات تو صاف ظاہر ہے کہ ایک لاعلم شخص کے مقابلے میں وہ اِنسان بہتر طریقے سے کام سرانجام دے سکتا ہے جو پہلے سے ہدایت یافتہ ہو اور پھر نوجوانوں کو احساسِ گناہ میں مبتلاء رکھنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ کیونکہ اہم اُمور کے بارے میں معلومات کے حصول کے لیے اُن میں تجسس کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے۔

ہر لڑکا ٹرین میں دِلچسپی رکھتا ہے۔ فرض کریں ہم اُسے تاکید کرتے ہیں کہ ٹرین میں دلچسپی لینا بدی ہے۔ فرض کریں جب بھی وہ ٹرین یا ریلوے سٹیشن پر ہوتا ہے تو اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھے رکھتے ہیں اور مزید فرض کریں کہ ہم اُس کی موجودگی میں لفظ 'ٹرین' کا کبھی ذکر نہیں کرتے اور یہ کہ اِس رازداری کا بھی بطور خاص اہتمام کرتے ہیں کہ اُس کو کس ذریعے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا تا رہا ہے۔ اِس کا یہ نتیجہ قطعی نہیں ہوگا کہ وہ ٹرین میں دلچسپی لینا چھوڑ دے گا بلکہ اِس کے برعکس وہ اُسکا اور بھی زیادہ مُشتاق ہو جائیگا اور پھر مریضانہ ذہنیت کے زیرِ اثر احساس گُناہ میں بھی مبتلاء ہو جائے گا کیونکہ ٹرین کے بارے میں اُسے پہلے سے ہی سُوجھا دیا گیا ہوتا ہے کہ گویا یہ کوئی بدی ہے یوں ہر بچہ چاہے وہ کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو کم یا زیادہ

درجے کی نفسیاتی بیماری Neurasthemic میں مبتلاء کیا جا سکتا ہے۔ جنس کے معاملات میں بھی عین ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ بالا میں بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ جنس ٹرین سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتی ہے لہٰذا نتیجہ بھی اُس سے کہیں زیادہ بدتر ہوتا ہے۔ جوانی کے ابتدائی دِنوں میں عورت اور مرد کے لیے یکساں طور پر جنس کے متعلق علم چونکہ ممنوع ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسیحی سماج میں تقریباً ہر بالغ کسی نہ کسی حد تک ذہنی مریض ہوتا ہے۔ احساس گناہ کا بیج مصنوعی طور پر بونے کا نتیجہ احمقانہ حرکتیں کرنے ظلم ڈھانے اور شرمیلے پن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس کے اثرات زندگی بھر نوجوانوں کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ کوئی بھی ایسی معقول وجہ موجود نہیں جس کی بناء پر، کسی بھی قسم کی ایسی معلومات سے بچے کو محروم رکھا جائے جس کے بارے میں وہ جاننا چاہتا ہو چاہے وہ معلومات جنس کے بارے میں ہوں یا پھر کسی بھی اور معاملے سے متعلق اُس وقت تک صحت مند آبادی کا حصول ناممکن ہے جب تک اِس حقیقت کا اِدراک نہ کر لیا جائے کہ جنس کے بارے میں ابتدائی تعلیم بے حد ضروری ہے لیکن جب تک چرچ تعلیمی سیاست کنٹرول کرتا رہے گا ایسا ہونا ممکن نہیں۔

نِسبتاً مفصل اعتراضات کو ذرا ایک طرف رکھ دیا جائے تو جو حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ مسیحیت کے بُنیادی عقائد کو قبول کرنے سے قبل اُن میں اِخلاقی اعتبار سے بہت سے اعتراضات کو دُور کرنے کی ضرورت ہے۔ اِس سِلسلے میں جو سوالات کھڑے ہوتے ہیں اُنکے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ مثلاً ہمیں بتایا جاتا ہے کہ یہ دُنیا اُس خدا نے تخلیق کی جو اچھا بھی ہے اور قادرِ مطلق بھی۔ اِس دُنیا کو تخلیق کرنے سے پہلے ہی اُسے علم تھا کہ اِس میں کم مائیگی، بیچارگی اور دُکھ درد ہوگا۔ اِس لیے اِن سب کا ذمہ دار بھی وہی ٹھہرتا ہے۔ یہ کہنا کہ دُنیا میں درد اور تکلیف گناہ کی بدولت ہے فضول قسم کی بکواس ہے کیونکہ یہ گناہ نہیں ہوتا جس کی وجہ سے دریا بپھر کر سیلاب کی صورت اِختیار کر لیتے ہیں نہ ہی گناہ کی وجہ سے آتش فشاں پھوٹ پڑتے ہیں اور اگر ایسا ہو بھی تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مثال کے طور پر میں ایک ایسے بچے کا باپ بننے جا رہا ہوں جس کے بارے میں مجھے پہلے ہی سے علم ہے کہ وہ بڑا ہو کر جنونی سیریل قاتل ثابت ہو گا۔ اِس صورت میں تو مجھے ہی اُس کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔ اگر خدا پہلے ہی سے جانتا تھا کہ اِنسان کون سے گناہوں کا مرتکب ہوگا تو پھر اُن گناہوں کے نتائج کا بھی وہی ذمہ دار ہے کیونکہ اُس نے خود اِنسان کو تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا عام مسیحی کی یہی دلیل ہوتی ہے کہ اِس دُنیا میں تکالیف دراصل گناہ سے پاک کرنے کے لیے ہوتی ہے اِس لیے اچھا ہے کہ حساب یہیں پر صاف ہو جائے۔ یہ دلیل درحقیقت خود اذیتی کو قدرے معقولیت فراہم کرنے کے لیے ہوتی ہے یوں یہ ایک بڑی گھٹیا دلیل ہے۔ میں کسی بھی مسیحی کو کسی بھی ہسپتال کے بچوں کے وارڈ میں آنے کی دعوت دیتا ہوں تاکہ وہ دیکھیں یہاں کِس طرح بچے تکلیف اور بیماریوں

میں مبتلاء ہیں اور پھر اُنکو دیکھ کر کہیں کہ اخلاقی طور پر وہ اِتنے گھٹیا اور گنہگار ہیں کہ وہ ایسی ہی سزاوں کے حقدار ہیں۔ اِس قسم کی بات کہنے کے لیے خود اِنسان کو اپنے اندر کے تمام رحم اور اُس کے ساتھ جڑے ہوئے جذبات کو تباہ و برباد کرنا ہوگا۔ قصہ مختصر اُس پر لازم ہے کہ وہ اُتنا ہی ظالم و جابر بن جائے جتنا کہ خود وہ خدا جس پر اُس کا ایمان۔ کوئی بھی شخص جس کو یقین ہے کہ اِس دُکھ بھری دُنیا میں ''سب اچھا ہے'' اپنی اخلاقی قدروں کو مجروح کیے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ اُس کے ضمیر میں ذرا سی روشنی کی رَمک باقی ہو تو وہ ایسا کبھی نہ کہہ سکے گا بصورت دیگر وہ ہمیشہ دُنیا میں دُکھ اور درد کے جواز تلاش کرتا رہے گا۔

مذہب پر اعتراضات

مذہب پر دو طرح کے اعتراضات ہیں۔ اوّل دانش مندی سے متعلق ہے اور دوسرا اخلاقی، دانش وارانہ نقطہ نظر سے تو یہ ہے کہ کوئی ایسی وجہ موجود ہی نہیں جس کی بنا پر یہ فرض کر لیا جائے کہ کوئی مذہب سچا ہے۔ جبکہ مذہبی تصورات کا آغاز اُس وقت ہوا جب لوگ آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ خونخوار، ظالم اور جابر تھے اسی لیے وہ اِنسانیت کے خلاف اپنے ظلم و جبر کو مستقل کرنے کی طرف مائل تھے لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اِخلاقی ضمیر متبادل کے طور پر زیادہ شدت اور تیزی کیساتھ نشو و نُما پاتا رہا۔

سب سے پہلے ہم دانش وارانہ نقطہ نظر سے اعتراض کو لیتے ہیں وہ یہ کہ ہماری عملی زندگی میں ایک خاص رجحان موجود ہے اِس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کہ آیا مذہبی تعلیم سچی ہے یا نہیں۔ چونکہ یہ بھی اہم سوال ہے کہ آیا اِس کی کوئی افادیت بھی ہے یا نہیں۔ یہ دونوں سوال باہمی طور پر اِس طرح جُڑے ہوئے ہیں کہ کسی ایک کے بارے میں دوسرے کے بغیر کوئی حتمی فیصلہ نہیں دیا جاسکتا۔ اگر ہم مسیحی مذہب کو ماننے والے ہوتے تو اچھائی کے بارے میں ہماری رائے اُس رائے سے مختلف ہوتی جبکہ ہم مسیحیت کو نہ ماننے والے ہوتے اِسی لیے مسیحیوں کو تو مسیحیت کے اثرات بھلے معلوم ہونگے جبکہ نہ ماننے والوں کو اِس کے اثرات بُرے بھی معلوم دے سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ میں فلاں فلاں قول یا بیان پر من و عن یقین کرلوں اِس سے قطع نظر کہ اُس کی سچائی کے بارے میں کوئی شہادت بھی موجود ہے یا نہیں۔ یہ ایک ایسا رویہ ہے، جو اِنسان سے اُس کے غور و فکر اور مشاہدے کی صفات چھین لیتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اُن تمام حقائق سے جو ہمارے تعصّبات سے مطابقت نہیں رکھتے اپنی آنکھیں اور ذہن بند کر لیتے ہیں۔

ایک خاص قسم کا سائنسی نقطہ نظر جسے سائنسی بے باکی یا صاف گوئی بھی کہہ سکتے ہیں نہایت ہی اہم صفت ہے۔ یہ صفت ایسے شخص میں تو پائی ہی نہیں جاسکتی جو یہ تصور ہو کہ دُنیا میں بہت سے معاملات ہیں جن پر بِلا سوچے سمجھے اِیمان لانا اُسکا فرض ہے۔ اِس لیے اِس سوال کی تحقیق کیے بغیر کہ آیا مذہب سچا بھی ہے یا

نہیں خود مذہب کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں دے سکتے کہ آیا اِس کی کوئی افادیت بھی ہے یا نہیں۔
اُن وقتوں میں جب دُنیا کے طول وعرض میں مذہب کا بڑا غلغلہ تھا لفظ ''خدا'' کا ایک کامل اور مخصوص مطلب تھا۔ لیکن عقلیت پسندوں کی پے در پے یلغار کی وجہ سے یہ لفظ دُھندلا ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ یہ سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ ''ہمیں خدا پر ایمان ہے'' تو اِس سے اُن کی کیا مراد ہوتی ہے۔ آیئے محض دلیل کی خاطر دیکھتے ہیں کہ میتھو آرنلڈ نے لفظ ''خدا'' کی کیا تعریف کی ہے۔ ''ہمارے علاوہ ایک ایسی طاقت جو راستبازی کا مُوجب ہے'' اور شاید ہم بھی اِس کو مزید مبہم بناتے ہوئے خود سے سوال کر سکتے ہیں کہ اِس کائنات میں بطور جیون کے زندہ تو رہنا ہی ہوتا ہے۔ لیکن کیا اِس کے علاوہ بھی کوئی اور شہادت موجود ہے جس سے پتہ چل سکے کہ اِس کُرہ اَرض پر رہنے کا کوئی اور بھی مقصد ہو سکتا ہے۔

مذہبی لوگ اِس موضوع پر عام طور پر اِس قسم کی دلیل دیا کرتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہے، ''میں اور میرا دوست اِنتہائی ذہین اور کئی خوبیوں کے مالک ہیں۔ یہ سوچنا ہی محال ہے کہ اِتنی زہانت اور خوبیاں محض کسی اتفاق کے باعث واقع ہو سکتی ہیں۔ اِس لیے لازم ہے کہ کوئی نہ کوئی تو موجود ہے جو کم از کم اِتنا ذہین اور خوبیوں کا مالک ضرور ہے جتنا کہ ہم ہیں۔ جس نے اپنی آسمانی مشینری کو حرکت میں لا کر ہمیں پیدا کیا'' مجھے افسوس ہے کہ یہ دلیل میرے نزدیک اِتنی موثر نہیں جتنی یہ استعمال کرنے والے سمجھتے ہیں۔ یہ کائنات بڑی وسیع ہے تاہم اگر ہم ایڈنگٹن کو درست مان لیں کہ اِس کائنات میں اِنسان جیسا ذہین جیون یہاں کے علاوہ شاید اور کہیں بھی موجود نہیں۔ اگر آپ غور کریں کہ اِس دُنیا میں کل کتنا مادہ ہے اور پھر اُسے اُس مادے کی مقدار سے جو اِس دنیا میں موجود کُل ذہین جیون کی شکل میں موجود ہے۔ اِس سے مقابلہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ دوسرا پہلے کی نسبت اِتنی حقیر مقدار میں ہے جسکا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا نتیجہ کے طور پر یہ کتنا ہی ناممکن کیوں نہ ہو تب بھی ایسا ممکن ہے کہ چانس کے قوانین کے تحت مخصوص ایٹوں کے اچانک ملاپ کی وجہ سے ذہانت جیسے نامیاتی مادے کی پیداوار کا باعث بن سکتے ہیں۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ دُنیا میں ایسے نامیاتی جانداروں کی تعداد اِنتہائی کم ہے تب پھر غور طلب بات یہ ہے کہ اِس وسیع عمل کو اپنے عروج پر پائیں تو ہم خود کو کافی حد تک لائق تحسین نہیں پاتے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں خود کو بہت سی دوسری اعلیٰ وارفع چیزوں سے کم تر پاتا ہوں۔ در حقیقت اُن میں پائی جانے والی خوبیوں کو میں پوری طرح اپنی پہچان میں نہیں لا سکا وہ ابھی تک میرے فہم وفراست سے بالاتر ہیں تاہم اِس حوالے سے اگر تھوڑی سی لچک کی گنجائش بھی دے دیں تو مجھے اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں سُوجھتا کہ وہ جو قدرت کاملہ ہے جو اَزل سے اِس کائنات میں محوِ عمل ہے شاید وہ اسے قدرے بہتر بنا سکتی تھی اور پھر ہمیں یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ ایسے نتیجے کی حیثیت بھی محض سا اس پین کے

اندر ایک معمولی چنگاری کی جھلک سے بھی کم ہوگی۔ یہ کُرہ اَرض ہمیشہ اسی طرح آباد رہنے کے قابل نہیں رہے گا لہٰذا نسل اِنسانی سرے سے ہی اوجھل ہو جائے گی اور اگر کائناتی عمل کا خود اپنا کوئی جواز ہے کہ اِس دُنیا کے بعد آخرت کی دُنیا بھی ہوگی تو اُسکا بندوبست اِس کُرہ اَرض کے علاوہ کسی اور جگہ کرنا پڑے گا اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو اُسکا بھی خاتمہ جلد بدیر ہونا اٹل ہے۔ کیونکہ تھرموڈائنامکس (Thermodynamics) کے دوسرے قانون کے مطابق خود اِس کائنات کا تیا پانچا ہونے والا ہے جس سے آخر کار کہیں بھی کسی جاندار شئے کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ بلاشبہ تب ہم یہ کہنے میں آزاد ہیں کہ جب وہ وقت آئے گا تب خدا اپنی آفاقی مشینری کو سمیٹ لے گا۔ لیکن جب ہم ایسا کہتے ہیں ہمارا یہ کہنا بھی صرف ایمان کی بنیاد پر ہوگا جبکہ اِس کا ذرہ بھر بھی سائنسی مشاہدے سے متعلق نہ ہوگا۔ جہاں تک سائنسی مشاہدے کا تعلق ہے یہ پوری کائنات آہستہ آہستہ مرحلہ واریوں رینگتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے جو کُرہ اَرض کے لیے اِنتہائی بھیانک نتائج مرتب کرے گی اور پھر مزید رینگتے ہوئے ایسی حالت پر پہنچ جائے گی کہ خود آفاقی موت ہی واقع ہو جائیگی اگر اِس کو جیون کے زندہ رہنے کے مقصد کی شہادت کے طور پر تسلیم کرلیا جائے اِس پر تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ مقصد مجھے قطعی طور پر اپیل نہیں کرتا۔ اِسلئے مجھے کسی قسم کی ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی جس کی بنیاد پر میں کسی قسم کے خدا پر یقین کرلوں چاہے اُسکا تصور کتنا ہی مبہم اور باریک کیوں نہ ہو۔ لہٰذا میں اُن تمام دلائل کو جو پرانے تصورات پر مبنی ہوں مُسترد کرتا ہوں کیونکہ خود مذہب کے معذرت خواہ پہلے ہی اُنکو در یا بُرد کر چکے ہیں۔

رُوح اور لافانیت

مسیحیت کا اِنفرادی رُوح پر شدت سے اِصرار رہا ہے۔ کرسچن معاشروں پر اخلاقی اعتبار سے اِس کے بے حد مضر اثرات مرتب ہوئے۔ یہ اندازِ فکر بنیادی طور پر رواقی مدرسہ فکر (جس میں ضبط نفس پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے) کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے جس سے اُن معاشروں میں سیاسی اُمیدوں کا پنپنا ہی ناممکن ہو گیا۔ اعلیٰ کردار کے ایک تندرست وتوانا شخص کے اندر ایک قدرتی تحریک ہوتی ہے کہ معاشرے میں کوئی اچھا کام کرے لیکن اگر وہ اُن سیاسی توانائیوں سے محروم ہو جائے جن کی بدولت وہ حالات وواقعات پر موقع کی مناسبت سے اثرانداز ہوسکے۔ یوں جب وہ خود کو بے بس پاتا ہے تو وہ اپنے فطری اندازِ زندگی سے بھٹک کر اپنی ذات تک محدود ہو جاتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ بس خود کو ہی اچھا بنالیا جائے یہی کچھ ابتدائی زمانے کے مسیحیوں کے ساتھ ہوا۔ اِس رویئے نے آگے بڑھ کر ذاتی پاکیزگی کے ایسے تصور نے نشوونما پائی جس کے تحت ذاتی راستبازی کچھ ایسی شئے بن گئی جو ہر شئے سے مبرّا ہو لیکن چونکہ کمزور، ضیعف اور کسی بھی قسم کے عمل سے عاری افراد ہی ایسی راستبازی کے حصول میں کامیاب ہوسکتے

تھے لہٰذا اجتماعی فلاح سے متعلق ہر قسم کی نیکی کرسچن اِخلاقیات سے خارج ہوگئی۔ یوں آج تک ہر روایتی قسم کے مسیحی کا یہی خیال ہے کہ ملاوٹ کرنے والا رشوت خور سیاستدان سے کہیں زیادہ بدچلن اور بدکردار ہوتا ہے اگرچہ موخر الذکر اِمکانی طور پر اُس سے ہزار گنا ضرر رساں کیوں نہ ہو۔ قرونِ وسطیٰ میں وہ لوگ، جیسے کہ اُن کی تصویروں سے ظاہر ہوتا ہے، کمزور کردار والے، قدرے نحیف سے، کچھ جذباتی سے نیک تصور ہوتے تھے۔ قصہ مختصر وہ شخص جو تارکِ الدنیا ہو جاتا سب سے اعلیٰ اور برگزیدہ سمجھا جاتا تھا یا پھر کام کرنے کے اہل سینٹ لوئس Saint Louis جیسے افراد ولی سمجھے جاتے تھے جنہوں نے اپنی رعایا کی زندگیوں اور اُنکے مال و متاع کو جنگوں کی نذر کر دیئے۔ چرچ کی نظروں میں کبھی بھی کوئی ایسا شخص ولی نہیں ہو سکتا جس نے مالیات کے شعبے میں اِصلاحات کی ہوں یا فوجداری قوانین کو بہتر بنایا ہو یا عدلیہ میں بہتری لائی ہو۔ فلاح و بہبود کی ایسی خدمات کو تو اُس نے کبھی اہمیت ہی نہیں دی۔ میں تاریخ میں گزرے ہوئے کسی ایک بھی ایسے شخص کا نام نہیں جانتا جس کی ولایت عمومی فلاح و بہبود سے جُڑی ہو یا جس کی پہچان عوامی خدمت کیوجہ سے ہو۔ یوں اِنسان کی شخصیت دو حصوں یعنی سماجی اور اِخلاقی حیثیتوں میں بٹ گئی اِس طرح وقت کے ساتھ رُوح اور جسم میں دُوریاں بڑھتی گئیں اور یہ حالت کرسچن تصورات رینے ڈیکارٹ سے اخذ کردہ سسٹم میں صدیوں برقرار رہی۔ اِسے وُسعتِ قلبی سے بیان کریں تو کہا جاسکتا ہے کہ جسم اِنسان کی سماجی اور پبلک حصے کی نمائندگی کرتا ہے جبکہ رُوح نجی حیثیت کی نُمائندگی کرتی ہے۔ رُوح پر شدت سے زور دینے سے کرسچن اِخلاقیات نے خود کو مکمل طور پر انفرادیت تک محدود کر لیا۔ میرا خیال ہے اِس سے صاف ظاہر ہے کہ مسیحیت کے اِس صدیوں پر محیط عمل کا مقصد اِنسان کو مزید اَنا پرست بنانا اور اُس کو مزید اُس کی ذات کے خول میں دھکیلنا تھا جو اُس کی فطرت کے خلاف تھا۔ جبکہ جنس، ولدیت حب الوطنی اور مجلسی زندگی گزارنے کی جبلت وہ محرکات ہیں جو اِنسان کو فطری طور پر اُس کی اَنا کی چاردیواری سے باہر لاتے ہیں۔ اِن تمام محرکات پر جو یلغار ہوئی وہ کچھ یوں ہے جنس کی مذمت کرنے اور اسے گھٹیا قرار دینے میں چرچ نے ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں کوئی کسّر نہیں چھوڑی خاندانی رغبت اور میلان کی تو خود کرائسٹ اور اُس کے بیشتر پیروکاروں نے جی بھر کر عیب جوئی اور مذمت کی جبکہ حب الوطنی کے جذبات رومن سلطنت کی رعایا میں سِرے سے کوئی جگہ ہی نہ پا سکے۔ لیکن خاندان کے بارے میں جس اندازِ فکر کا انجیل میں ذِکر ہے اُس پر اُتنی توجہ نہیں دی جاسکی جس کی وہ مستحق تھی۔ چرچ کرائسٹ کی والدہ کو تو اِنتہائی عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے لیکن خود کرائسٹ کا اپنا رویہ اِس قدر شائستہ نہ تھا۔ ''اے عورت میرا تجھ سے کیا واسطہ ہے'' (John_ii_4) یہ تھا اُسکا اپنی والدہ کے ساتھ طرزِ تخاطب۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ ''میں یہاں اِنسان کو اِنسان کے خلاف کھڑا کرنے آیا ہوں، بیٹی کو ماں کے خلاف اور بہو کو ساس کے خلاف کھڑا کرنے آیا ہوں اور جو اپنے ماں باپ سے مجھ سے زیادہ محبت کرتا

ہے میرے نزدیک اُس کی کوئی وقعت نہیں'' (Mat_x35_2) اِس سے صاف ظاہر ہے کہ مذہب اور ایمان کی خاطر خود خاندانی بندھنوں کا بھی تیہ پانچا کر دیا جائے۔ یہ ایک ایسا ہولناک رویہ تھا جو عدم رواداری سے جڑ کر مسیحیت کے پھیلاؤ کے ساتھ دُنیا بھر میں متعارف ہوا۔

یہ اِنفرادیت پسندی اپنے عروج کو اُس وقت پہنچی جب یہ عقیدہ متعارف ہوا کہ فرد کی رُوح لافانی ہے اور یہ کہ وہ اب کے بعد آنے والی دُنیا میں دائمی سکون اور مسرت سے رہے گا یا پھر ابدی عذاب میں مبتلاء رہے گا۔ لیکن اُن حالات کے درمیان تفاوت جو دائمی مسرت یا دائمی عذاب سے مشروط ہے اِنتہائی انوکھا بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ مثال کے طور پر ایک پادری کے پانی چھڑکنے کے فوراً بعد آپ کی موت واقع ہو جاتی ہے جبکہ اِسی دوران کُچھ مخصوص الفاظ آپ کی زبان پر ہوں تو بس یوں جانیے کہ ابدی سکون و مسرت آپ کے لیے لازم ہو گیا۔ جبکہ آپ نے ایک طویل زندگی نیکی اور پارسائی میں گذاری ہو لیکن آپ کی موت آسمانی بجلی گِرنے سے ہو جاتی ہے اور اِتفاق سے آپ اُس وقت اپنے جوتوں کے تسمے ٹوٹنے کی وجہ سے جھلاہٹ میں آپ کی زبان پر غلیظ الفاظ تھے تو پھر آپ کے مقدر میں ابدی عذاب ہو گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آج کا جدید پروٹسٹنٹ مسیحی بھی اِس پر یقین رکھتا ہے۔ بلکہ آج کا کیتھولک مسیحی بھی اِس پر یقین نہیں رکھتا۔ بشرطیہ اُس کو مناسب طریقے سے سکھایا یا پڑھایا نہ گیا ہو۔ لیکن میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اِس قسم کا قدیم روایتی اندازِ فکر ماضی قریب تک باقاعدہ طور پر شدت کے ساتھ ایمان کا حصہ تھا۔ میکسیکو اور پیرو میں سپین کے باشندے ہندوستانی بچوں کو بپتسمہ دیا کرتے تھے تو پھر اُس کے فوراً بعد اُن بچوں کے دماغ باہر نکال لیتے تھے۔ اُنکے خیال میں اِس ذریعے سے اُنہوں نے یہ یقینی بنا لیا تھا کہ وہ بچے جنت میں جائیں گے اِس سِلسلے میں کسی بھی روایتی قسم کے مسیحی کو کوئی بھی منطقی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ اِس قسم کی حرکت کی مذمت کرے چاہے آج بھی کوئی ایسا کرے قصہ مختصر یہ کہ مسیحیت کی شکل میں ذاتی لافانیت کے عقیدے اور اندازِ فکر نے بے شُمار پہلوؤں سے اِخلاقیات پر تباہ کُن اثرات مُرتب کیے ہیں غرض رُوح اور جسم کی تصوراتی علیحدگی نے فلسفے پر بے پناہ مضر اثرات چھوڑے ہیں۔

عدم رواداری کا سرچشمہ

مسیحیت کی آمد کے ساتھ دُنیا بھر میں عدم رواداری کا پھیلاؤ یہودی عقیدے کی پاکبازی اور اُنکے خدا کے تصورات کی بناء پر ہوا اور یہی اِس کی سب سے عجیب و غریب خصوصیت ہے اور یہ کہ یہودیوں کی ایسی خصوصیات کیوں رہی ہیں؟ اِس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی اِن خصوصیات نے اُن کی طویل اسیری کے دوران نشوونُما پائی۔ جب یہ کاوشیں ہوئیں کہ اُن کو ایک ایسی

آبادی میں مکمل طور پر ضم کر دیا جائے جو اُنکے نزدیک اجنبی تھی۔ گویا یہ اپنی پہچان کھونے کے اندیشے کا ردِعمل تھا۔ بہرحال حقیقت جو بھی ہو یہودیوں اور خاص طور پر پیغمبروں نے یہ عقیدہ تراش لیا کہ ذاتی پرہیزگاری، پاکبازی پر شدت سے زور دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ اپنے علاوہ دوسرے مذاہب کو برداشت کرنا گویا بدترین گناہ ہوگا۔ اِن دونوں نظریات نے مشرقی تاریخ پر بدترین اثرات مُرتب کیے۔ کونسٹنٹائن Constantine کے دور سے پہلے چرچ نے زیادہ تر مسیحیوں پر رومن ریاست کے ذریعے تشدد کروایا۔ لیکن یہ تشدد ایک تو عام نوعیت کا تھا۔ دوسرا یہ کہ یہ وقفوں وقفوں سے ہوتا تھا۔ تیسرا یہ کہ یہ مکمل طور پر سیاسی نوعیت کا تھا۔ لیکن کونسٹنٹائن کے عہد کے بعد کے ادوار میں 17 ویں صدی تک خود مسیحیوں نے مسیحیوں پر رومن شہنشاہوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تشدد کیا۔ مسیحیت کے عروج سے پہلے قدیم دُنیا میں اِس قسم کی مذہبی آزاد پسندی کا رویہ سوائے یہودیوں کے اور کہیں نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر اگر آپ ہیروڈوٹس Herodotus کی روئداد کا مطالعہ کریں تو آپ کو اُن غیر مُلکی اقوام کی عادات و خصائل کا عِلم ہو جائے گا کہ وہ کتنے خوش اِخلاق اور نرم خُو تھے جنہیں وہ اپنے سفر کے دوران مِلا یہ بھی سچ ہے کہ بعض دفعہ اُس کو عجیب و غریب وحشیانہ رسومات کا سامنا بھی کرنا پڑا جس سے اُسے صدمہ پہنچا۔ لیکن عمومی طور پر غیر مُلکی دیوتاؤں کی طرف اُس کا رویہ بڑا کُشادہ تھا۔ وہ کبھی کسی قسم کی ایسی تشویش میں مبتلاء نہیں ہوا تھا کہ جو لوگ زیوس Zeus کو کسی اور نام سے پُکارتے ہیں وہ دائمی عذاب بھگتیں گے اور یہ کہ اُنہیں فوراً موت کی گھاٹ اُتار دیا جائے تاکہ اُنہیں اُنکے کیے کی سزا جتنی جلد ممکن ہو شروع ہو سکے۔ ایسا رویہ صرف مسیحیوں کیلئے مخصوص ہے اِس میں شک نہیں کہ جدید دور کے مسیحیوں کا رویہ اتنا سخت گیر نہیں لیکن اُنکا نرم رویہ بذاتِ خود مسیحیت کی وجہ سے تو قطعی نہیں بلکہ آزاد خیال لوگوں کی نسل در نسل کاوشوں کی بدولت ہے جو تحریک احیائے علوم و اِصلاح کلیساء کے وقتوں سے مسیحیوں کو اُنکے بہت سے روایتی عقائد سے متعلق شرم دلاتے رہے۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ اب اگر کوئی مسیحی کھڑا ہو کر فخر سے یہ کہتا ہے کہ مسیحیت کتنا معقول اور دھیما مذہب ہے جبکہ وہ اِس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ درحقیقت یہ نرمی اور معقولیت اُن لوگوں کی تعلیمات کی بدولت ہے جنہوں نے اپنے عہد میں راسخ العقیدہ مسیحیوں کے ہاتھوں بے پناہ مصائب اُٹھائے۔ آجکل کوئی بھی یقین نہیں کرے گا کہ یہ دُنیا 4004 B.C قبل مسیح میں وجود میں آئی لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب اِس میں ذرا بھر شبے کا اظہار کرنا ایک بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا کیونکہ ابھی چار ہی نسلیں گذری ہیں یعنی میرے دادا کے دادا نے ETNA کی گھاٹیوں میں پائے گئے مواد کے مشاہدے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ دُنیا اُس سے کہیں زیادہ قدیم ہے جتنا کہ راسخ العقیدہ مسیحی فرض کیے ہوئے ہیں اور پھر اِس رائے کو اُنہوں نے ایک کتاب میں شائع کر دیا۔ اِس جُرم میں اُنہیں اپنے قصبہ County سے ہر قسم کا ناطہ توڑنا پڑا۔ غرض اُنکا حُقہ پانی بند کر دیا گیا۔ اُنہیں اپنی سوسائٹی سے خارج کر دیا

گیا۔ اگر وہ کم حیثیت شخص ہوتے تو اُن کی سزا بلا شُبہ مزید سخت ہوتی۔ راسخ العقیدہ لوگوں کا یہ کہنا کہ وہ اب اُن بیہودہ قسم کی باتوں پر یقین نہیں رکھتے جن پر وہ آج سے ایک سو پچاس سال قبل ایمان رکھتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شدید مزاحمت مسیحیت کے اندازِ فکر کی بتدریج تنزلی صرف آزاد خیال مفکرین کی مسلسل یلغار کی ہی بدولت ممکن ہوئی ہے۔

آزاد اِرادے کا عقیدہ

قدرتی قانون کے موضوع سے متعلق عیسائیوں کا رویہ عجیب وغریب طرح کا ڈگمگاتا اور غیر یقینی سا معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف تو آزاد اِرادے پر مبنی عقیدہ تھا جس پر عیسائیوں کی بڑی اکثریت کا ایمان تھا۔ اِس عقیدے کا تقاضا یہ تھا کہ کم از کم اِنسانی اعمال کو فطری قوانین سے مشروط نہ کیا جائے اور دوسری طرف خاص طور پر اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں خدا پر یقین کُچھ اِس نوعیت کا تھا کہ خدا کو بطور فطری قوانین بنانے والا جانا جاتا تھا مزید یہ کہ اُنکے نزدیک قدرتی قانون بذاتِ خود خدا کے وجود کو بطور خالق ہونے کی سب سے بڑی شہادت فراہم کرتا تھا۔ ماضی قریب میں تو آزاد اِرادے کے مقلدین نے فطری قانون کی بالادستی پر اعتراض کو اپنے حق میں اِس شدت سے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ خود فطری قانون کو جو خدا کو قدرتی قانون بنانے والا ثابت کرتا ہے کو بھی کسی حد تک نظر انداز کر دیا۔ مادیت پرستوں نے فزکس کے قوانین کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اِنسان کی جسمانی حرکات میکانکی انداز میں متعین ہوتی ہیں نیتجتاً ہم جو کُچھ بھی بولتے ہیں یا ہر وہ تبدیل ہوتی ہوئی حالت جس پر اثر انداز ہوتے ہیں آزاد اِرادے کے دائرہ اثر سے ماوراء ہوتی ہے۔ اگر یہ ایسا ہی ہے تو پھر ہماری بے لگام قوتِ اِرادی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص ایک نظم لِکھتا ہے یا کوئی قتل کر دیتا۔ چُونکہ اُس کے جسم کی حرکت بنیادی طور پر خالصتاً فزیکل اسباب سے ہوتی ہے۔ اگر اِس پسِ منظر میں غور کیا جائے تو پہلے والی صورتِ حال میں اُسکا مجسمہ بنایا جانا یا دوسری صورت میں اُس کو پھانسی پر لٹکانا بادی النظر میں مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ کسی مخصوص تصوراتی نظام میں شاید خالص خیال کا میدان بھی ہوسکتا ہے جس میں اِرادہ مکمل طور پر آزاد ہو گا لیکن چُونکہ اِس کے اِظہار کے لیے صرف جسمانی حرکات کا ہی ذریعہ میسر ہوسکتا ہے تو پھر اُس آزاد اِرادے کا دائرہ اثر ایسی نوعیت کا ہوگا جو کبھی بھی باہمی ربط کا موضوع نہیں ہو پائے گا اور نہ ہی اِسے کبھی سماجی اہمیت حاصل ہو پائے گی۔

مزید یہ کہ اِرتقاء نے اُن مسیحیوں پر بے حد اثرات مرتب کیے جنھوں نے اِسے قبول کیا۔ اُنکے تجربات نے اُن پر عیاں کر دیا کہ ایسے دعوؤں سے کام نہیں چلے گا جو اِنسان کے حق میں تو ہوتے ہیں لیکن وہی دعوے زندگی کی دوسری شکلوں پر بالکل مختلف ہونے کی وجہ سے منطبق نہیں ہوتے۔ اِس لیے اِنسان

میں آزاد اِرادے کے عقیدے کو محفوظ رکھنے کے لیے اُنہوں نے ہر اُس کوشش پر اعتراض کیا جس سے جیون سے متعلق مادے کے رویئے کی وضاحت ہو اور یہ کام اُنہوں نے فزیکل قوانین کے حوالے سے بھی کیا اور کیمیکل قوانین کے معنوں میں بھی کرتے رہے۔ نتیجتاً رینے ڈیکارٹ کا یہ دعویٰ کہ تمام نچلی سطح کے جانوروں کی حرکات خودکاریت سے عبارت ہیں۔ لبرل علماء دین کے یہاں قبولیت نہ پا سکا۔ بلکہ اُنکے اندازِ فکر کے تسلسل نے اُنہیں مزید ایک قدم بڑھانے پر مائل کیا اور یہ کہنے سے گریز نہ کیا کہ وہ مادہ جسے ہم مُردہ قرار دیتے ہیں کے رویوں پر ناقابلِ تبدیل قوانین کا بے لچک اطلاق نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے یوں اِس حقیقت کو ہی نظرانداز کر دیا کہ جب آپ قانون کی فرمانروائی کو ہی مسترد کر دیتے ہیں تو اِس کے ساتھ ہی معجزات کے اِمکانات کو بھی مسترد کرتے ہیں۔ چونکہ معجزات خدا کے اعمال ہیں جو درحقیقت معمول کے قوانین میں مداخلت ہوتی ہے۔ یوں میں تو صرف تصور ہی کر سکتا ہوں کہ کس طرح ایک لبرل عالم دین اپنی علم و دانش بکھیرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمام مخلوقات معجزہ ہیں۔ اِس طرح اُسے اس امر کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ وہ کچھ مخصوص واقعات کی وقوع پذیری کو ثبوت کے طور پر اِس پیرائے میں پیش کرے کہ گویا یہ خدائی مداخلت ہے۔ چنانچہ فطری قانون کے خلاف اِس ردِعمل کے اثرات کے تحت کچھ عیسائی معذرت خواہ ایٹم کے بارے میں جدید تحقیق کے طرف متوجہ ہوئے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فزیکل قوانین جن کو ہم اب تک درست مانتے آئے ہیں۔ جہاں تک ایٹموں کی بڑی تعداد کا تعلق ہے اُن پر اِنکا اطلاق قدرے لگ بھگ قسم کا ہوتا ہے اور یہ کہ اُن میں اوسط قسم کی سچائی پائی جاتی ہے۔ جبکہ اِنفرادی طور پر الیکٹرون کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حرکت کرنے میں ہر طرح آزاد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ایک محض عارضی مرحلہ ہے اور یہ کہ فزکس کے ماہرین وقت آنے پر اُن قوانین کو بھی دریافت کرلیں گے جو باریک ترین حقائق پر بھی لاگو ہوتے ہیں۔ چاہے وہ فزکس کے روایتی قوانین سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔ لیکن معاملہ کچھ بھی ہو اُس سے قطع نظر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ باریک ترین ذرات کے بارے میں جدید تحقیق کے اثرات عملی اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ نظر آنے والی حرکات بلکہ وہ تمام حرکات جن کی کسی کے نزدیک اہمیت ہو سکتی ہے وہ ہیں جن میں ایٹموں کی بہت بڑی تعداد شامل ہو۔ مزید یہ کہ اُن پر مجموعی طور پر پرانے قوانین کا پوری طرح احاطہ ہوتا ہو۔ نظم لکھنا یا قتل کرنا (پچھلے ذکر سے جوڑتے ہوئے) یہ ضروری ہوتا ہے کہ ایک معقول مقدار میں سیاہی یا سکہ کو حرکت میں لایا جائے۔ گو کہ وہ الیکٹرون جو اِس سیاہی پر مشتمل ہیں ممکن ہے کہ اپنی ننھی سی رقص گاہ کے گرد بڑی آزادی سے ناچ رہے ہوں۔ لیکن خود وہ رقص گاہ بطور ایک اکائی ہونے کے ناطے سے فزکس کے پرانے قوانین کے تحت ہی حرکت کر رہی ہوگی اور صرف اِسی سے ہی شاعر یا اُس کے پبلشر کا واسطہ ہوتا ہے۔ اِسی لیے جدید تحقیق ایسے مسائل پر جن کا تعلق اِنسانی دِلچسپی سے ہو کسی قسم کے معقول حد تک

ایسے قابلِ ذکر یا قابلِ عمل اثرات مرتب نہیں کرتی جن کے بارے میں عُلماء دین بڑے متفکر رہتے ہیں۔

نتیجتاً آزاد اِرادے سے متعلق سوال عین وہیں پہ ٹکا رہتا ہے جہاں پر وہ تھا۔ اِس کے حتمی تصور کو جس پہلو سے بھی غور کریں تو یہ اَمر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ عملی اعتبار سے اِس پر کسی کا ایمان نہیں۔ ہر شخص کو ہمیشہ یقین ہوتا ہے کہ کردار کی تربیت کرنا ممکن ہے ہر شخص جانتا ہے کہ الکوحل یا افیون رویوں پر مخصوص اثرات مرتب کرتے ہیں۔ آزاد اِرادے کے پیغمبروں کا کہنا ہے کہ اِنسان اپنی قوت اِرادی سے شراب کے نشے سے پرہیز کرسکتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتا کہ کب ایک شراب کے نشے میں چُور شخص کے متعلق ''برطانوی آئین'' اِس طرح واضح طور بیان کرسکتا ہے کہ وہ ہوشمند ہو اور ہر وہ شخص جسکا کبھی بچوں سے واسطہ رہا ہو جانتا ہے کہ ایک مناسب غذا دُنیا کی بہترین فصاحت و بلاغت سے بھرپور تبلیغ کے مقابلے میں اِنسان کو کہیں زیادہ پارسا بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ آزاد اِرادے کے عقیدے کا عملاً یہ اثر ہوتا ہے کہ اِنسان عام فہم پر مبنی علم کے ذریعے کسی معقول نتیجہ پر پہنچنے سے بھی عاری ہو جاتا ہے۔ جب ایک شخص کچھ اِس قسم کا عمل کرتا ہے جس سے ہم اُس سے ناراض ہو جاتے ہیں تو ہمارا جی چاہتا ہے کہ ہم اُسے آوارہ، بدچلن یا مکار قرار دیں اور ایسا کرتے ہوئے دراصل ہم حقیقت کا سامنا کرنے سے اِنکار کر دیتے ہیں کہ اُس کا ناپسندیدہ رویہ اُس کی زندگی کے گذشتہ واقعات کے اسباب کا نتیجہ ہیں اور اگر آپ اُس کے ماضی میں دُور تک جھانک کر دیکھیں تو بعض دفعہ معلوم ہوگا کہ اُسکا ذمہ دار وہ حالات تھے جو خود اُس کی پیدائش سے پہلے رونما ہوئے اور جن کا اُس کو کسی بھی حوالے سے ذمہ دار قرار دینے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

کوئی بھی اِنسان اپنی موٹر کار سے بھی اتنے احمقانہ طریقہ سے سلوک نہیں کرتا جیسے کہ خود ایک اِنسان دوسرے اِنسان سے کرتا ہے۔ جب کار نہیں چلتی تو وہ اُس کے ناپسندیدہ رویئے کو اُس کے گناہ سے منسوب نہیں کرتا۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ ''تم بدکردار موٹر کار ہو اور جب تک تم صحیح طریقے سے نہیں چلوگی میں تمہیں پٹرول نہیں دُوں گا'' بلکہ اِس کے برعکس وہ کوشش کرتا ہے کہ اُس میں خرابی تلاش کر کے اُسے ٹھیک کرے۔ تاہم ہمارے مذہب کی سچائیوں کے مطابق اِنسان کے ساتھ سلوک اِس سے کہیں زیادہ برعکس ہوتا ہے۔ بلکہ ننھے مُنے بچوں کے ساتھ بھی ناروا سلوک رکھا جاتا ہے۔ بہت سے بچوں میں بُری عادات بھی ہوتی ہیں جو محض سزا کی وجہ سے مزید پختہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر اُن پر توجہ نہ بھی دی جائے تو بھی اِس کا اِمکان ہوتا ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ وہ خود بخود ختم ہو جائیں۔ تاہم چند ایک نرسوں کو چھوڑ کر سب کا یہی خیال ہوتا ہے کہ سزا دینا بہت ضروری ہے۔ اگرچہ وہ اِس پر عمل کرتے ہوئے کسی ایک کو پاگل پن تک پہنچانے کا خطرہ مول لیے ہوتی ہیں۔ لیکن جب سزا کی وجہ سے کبھی پاگل پن کی بیماری واقع ہو جائے تو پھر قانون کی عدالتوں میں پاگل پن کو سزا سے منسوب کرنے کی بجائے اُس کی عادات کی ضرر رسانی کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے (میرا

اِشارہ حال ہی میں نیویارک ریاست میں فحاشی کے ایک کیس کی طرف ہے)۔

تعلیم کے شعبے میں زیادہ تر اِصلاحات دیوانوں اور ذہنی طور پر کمزور بچوں کے مطالعہ کے ذریعے آئی ہیں۔ کیونکہ اِخلاقی لحاظ سے اُن کی خامیوں اور ناکامیوں کو اُنہیں ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا تھا اسی لیے ہی اُن پر نارمل بچوں سے زیادہ سائنسی نقطہ نظر سے توجہ دی گئی ماضی میں سمجھا جاتا تھا کہ اگر کوئی لڑکا سبق یاد نہیں کرتا تو اِس کا علاج چھڑی یا کوڑے مارنا ہے۔ جہاں تک بچوں سے سلوک کا تعلق ہے مذکورہ خیال ناپید ہو چکا ہے۔ لیکن فوجداری قوانین میں ابھی تک سزا کو درست مانا جاتا ہے۔ یہ تو بڑا واضع ہے کہ جس شخص کا جرم کرنے کی طرف میلان ہو اُسے اِس سے باز رکھنا لازم ہے۔ لیکن اُس شخص کو بھی باز رکھنا اُتنا ہی لازم ہے جسے پاگل کتے نے کاٹا ہو اور وہ دوسرے لوگوں کو بھی کاٹنا چاہتا ہو اگرچہ اِخلاقی اعتبار سے اُسے کوئی بھی اِس کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا۔ ایک ایسا شخص جو طاعون کے مرض میں مبتلاء ہو جب تک وہ صحتیاب نہ ہو اُسے جیل میں رکھنا چاہیے اگرچہ اُسے کوئی بھی بدکردار یا بدچلن قرار نہیں دیتا اور یہی کچھ ایسے شخص سے بھی ہونا چاہیے جو ایسے تکلیف دہ حالات سے گزر رہا ہو جو اُسے جعل سازی کی طرف راغب کرتے ہیں۔ لیکن اِن دونوں مذکورہ حالتوں پر احساسِ جرم کا سایہ تک نہیں پڑنا چاہیے۔ یہ صرف اور صرف عام فہمی ہے۔ اگرچہ یہ ایک عام فہمی کی ایک شکل ہے۔ تاہم کرسچن اِخلاقیات اور تصورات اِس کے سب سے بڑے مخالف ہیں۔

اگر کسی اِدارے کی کسی کمیونٹی یا سماج پر اِخلاقی اثرات کو جانچنا درکار ہو تو ہمیں اِس امر پر غور کرنا پڑے گا کہ اُس اِدارے کے ساتھ کس قسم کا محرک وابستہ ہے۔ مزید یہ کہ وہ اپنے محرک کو سماج میں کس حد تک وسعت دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بعض دفعہ تو متعلقہ محرک بڑا واضع ہوتا ہے اور بعض دفعہ بے حد چھپا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر الپائن کلب کو ہی لے لیجیے یہ مہم جوئی سے متعلق ہے۔ اِس سے وابستہ محرک صاف ظاہر ہے کہ مہم جوئی کو فروغ دینا ہے اسی طرح علمی و ادبی سوسائٹی کا محرک علم کو بڑھاوا دینا ہوتا ہے۔ خاندان بطور ادارے کے اِس کے ساتھ حسد اور ولدیت سے متعلق احساسات کا محرک وابستہ ہوتا ہے۔ ایک فٹ بال کلب یا کوئی سیاسی پارٹی ہو اُنکے ساتھ کھیل میں مقابلے جیسا محرک وابستہ ہوتا ہے۔ لیکن چرچ اور ریاست دو ایسے بڑے سماجی ادارے ہیں جن کے محرک نفسیاتی مقاصد کے اعتبار سے بے حد پیچیدہ ہیں۔ ریاست کا بنیادی مقصد واضع طور پر مندرجہ ذیل ہے۔

(i) اندرونی مجرموں کے خلاف تحفظ

(ii) بیرونی دُشمن کے خلاف تحفظ

پہلی قسم کے احساس کی جڑیں بچوں کے اُس فطری رجحان سے جُڑی ہوتی ہیں جب وہ خوف زدہ ہوتے ہیں تو آپس میں سمٹ جاتے ہیں اور پھر کسی بڑے یا تومند شخص کے متلاشی ہوتے ہیں جو اُنہیں تحفظ کا

احساس دلائے۔ جبکہ چرچ کا اِس حوالے سے معاملہ زیادہ پیچیدہ ہے۔ اِس میں تو کسی قسم کے شک وشُبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ خوف مذہب کا اہم ترین سرچشمہ ہے جس کا مشاہدہ آج بھی ہوسکتا ہے۔ چُونکہ کوئی بھی ایسا واقعہ جو لوگوں کو ہراساں یا دہشت زدہ کرتا ہو عام لوگوں کے خیالات کو خدا کی طرف موڑ دیتا ہے۔ جنگیں متعدی بیماریاں اور جہاز کی غرقابی غرض اِس قسم کے سب واقعات لوگوں کو مذہب کی طرف مائل کرنے میں بے حد مددگار ہوتے ہیں۔ تاہم دہشت کے علاوہ بھی مذہب میں دوسرے ایسے عوامل ہیں جن کے ذریعے سے وہ بہت دِلکش معلوم ہوتا ہے اور لوگ اِس پر ریجھ جاتے ہیں۔ اگر میسحیت سچی ہے تو انسان کیڑے مکوڑے نظر آتے ہیں۔ اُنہیں اِس کائنات کے ایسے خالق سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے جو اُنکے اچھے رویئے دیکھ کر بے حد خوش ہونے کا تکلف کرتا ہے اور اُن بُرے رویوں پر ناخوش بھی ہوتا ہے۔ یہ بڑی تعریف و توصیف کی بات ہے۔ البتہ ایسا سوچتے ہوئے ہمیں اُن چیونٹیوں کے بلوں کی طرف دھیان نہیں دینا چاہیے کہ کون کونسی چیونٹی اپنے متعلقہ فرائض ٹھیک انجام دے رہی ہے اور پھر ہمیں یقینی طور پر ایسی کسی چیونٹی پر بالکل توجہ نہیں دینی چاہیے جو اپنے فرض سے غافل پائی جائے اور پھر ہم اُس کو نکال کر کہیں باہر بھڑکتی آگ میں پھینک دیں۔ اگر خدا ہمارے ساتھ ایسا کرتا ہے تو گویا یہ ہماری اہمیت کی تعریف کے مترادف ہوتا ہے اور پھر یہ بھی ہماری مزید خوشگوار تعریف کے ذمرے میں آتا ہے کہ اگر خدا ہم میں سے کُچھ لوگوں کو جنت میں دائمی خوشی عطا کرتا ہے۔ تب ایک اور قدرے جدید نظریہ ہے جس کے تحت کائنات کا اِرتقاء کُچھ اِس طرح سے طے کیا گیا ہے جس سے ایسے نتائج سے ہم اچھی طرح فیض یاب ہوتے ہیں اور پھر یہاں ایک مزید خوشامد کا عنصر شامل ہوجاتا ہے جس کے تحت فرض کرلیا جاتا ہے کہ اِس کائنات کو کنٹرول کرنے والی ضرور کوئی ایسی ذات ہے جو ہماری پسندیدگیوں اور تعصّبات میں ساجھے دار ہے۔

پرہیزگاری کا نظریہ

نفسیاتی محرک مذہب کے ساتھ جُڑا ہوا تیسرا بڑا محرک ہے جو پرہیزگاری کی طرف رُخ کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت سے آزاد مفکرین اِس نظریہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اُنکا کہنا ہے کہ کٹر قسم کی اصول پرستی پر مبنی مذہب کے زوال کے باوجود اِس نظریہ کو محفوظ رہنا چاہیے میں اِس نقطہ پر اُن سے اِتفاق نہیں کرتا۔ پاکبازی کے نظریئے پر غور کرتے ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں اِس کی جڑیں ناپسندیدہ جذبات پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ اِس کے گرد مذہبی تقدس سے بھرپور دلائل کی دیواریں تعمیر کرکے اِسے مضبوط بنانے کی کوشش کرنا کسی طرح بھی قابلِ تحسین نہیں پاکبازی اور ناپاکبازی کو ایک دوسرے کے ساتھ مِلا کر دیکھنا لازم ہوگا۔ اِس سے کام نہیں چلے گا کہ ایک پر تو زور دیا جائے اور دوسرے پر زور نہ دیا

جائے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ناپاکبازی ہوتی کیا ہے؟ یہ عملاً ایک ایسا رویہ ہوتا ہے جو ہجوم کے نزدیک بے حد ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ ہجوم جب اِس کو ناپاکبازی قرار دیتا ہے تو پھر وہ اِس نظریہ کے گرد نہایت احتیاط اور تفصیل سے اِخلاقیات کا اِس پیرائے میں تانا بانا بُنتا ہے کہ اپنی ہی ناپسندیدگیوں کو اِنتقام کا نشانہ بنانے کی لیے سزا کا جواز فراہم کر لیتا ہے۔ چُونکہ ہجوم بزعمِ خود پاکباز ہوتا ہے یوں اپنی عزتِ نفس کو بڑھالیتا ہے۔ جبکہ دوسرے اِس کے نزدیک حقیر ہو جاتے ہیں اور جس لمحے ہی وہ ایسا کرتا ہے اُسی وقت اُس کے اندر ظلم و جبر کے محرکات حرکت میں آجاتے ہیں۔ یہ ہے وہ بے محابا قتل وغارت کی نفسیات جس کا اظہار اب بھی سرکاری طور پر مجرمین کی جسمانی سزا کی صورت میں ہوتا ہے۔ قصہ مختصر جبر و ستم کو اِنصاف کے لبادے میں چھپا کر اذیت پسندی کی راہیں ہموار کرنا پاکبازی کے تصور کا حتمی نچوڑ ہے۔

اِس پر مجھے یہ کہا جائے گا کہ آپ کا پاکبازی کے بارے میں بیان عبرانی پیغمبروں پر پوری طرح صادق نہیں آتا کہ جنہوں نے آپ ہی کے بقول یہ نظریہ تراشا۔ عبرانی پیغمبروں کے وقتوں میں پاکبازی کا مطلب صرف وہی ہوتا تھا جسکا وہ اور یہواہ خود تصدیق کرتے۔ پیغمبر اپنے اعمال میں بھی عین وہی رویہ ظاہر کرتے۔ چُنانچہ وہ پیغمبر اپنے اعلانات کی شروعات کُچھ اِس قسم کے الفاظ سے کرتے ''چُونکہ رُوح القدس کو اچھا معلوم ہوتا ہے اور ہمیں بھی'' (Acts_XV_28)۔ تاہم اِس قسم کے اِنفرادی یقین کو جو خدا کے مزاج اور اُس کی رائے کو ظاہر کرتا ہو کسی بھی طرح کسی ادارے کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ لہٰذا پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو ہمیشہ سے اِس مشکل کا سامنا رہا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی دوسرا پیغمبر آ کر کہہ سکتا تھا کہ اُس پر نازل ہونے والی وحی اُس سے پہلے والے پیغمبروں کے مقابلے مین زیادہ حتمی اور قابل اعتبار ہے جبکہ پرٹسٹنٹس کے پاس کوئی ایسا مخصوص نقطہ نظر سِرے سے موجود ہی نہیں تھا جس کی بنیاد پر اُس کے دعوے کو رَد کر سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ بے شمار فرقوں میں تقسیم ہوتے رہے جو آپس کی کشمکش سے کمزور ہوتے چلے گئے۔ اِسی بنیاد پر یہ فرض کرنا غلط نہیں ہوگا کہ آج سے سو سال بعد کیتھولک چرچ ہی وہ واحد مؤثر ادارہ رہ جائے گا جو عیسائی عقیدے کی نمائندگی کرے گا۔ چُونکہ اِس چرچ میں پیغمبروں کو تقدس کے اعتبار سے اعلیٰ مقام حاصل ہے اسی لیے اِس میں زندہ رہنے کی خاصی گنجائش موجود ہے۔ لیکن اِس میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ جو تحریک خالصتاً خدا کی طرف سے آئی ہوئی معلوم ہوتی ہے ہوسکتا ہے کہ وہ شیطان کی طرف سے ہو۔ لیکن کیا خدا کی طرف سے ہے اور کیا شیطان کی طرف سے اِس میں تفریق کرنا چرچ ہی کا کام رہ جاتا ہے۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کوئی فنِ مصوری میں ماہر ہی لیونارڈو وِنسی کے شاہکار کی اصل اور نقل میں تفریق کرنے کا کام سرانجام دیتا ہے۔ اِس طرح ابہام کا تعین کرنا باقائدہ ادارہ جاتی صورت اِختیار کر لیتا ہے یوں ایک ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ پاکبازی صرف وہی ہو سکتی ہے جو چرچ کو منظور ہو اور ناپاکبازی وہ ہوتی ہے جو چرچ کو نامنظور

ہو۔اِس طرح پاکبازی کے نظریے کا مؤثر ترین حصہ ہجوم کے لیے نفرت کا جواز مہیا کرتا ہے۔

اِس لیے یوں معلوم ہوتا ہے کہ تینوں اِنسانی محرکات یعنی خوف، تکبر یا خود پسندی اور نفرت مذہب کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ کہنے میں ہم حق بجانب ہیں کہ مذہب کا مقصد اِن تینوں قسم کے جذبات کو عزت و احترام بخشنا ہے۔ بشرطیکہ یہ ایک مخصوص دھارے میں رہیں۔ چونکہ یہ خود لوگوں کو اِن جذبات میں بہنے کی اِجازت دیتا ہے اور پھر یہ جذبات کسی ایسی صورت حال میں اُبل پڑیں جس میں چرچ کی منظوری نہ ہو تب پھر کم از کم ایسا تو ہو کہ اُن کو کسی حد تک کنٹرول کیا جاسکے۔

اِس مرحلہ پر میں تصور کرسکتا ہوں کہ گویا دقیانوسی لوگوں کی اکثریت کی طرف سے تو یہ اعتراض اُٹھائے جانے کا اِمکان بہت کم ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُسے جانچنا بہت ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نفرت اور خوف اِنسان کی لازمی خصوصیات ہیں اور یہ کہ اِنسانیت ہمیشہ ایسا محسوس کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ اِس بارے میں مجھے یہ بتایا جاتا ہے کہ اِس کا بہترین حل یہ ہے کہ اِن جذبات کا رُخ اُن راستوں کی طرف موڑ دیں جن میں وہ دوسرے راستوں کے مقابلے میں کم سے کم ضرر رساں ثابت ہوں۔ ایک عیسائی عالم دین شاید کہے کہ اُس کا اِن جذبات کے بارے میں رویہ چرچ کے اُس رویئے سے مماثل ہے جو وہ جنس کے محرک کے بارے میں رکھتا ہے اور جس کو وہ قابلِ ملامت سمجھتا ہے۔ چرچ جنس کی شدید خواہش کو ازدواجی زندگی کے بندھنوں میں محدود کرتے ہوئے اِس کو بے ضرر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ پس یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر اِنسانیت کے لیے نفرت کرنا ناگزیر ہے تو بہتر ہے کہ اِس نفرت کا رُخ اُن کی طرف موڑ دیا جائے جو درحقیقت ضرر رساں ہونے کی وجہ سے قابلِ نفرت ہیں۔ عین یہی وہ عمل ہے جس پر چرچ اپنے پاکبازی کے نظریے کے تحت کاربند ہے۔

اِس نقطہ زیرِ بحث کے دو جوابات ہیں۔ ایک تو قدرے سطحی سا ہے جبکہ دوسرے میں اِس کی تلاش کے لیے اِس کی جڑ تک پہنچنا ضروری ہے۔ لیکن بنیادی طور پر جواب یہ ہے کہ نفرت اور خوف کے عناصر کو موجودہ دستیاب نفسیاتی علم اور صنعتی تکنیک کی مدد سے اِنسانی زندگی سے کُلی طور پر خارج کیا جاسکتا ہے۔

پہلا نقطہ پہلے ذکر کرتے ہوئے کہ چرچ کا پاکبازی کا نظریہ سماجی اعتبار سے کس طرح سے ناپسندیدہ ہے۔ مثلاً سائنس اور ذہانت کے بارے میں اِس کا رویہ اِس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ یہ نقص اِس نے انجیل سے وِرثہ میں پایا ہے۔ کرائسٹ ہدایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم لوگ چھوٹے بچے بن جاؤ جو جھوٹی دلیل جانچنے کی تمیز نہیں رکھتے وہ حساب کتاب کے فرق کو نہیں سمجھ سکتے یا کرنسی نوٹ کن اصولوں کے تحت چھاپے جاتے ہیں نہ ہی انہیں بیماریوں سے بچاؤ کے جدید طریقوں کا علم ہوتا ہے۔ چرچ کے نزدیک اِس قسم کے علوم تو ہمارے فرائض میں شامل ہی نہیں۔ چرچ اب کسی طرح بھی علم کو ناجائز قرار نہیں

دیتا ہے۔ اگر چہ ماضی میں اپنے عروج کے ادوار میں ایسا کرتا رہا ہے۔ لیکن علم کا حصول اگر چہ گناہ تو نہیں البتہ خطرناک ضرور ہے۔ کیونکہ اِس کا حصول احساس برتری پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے اور اِسی بناء پر خود عیسائیت کے دقیانوسی تصورات پر اُنگلیاں کھڑی ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر دو اشخاص ہیں اُن میں سے ایک شخص نے خط اِستوا کے وسیع علاقوں میں زرد بخار کا قلع قمع کیا ہو لیکن اُس کے شب و روز محنت کے دوران بعض دفعہ کچھ ایسی عورتوں سے تعلقات قائم ہو گئے ہوں جن سے اُس کی شادی نہ ہوئی ہو۔ جبکہ دوسرا شخص اپنی فطرت کے اعتبار سے سُست قسم کا ہو اور نالائق بھی۔ وہ اگر ہر سال ایک عدد بچے کا باپ بھی بنتا چلا جاتا ہو حتیٰ کہ اُس کی بیوی ناتوانائی اور مسلسل تھکن کی وجہ سے وفات پا جائے اور اُس کے انتقال کے بعد اپنے بچوں کی دیکھ بھال پر اِتنی کم توجہ دیتا ہو کہ اُن میں سے آدھے صرف اُن وجوہات کی بناء پر وفات پا جائیں جن سے بچاؤ ممکن تھا۔ ایک اچھا عیسائی لازمی طور پر یہ کہے گا کہ دوسرا شخص پہلے شخص کے مقابلے میں زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے۔ ایسا رویہ نہ صرف ضعیف الاعتقادی پر مبنی ہوتا ہے بلکہ عقل و دانش کے اعتبار سے انتہائی نامعقول۔ اِس قسم کی بیہودگی اُس وقت تک قائم و دائم رہے گی جب تک گناہ سے احتراز کو مثبت خوبیوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی جاتی رہے گی اور جب تک علم کے حصول کو کارآمد زندگی بنانے کا ذریعہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔

خوف اور نفرت کے جذبات کو استعمال میں لاتے ہوئے چرچ جو طرزِ عمل اِختیار کرتا ہے اس پر دوسرا اور زیادہ اہمیت کا اعتراض یہ ہے کہ اِس قسم کے جذبات تعلیمی، معاشی اور سیاسی اِصلاحات کی مدد سے تقریباً مکمل طور پر خارج کیے جاسکتے ہیں۔ اِس سلسلے میں تعلیمی اِصلاحات کو لازمی طور پر بنیاد ہونا چاہیے جو نفرت اور خوف محسوس کرتے ہیں وہی لوگ اِن جذبات کو نہ صرف سراہتے ہیں بلکہ اُن کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ قائم و دائم رہیں۔ اگر چہ اِس تعریف اور خواہش کے متعلق اِمکان یہی ہے کہ یہ لاشعوری ہوتی ہو گی جیسے ایک عام عیسائی ہوتا ہے۔ ایسی تعلیم کا فروغ جس کا مقصد خوف کو اُکھاڑ باہر کرنا ہو کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کے لیے صرف یہ ضروری ہے کہ بچے سے محبت اور شفقت سے پیش آیا جائے اور اُسے ایسا ماحول مُہیا کیا جائے جس میں تباہ کن اثرات سے پاک پہل کاری کے جذبات نشوونُما پائیں۔ مزید یہ کہ اُنہیں اُن بالغ حضرات سے دُور رکھا جائے جو خواہ مخواہ دہشت پھیلانے کا باعث بنتے ہیں۔ چاہے وہ دہشت یا خوف اندھیرے کا ہو۔ چوہوں کا ہو یا کسی سماجی اِنقلاب کا۔ بچے کو کسی حالت میں بھی سخت سزا کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے۔ اُسے شدت کے ساتھ دھمکانا یا جھڑکنا ممنوع ہونا چاہیے۔ بچے کو نفرت کا نشانہ بننے سے روک تھام کے لیے دُور اندیشی پر مبنی طرزِ فکر کی ضرورت ہوتی ہے ایسے حالات جس میں حسد پرورش پاتا ہے بڑی احتیاط اور مختلف بچوں کے درمیان بھرپور اِنصاف کے ذریعے بچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

لازم ہے کہ بچہ خود کو ایسا محسوس کرے گا گویا وہ کم از کم اُن بالغ حضرات کی گرم جوشی سے بھرپور توجہ کا مرکز ہے جن سے اُس کا واسطہ رہتا ہے۔ سوائے اُن حالات میں جن کی بدولت صحت یا زندگی کو خطرہ ہو اُس کی فطری سرگرمیوں پر کسی طرح کی قدغن نہیں ہونی چاہیے۔ اُس کے تجسس اور جستجو کی کسی حالت میں حوصلہ شکنی نہیں ہونی چاہیے۔ خاص طور پر جنس سے متعلقہ علم کے حصول کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ مزید یہ کہ اُن معاملات پر گفتگو سے بھی منع نہیں کرنا چاہیے جن کو لوگ غیر مناسب سمجھتے ہیں۔ اگر اِن سیدھے سادے سے تصورات کو آغاز سے ہی مدنظر رکھا جائے تو بچہ نڈر ہونے کے علاوہ آپ سے دوستانہ میل جول بھی قائم رکھنے کا خواہشمند ہو گا۔

وہ لڑکی یا لڑکا جس نے یوں تعلیم پائی ہو گی سن بلوغت میں داخل ہوتے ہی خود کو ایک ایسی دنیا میں پائے گا۔ جو ظلم و جبر، نا اِنصافی اور ایسی پریشانیوں سے اَٹی پڑی ہے جن کا تدارک ممکن ہوتا ہے۔ اِس جدید دُنیا میں موجود نا انصافی، ظلم و جبر اور پریشانیاں دراصل ماضی کا وِرثہ ہیں اِن سب کا حتمی سرچشمہ معاشی ہوتا ہے۔ کیونکہ پہلے وقتوں میں رزق کے حصول کے لیے زندگی اور موت پر مبنی مقابلہ ناگزیر تھا۔ لیکن اب ہمارے زمانے میں یہ ناگزیر نہیں رہا۔ موجودہ تکنیک کی بدولت اگر ہم چاہیں اور اِرادہ کر لیں تو ہر ایک کو مناسب حد تک پیٹ پالنے کے لیے ذرائع مُہیا کر سکتے ہیں ہم ایسا بندوبست بھی کر سکتے ہیں کہ دُنیا کی موجودہ آبادی کو مزید بڑھنے نہ دیں۔ بشرطیکہ ہم چرچ کے سیاسی اثر و رسُوخ سے آزاد رہیں کیونکہ اُس کی خواہش ہمیشہ یہی رہے گی کہ دُنیا میں جنگیں ہوتی رہیں۔ بیماریاں پھیلتی رہیں قحط پڑتے رہیں تا کہ مصیبتوں کے مارے لوگ اُن سے رجوع کرتے رہیں اور اُنہیں مانع حمل سے متعلق تدابیر کا خیال تک نہ آئے ہمارے پاس اب اِتنا علم موجود ہے جس کو بروئے کار لا کر دُنیا بھر کو خوشیوں کا گہوارہ بنا سکتے ہیں۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے اِس کے استعمال کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہب ہے۔ مذہب ہمارے بچوں کو ایک معقول قسم کی تعلیم سے محروم رکھتا ہے۔ مذہب ہمیں اُن وجوہات کو جو جنگوں کا باعث بنتی ہیں ختم کرنے سے روکتا ہے۔ مذہب ہمیں گناہ اور ثواب کے دقیانوسی عقائد کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ سائنٹیفک تعاون سے روکتا ہے۔ اِس کا اِمکان ہے کہ آج اِنسانیت اپنے سُنہری دور میں داخل ہونے والی ہے اور اگر ایسا ہی ہے تو سب سے پہلے اِس کی دہلیز پر محافظ کی شکل میں کھڑے مذہبی عفریت کو قتل کرنا ہو گا۔

باب ۔۔۔ ۳

کُچھ اپنے نقطہ نظر کے بارے میں

''میرا اپنا نقطہ نظر'' کے نام سے یہ کتاب 1925ء میں شائع ہوئی۔ اِس کی تمہید میں لکھا ہے کہ ''میں نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ میرے نزدیک اِس کائنات میں اِنسان کی کیا حیثیت ہے اور اِس کو زندگی کے سفر میں اچھی اور بہتر زندگی کے حصول کے لیے کن اِمکانات کا سامنا ہے۔ اِنسانی معاملات میں ہمیں اُن قوتوں کا مشاہدہ ہوتا ہے جو زندگی میں راحت و مسرت کا باعث ہوتی ہیں اور اُن قوتوں کا اِدراک بھی ہوتا ہے جو زندگی کو رنج والم میں مبتلاء کرتے ہیں ہمیں نہیں معلوم کہ اِن میں کونسی غلبہ پائیں گی لیکن عقل و دانش سے قدم آگے بڑھانے سے بیشتر اِن دونوں قوتوں کا اِدراک ہونا لازم ہے۔'' 1948ء میں نیو یارک میں ایک عدالت میں کارروائی کے دوران ''میرا نقطہ نظر'' اُن کتابوں میں سے ایک تھی جو رَسل کے خلاف بطور شہادت پیش کی گئی جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ رَسل سِٹی کالج میں تعلیم دینے کا اہل ہی نہیں اِس کتاب سے مختلف اِقتباسات کو وسیع پیمانے پر عام طور پر اِس پیرائے میں شائع کیا گیا جس سے رَسل کے خیالات سے متعلق غلط و مسخ شدہ تاثر مرتب ہو۔

قدرت اور اِنسان

اِنسان قدرت کا ایک حصہ ہے۔ یہ قطعی طور پر کوئی ایسی شئے نہیں جو قدرت سے تضاد کی حامل ہو بلکہ اُس کے خیالات اور جسمانی حرکات اُنہیں حرکت کے قوانین سے ہم آہنگ ہیں جو ننھے سے ذرات سے لے کر عظیم سیاروں اور ستاروں کی حرکت سے عبارت ہیں۔ مادی اعتبار سے دُنیا اُس کے مقابلے میں بہت بڑی اور وسیع ہے۔ بلکہ دانتے کے وقتوں میں جتنی بڑی متصور ہوتی تھی اُس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ لیکن

اِتنی بھی وسیع نہیں جتنی کہ آج سے ایک سو سال قبل معلوم ہوتی تھی۔ پستی کے اعتبار سے، بُلندی کے اعتبار سے وسعت کے اعتبار سے یا کم مائیگی کے پہلو سے غرض جس پہلو سے بھی غور کریں سائنس اِس کی حدوں کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کائنات خلاؤں میں اپنی وسعتوں کے اعتبار سے محدود ہے کہ روشنی اِس کے گرد اگر چند سو ملین سال کے اندر ایک چکر مکمل کر سکتی ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ مادہ الیکٹرون اور پروٹون پر مشتمل ہے جو اپنے سائز کے اعتبار سے محدود اور اپنی تعداد کے اعتبار سے بھی محدود ہے۔ اِمکانی طور پر اُن میں تبدیلیاں غیر مسلسل لیکن زوردار جھٹکوں کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں۔ اِن جھٹکوں کی شدت کسی طرح بھی عام نوعیت کی نہیں ہوتیں اور جن کے تحت یہ تبدیلیاں رُونما ہوتی ہیں اور جن کی بناء پر دُنیا کا ماضی اور مستقبل متعین ہوتا ہے اِس بارے میں ہمیں ہر چیز معلوم ہو جاتی ہے بشرطیکہ اِس کی تاریخ چاہے جزوی طور پر ہی کیوں نہ معلوم ہو سکے۔

یوں فزیکل سائنس ایسی بلندیوں کو چھو رہی ہے کہ شائد اِس کی تکمیل ہونے والی ہے اور اِس طرح یہ غیر دِلچسپ بھی ہونے جا رہی ہے۔ جیسے کہ پہلے ذکر ہوا ہے کہ اُن قوانین جن کے تحت الیکٹرون اور پروٹون کی حرکت متعین ہوتی ہے کے علاوہ باقی تو محض جغرافیہ ہی رہ جاتا ہے یا پھر اُن مخصوص حقائق کا مجموعہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ حقائق کی تقسیم دُنیا بھر میں تاریخ کے کسی محدود حصہ میں کس طرح ہوئی اور پھر خود جغرافیہ کے متعلق حقائق کی کُل تعداد معلوم کرنا اِس لیے مطلوب ہوتا ہے کہ دُنیا کی تاریخ متعین ہو سکے اور امکان یہی ہے کہ وہ تعداد بھی اِتنی محدود ہے جس کا مکمل ذکر ایک بہت بڑی کتاب میں سما سکتا ہے جو سمرسٹ ہاؤس میں رکھی جا سکتی ہے اور جس کے ساتھ حساب کتاب کی ایسی مشین لگا دی جائے جس کے محض ہینڈل گھمانے سے ہر اُس شخص کو متعلقہ ریکارڈ شدہ حقائق سے آگاہی ہو سکتی ہے جو ایسا کرنا چاہے۔ اِس سے کم اُکتاہٹ اور بوریت سے بھرپور غیر دلچسپ صورتِ حال کا تصور کرنا بھی محال ہے جبکہ اِس کے برعکس نامکمل دریافت کا لطف ہی اور ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی بہت بڑی پہاڑی چوٹی سر کرے اور پھر وہاں اُسے ایک دُھند سے لپٹا ہوا ریستوران ملے جس میں ادرک کی شراب فروخت ہو رہی ہو اور اُن کے پاس ایک عدد وائرلیس سیٹ ہو اور بس! ہو سکتا ہے کہ Ahmes کے عہد میں ضرب و تقسیم کی کوئی ایسی چیز اُن لوگوں کے لیے باعثِ کشش ہو لیکن اب اِس میں کچھ نہیں رکھا۔

یہ مادی دُنیا بذاتِ خود نہایت غیر دلچسپ ہے اور اِنسان اِس کا ایک حصہ ہے۔ اُسکا جسم دوسرے کسی مادے کی طرح الیکٹرون اور پروٹون سے تشکیل شدہ ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے وہ اُنہیں قوانین کے تابع ہیں جو دوسرے جانوروں اور پودوں کے حصوں کو تشکیل دیتے ہیں کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ فزیالوجی کے مرتبے کو گھٹا کر کسی صورت بھی فزکس نہیں بنایا جا سکتا ہے لیکن اُن کے دلائل میں کوئی وزن نہیں

ہے اور یہ دانشمندی کا تقاضا ہے کہ ہم فرض کر لیں کہ وہ غلط ہیں۔ وہ جنہیں ہم ''خیالات'' کہتے ہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے سفر کا سارے کا سارا دارومدار ذہن کے اندر بنے ہوئے ایک منظم پٹڑیوں کے نیٹ ورک پر ہوتا ہے بالکل اُسی طرح جیسے ہمارے سفر کا انحصار سڑکوں اور ریلوے پر ہوتا ہے اور وہ توانائی جو سوچنے پر صرف ہوتی ہے وہ جسم کے اندر مخصوص کیمیکل عمل فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جسم میں آیوڈین کی کمی ایک ذہین اور چالاک شخص کو کُند ذہن اور احمق بنا سکتی ہے۔ ذہن ایک ایسی شئے معلوم ہوتی ہے جو مادی ڈھانچے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اگر یہ ایسا ہی ہے تو پھر ہم یہ فرض ہی نہیں کر سکتے کہ ایک مجرد یکہ و تنہا الیکٹرون یا پروٹون ''سوچ'' سکتا ہے۔ شائد یہ تو توقع کر سکتے ہیں کہ کوئی یکہ و تنہا فٹ بال میچ کھیل سکتا ہے۔ لیکن ہم یہ فرض بھی نہیں کر سکتے کہ فرد کے خیالات اُس کی موت کے بعد بھی بچے رہ سکتے ہیں کیونکہ موت ذہن کے اندر ہر طرح کی تنظیم کو تباہ و برباد کر دیتی ہے اور اُس توانائی کو بھی بکھیر کر مٹا دیتی ہے جو ذہن کی پٹڑیوں کو قابلِ استعمال رکھتی ہے۔

مسیحیت میں خدا اور لافانیت کو مرکزی عقائد کی حیثیت حاصل ہے جبکہ سائنس میں اِس قسم کے مفروضے کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اِن دونوں عقائد میں سے کونسا ایک مذہب کے لیے ضروری ہے کیونکہ بُدھ مت میں تو اِن میں سے کوئی بھی موجود نہیں (یہ بیان چونکہ ''اگر'' اور ''مگر'' سے مبّرا ہے اِس لیے ہوسکتا ہے کہ یہ قدرے گُمراہ کُن معلوم ہو لیکن یہ اپنے حتمی تجزیئے کے اعتبار سے دُرست ہے) لیکن ہمیں یہاں مغرب میں علم کا اِتنا مختصر خلاصہ کر کے جائزہ لینا پڑتا ہے کہ اِس کا مزید اختصار نہ ہو سکے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ لوگ اپنے عقائد پر ڈٹے رہیں گے کیونکہ اُنہیں یہ خوشگوار معلوم ہوتے ہیں بالکل اُسی طرح خوشگوار اور اِطمینان بخش جیسے کہ ہم خود کو تو پرہیز گار سمجھتے ہیں جبکہ دُشمن کو بد چلن اور بدکردار تاہم میرے نزدیک یہ سب بے کار اور بے بُنیاد ہے۔ لیکن میں مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے یہ دعوٰی نہیں کرتا کہ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ خدا کا وجود ہی نہیں ہے۔ عین اِسی طرح یہ بھی نہیں ثابت کر سکتا کہ شیطان ایک محض فسانہ ہوسکتا ہے کہ کرسچن خدا موجود ہو یوں اولمپس کا خدا بھی موجود ہوسکتا ہے اور قدیم مصر اور بابل ونینوا کا بھی ہو۔ لیکن اِن میں سے کسی بھی مفروضے میں دلائل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ وزن نہیں پایا جاتا قصہ مختصر خدا کے تمام مفروضے علم کی فرمانروائی کے دائرہ سے باہر مقیم ہیں۔ لہٰذا مجھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اِن پر کسی بھی حوالے سے غور بھی کیا جائے۔ میں اِس سوال پر اور کُچھ نہیں کہوں گا کیونکہ اِس کے بارے میں کہیں اور تفصیل سے بیان کر چکا ہوں۔ (I see my philosophy of libinz (charter XV .

ذاتی لافانیت کے سوال کی بنیاد قدرے مختلف نوعیت کی ہے۔ اِس کی چھان بین دونوں طریقوں

سے ممکن ہے۔ اشخاص ایسی معمول کی دُنیا کا حصہ ہیں جس سے سائنس کے علوم وابستہ ہیں جن کے ذریعے وہ حالات قابل دریافت ہیں جو اُن کے وجود کو متعین کرتے ہیں۔ پانی کا ایک قطرہ لافانی نہیں ہے۔ یہ آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تحلیل کیا جاسکتا ہے۔ اِس لیے اگر فرض کریں کہ وہ پانی کا قطرہ جب یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں رطوبت کی ایسی صفت موجود ہے جو میری تحلیل کے بعد بھی قائم ودائم رہے گی تو ہمارا شک وشبہ میں مبتلا ہونا یقینی ہے۔ بالکل اِسی طرح ہم جانتے ہیں کہ زمین بھی لافانی نہیں اور یہ کہ ایک جیتے جاگتے جسم میں منظم انداز میں حرکت کرتی ہوئی توانائی موت کے ساتھ اِس طرح منجمد ہوکر رہ جاتی ہے کہ جیسے یہ کبھی حرکت میں ہی نہ تھی۔ اِس لیے یہ کسی اجتماعی کاروائی کے لیے دستیاب نہیں رہتی۔ اِس سارے مشاہدے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جس کو ہم ذہنی زندگی کہتے ہیں وہ خود ذہنی ڈھانچے اور جسمانی طور پر منظم انداز میں حرکت کرتی ہوئی توانائی سے جُڑی ہوئی ہے، لہٰذا یہ فرض کر لینا نہایت معقول ہوگا کہ ذہنی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے جب جسمانی موت واقع ہوتی ہے۔ یہ دلیل کئی اِمکانات میں سے صرف ایک اِمکان پر مبنی ہے۔ لیکن یہ اتنی ہی معقول ہے جتنی کہ دوسرے بے شمار سائنسی نقطہ نظر کی بنیاد پر قائم اخذ شدہ نتائج۔

بہت سے ایسے پہلو موجود ہیں جن کی بناء پر شاید اِس اخذ کردہ نتیجے کو تنقید کا نشانہ بنایا جائے، روحانی اور باطنی تحقیق کا دعویٰ ہے کہ بقا کے نظریئے کو سائنسی نقطہ نظر سے بظاہر درُست ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اِس قسم کی شہادت اتنی زبردست اور موثر ہوتی ہے کہ کوئی ایسا شخص جس کا مزاج سائنسی نقطہ نگاہ سے مطابقت رکھتا ہو مسترد نہیں کرسکتا۔ تاہم وہ وزن جو کسی شہادت سے وابستہ کیا جانا ہوتا ہے اُس کا انحصار لازمی طور پر بقا کے تصورات کے گذشتہ اِمکانیات پر ہونا چاہیے۔ ہمیشہ مختلف ملتے جلتے حقائق کے مجموعہ کی توجیہہ کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ اُن میں سے صرف اُس ایک کو ترجیح دینا ہوتی ہے جو ماضی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے پیشِ نظر سب سے زیادہ اِمکانی ہو۔ جن کا پہلے ہی یہ خیال ہوتا ہے کہ موت کے بعد بھی بقا ہے وہ تو روحانی صداقت کی اِس قسم کی وضاحت کو بہترین قرار دینے کے لیے تیار ہونگے۔ لیکن جو دیگر وجوہات کی بنا پر اِس کو فضول اور نامعقول قرار دینگے وہ کچھ اور قسم کی وضاحتوں کے متلاشی ہونگے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ روحانی تحقیق کے ذریعے بقا کے حق میں جو شہادت پیش کی جاتی ہے کے مقابلہ میں اِس کے برعکس فزیالوجی سے متعلق تحقیق سے اخذ شدہ شہادت کہیں زیادہ وزن رکھتی ہے مجھے اعتراف ہے کہ یہ آنے والے وقتوں میں کسی بھی لمحے مزید مضبوط ہوجائے گی کہ اُن حالات میں بقا پر یقین کرنا غیر سائنسی رویہ ہوگا۔

تاہم جسمانی طور پر موت کے بعد بقا لافانیت سے مختلف معاملہ ہے۔ شاید اِس کا ایک ہی مطلب ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ جسمانی موت کا التواء، لافانیت پر ایمان لانا فطری طور پر اِنسانی خواہش سے مطابقت

رکھتا ہے۔ لا فانیت کے پیرو کار فزیالوجیکل علم پر مبنی دلائل پر اِس بنیاد کے حوالے سے اعتراض اُٹھائیں گے کہ رُوح اور جسم مکمل طور پر الگ تھلگ ہیں اور یہ کہ رُوح کچھ اُس سے مختلف ہوتی ہے جس کا اظہار جسمانی اعضاء کے ذریعے ہوتا ہے جبکہ میں اِس کو تصورات کے اعتبار سے ضعیف الاعتقادی قرار دیتا ہوں۔ ایک مخصوص مقصد کے پیشِ نظر آسانی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ذہن اور مادے کو دو مختلف اِصلاحات فرض کر سکتے ہیں جبکہ یہ بذاتِ خود حتمی حقیقتیں نہیں ہیں۔ الیکٹرون اور پروٹون منطقی اعتبار سے فسانے ہیں۔ ہر ایک اصل میں ایک تاریخ ہے۔ ایک سلسلہ واقعات ہے۔ اِن میں سے کوئی بھی ایک مستقل وجود نہیں۔ رُوح کے نقطہ نظر سے اگر جائزہ لیا جائے تو اُس کی افزائش اور نشوونما کے حقائق سے ہی عیاں ہے۔ جسے بھی دورانِ حمل اور زچگی کے بارے میں تھوڑا بہت علم بھی ہے وہ تو اِس بات پر یقین ہی نہیں کر سکتا کہ رُوح بطور نا قابلِ تقسیم کامل شئے کے اِس سارے عمل میں جوں کی توں رہتی ہے۔ ظاہراً اِس کی نشوونما بھی جسم کے ساتھ ہوتی ہے مزید یہ کہ جسم اور رُوح دونوں مادہ حیات اور بیضہ سے حاصل ہوتے ہیں اِس لیے رُوح نا قابلِ تقسیم نہیں ہو سکتی۔ یہ مادیت نہیں ہے بلکہ یہ تو محض ایک طرح سے اعتراف ہے کہ ہر عمل ہی دلچسپ ہوتا ہے اصل میں یہ مادے کی اپنی تنظیم و ترتیب ہوتی ہے نہ کہ ابتدائے حیات۔

مابعد الطبعیات کے ماہرین رُوح کی لا فانیت کو لازم ثابت کرنے کے لیے بے شمار دلائل پیش کرتے ہیں۔ لیکن ایک سادہ سی پرکھ اُن سب دلائل کو مسمار کرنے کے لیے کافی ہے۔ وہ زور دے کر کہتے ہیں کہ ساری کائنات میں رُوح کا نفوذ ہے۔ لیکن جیسے کہ ہم موٹا ہونے کے مشتاق نہیں ہوتے جتنا کہ ہم شدت کے ساتھ طویل زندگی کے متمنی ہوتے ہیں۔ لیکن کسی بھی خیال پرست فلسفی نے اِس استدلال کے اطلاق پر کبھی توجہ نہیں دی۔ اِس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ اِنسان کی اپنی طبعی زندگی سے زیادہ طویل عرصہ تک زندہ رہنے کی خواہش اتنی حیران کن حد تک طاقتور ہوتی ہے کہ ایک اچھے خاصے سمجھ دار شخص کو بھی اس حد تک اندھا کر دیتی ہے کہ وہ آگے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھتا ہے ورنہ اس کے برعکس صورتِ حال میں اِس خواہش کی عدم موجودگی میں اُس پر اصل صورتِ حال یکدم واضح ہو جائے۔ اگر ہم موت سے خوف زدہ نہ ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ لا فانیت کا خیال سرے سے سر ہی نہ اُٹھاتا۔

خوف مذہبی عقیدے کی بنیاد ہے اور اِس کی جڑیں اِنسان کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ خوف کو ہماری انفرادی اور اجتماعی سماجی زندگی پر بے پناہ اثر و رسوخ حاصل ہے۔ لیکن یہ قدرت ہی ہے جس کا خوف مذہب کو بڑھاوا دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم مشاہدہ کر چکے ہیں کہ مادہ اور ذہن کا آپس کا تضاد محض واہمہ پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی تضاد موجود ہے جو اِس سے بھی اہم ہے۔ وہ یہ کہ جو اُن چیزوں کے درمیان جن پر ہماری خواہشات اثر انداز ہوتی ہیں اور اُن چیزوں کے درمیان جن پر

ہماری خواہشات بہت زیادہ اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اِن دونوں کے درمیان یہ لکیر اتنی واضع ہوتی ہے اور نہ ہی نا قابلِ تغیر۔ جُوں جُوں سائنس ترقی کرتی ہے زیادہ سے زیادہ چیزیں انسان کے قابو میں آتی چلی جاتی ہیں۔ تاہم بے شُمار چیزیں قابو سے باہر رہتی ہیں۔ اِن میں خود اِس دُنیا کے بڑے بڑے حقائق ہیں اور اِن میں وہ حقائق بھی شامل ہیں جن کا تعلق اُس علم سے ہے جو ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں سے ہے۔ یہ صرف وہ حقائق ہیں جو ہماری زمین کی سطح پر یا اُس کے اِتنے قریب ہیں کہ جن کو ہم کسی حد تک اِس طرح ڈھال لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو ہماری خواہشات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ حتیٰ کہ خود اِس زمین کی سطح پر بھی ہمارے اِختیارات بے حد محدود ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم موت سے بچ نہیں سکتے گو کہ اکثر ہم اِس کو کُچھ دیر کے لیے ٹال سکتے ہیں۔

مذہب کوشش کرتا ہے کہ اِس تضاد پر قابو پایا جا سکے۔ اگر یہ دُنیا خدا کے قبضہ اور کنٹرول میں ہے اور ہم خدا پر اپنی دعاؤں سے اثر انداز ہو سکتے ہیں تو پھر ہم قدرت کاملہ میں شراکت دار ہو جاتے ہیں ماضی میں دعاؤں کے جواب میں معجزات بر پا ہوتے رہے ہیں۔ کیتھولِک چرچ کے مکتبہ فکر میں اب بھی ہوتے ہیں لیکن پروٹسٹنٹ یہ اِختیار کھو چکے ہیں۔ تاہم معجزات کے بغیر بھی گزر بسر ممکن ہے۔ کیونکہ قدرت کی طرف سے یہ فرمان جاری ہو چکا ہے کہ اس کائنات میں جو قدرتی قوانین کار فرما ہیں اُن کا اِنسان کے حق میں بہترین نتائج فراہم کرنا اٹل ہے یوں خدا پر ایمان اب بھی اِس کام آرہا ہے کہ کسی طرح یہ دُنیا اُسی طرح نظر آئے کہ جیسے یہ اِنسان کی بہت بڑی ہمدرد ہے اور لوگوں کو یہ احساس دلائے کہ فزیکل قوانین اُس کے دوست اور مددگار ہیں بالکل اسی طرح لا فانیت موت کی دہشت کو خارج کرنے میں مددگار ہوتی ہے۔ جن لوگوں کا ایمان یہ ہے کہ مرنے کے بعد اُنہیں ایک دائمی خوشی کا حصول ہوگا اُن سے شائد توقع ہو سکتی ہے کہ اُنہیں موت سے ڈر نہ لگتا ہو۔ لیکن خوش قسمتی سے ڈاکٹر حضرات کا یہی کہنا ہے کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ یہ کسی حد تک لوگوں کے خوف کو قدرے کم کرتا ہے۔ لیکن اُس کو مکمل طور پر ختم نہیں کر سکتا۔

چونکہ دہشت مذہب کا سرچشمہ ہے اِس لیے اِس نے کئی طرح کی خوف کی علامتوں کو تقدس بخش رکھا ہے اور لوگوں کو باور کرایا ہے کہ وہ خوف کسی طرح بھی شرمناک یا قابلِ ملامت نہیں اور یوں اِس نے اِنسانیت کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ جبکہ کسی بھی قسم کا خوف قابلِ مذمت ہے۔ میرا ایمان ہے کہ جب میں نے مرنا ہے تو اُس کے ساتھ ہی گلنا سڑنا ہے۔ میری کسی قسم کی کوئی بقاء نہ ہوگی۔ میں تو جوان نہیں ہوں البتہ مجھے زندگی سے بے حد پیار ہے۔ لیکن یہ کہ میرا خاتمہ ہو جائیگا اِس خوف میں مبتلاء ہو کر کانپتا رہوں ایسے خیال ہی سے نفرت کرتا ہوں۔ خوشی اسی لیے حقیقی خوشی ہوتی ہے کیونکہ آخر کار اِس کا ایک انجام ہوتا ہے اور نہ ہی

خیال اور محبتیں اپنی قدر کھوتے ہیں کیونکہ یہ دائمی نہیں ہوتے بے شمار لوگ پھانسی کے چبوترے پر بڑے فخریہ انداز میں چڑھتے رہے اور یقینی طور پر وہی فخر کا عنصر انسان کی اِس دُنیا میں جگہ متعین کرتے ہوئے ہمارے نقطہ نگاہ کے نئے مشعل راہ ہونا چاہیئے ہوسکتا ہے کہ سائنس کی کھلی کھڑکیوں سے چلنے والی خوشگوار ہوا اپنی شروعات میں روایتی مذہبی قصوں اور کہانیوں میں بیان کی گئی نوعِ انسانی کے لیے بظاہر دِل لبھانے والی دُنیا کے مقابلے میں قدرے ڈراوَنی نظر آئے۔ بالآخر وہاں سے آنے والے تازہ ہوا کے جھونکوں سے پیدا شدہ ہمت، شجاعت اور وسعتِ نظر کی اپنی ہی ایک شان وشوکت ہوگی۔

فطرت کا فلسفہ ایک چیز ہے جبکہ قدر کا فلسفہ اس سے بالکل مختلف دوسری شئے ہے ضرر رسانی کے علاوہ کوئی عنصر بھی اِن دونوں کے درمیان اُلجھن پیدا نہیں کرسکتا۔ ہم جسے اچھا سمجھتے ہیں یا ہمیں کیا پسند ہونا چاہیے کسی بھی قسم کا کسی بھی قسم پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ یوں یہ سوال فطرت کے فلسفے سے جڑا ہوا ہے اور دوسری طرف ہمیں اُن باتوں سے منع نہیں کیا جاسکتا کہ ہم فلاں فلاں باتوں کو محض اِس لیے اہمیت نہ دیں کیونکہ غیر انسانی دُنیا اِس کو اہمیت نہیں دیتی اور نہ ہی ہمیں اِس امر پر مجبور کیا جاسکتا ہے کہ ہم کسی چیز کی اِس لیے تعریف کریں کیونکہ یہ ایک قدرت کا قانون ہے بلاشبہ ہم قدرت کا حصہ ہیں جس نے ہماری خواہشات، امیدوں اور خوف کو اُن قدرتی قوانین کے تحت جنم دیا جنہیں اب فزکس کے ماہرین نے دریافت کرنا شروع کردیا ہے۔ اِس سے لحاظ سے ہم قدرت کا حصہ ہیں بلکہ اِس کے ماتحت ہو گئے ہیں۔ اِس طرح ہم بذاتِ خود قدرتی قوانین کا نتیجہ بھی ہیں اور ساتھ ہی اس کا شکار بھی ہیں۔

لازم ہے کہ قدرت کے فلسفے کو غیر ضروری طور پر اِس میں بسنے والوں سے نہ جوڑا جائے کیونکہ کرۂ زمین کہکشاں میں ایک نہایت چھوٹے سے ستارے کا محض ایک ننھا سا سیارہ ہے۔ اِس میں قدرت کے فلسفے کو محض اِس پیرائے میں پیش کیا جانا کہ جن سے ایسے نتائج مرتب ہوں جن سے اِس ننھی سی دھرتی کی حقیری مخلوق کو خوش کرنا مقصود ہو بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اِس سلسلے میں اِرتقاء اور ناگزیریت کے فلسفوں سے پتہ چلتا ہے کہ اِس میں مناسبت کے اعتبار سے کتنا ادراک اور منطقی اعتبار ہے اِس معاملے سے کتنا مربوط ہے۔ وہ زندگی کے حقائق کو جو صرف ہماری دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں اِس دھرتی سے جوڑ کر ایک محدود سی اہمیت دینے کے بجائے بڑھ چڑھ کر آفاقی سطح کی اہمیت دیتے ہیں۔ رجائیت پسند اور یاسیت پسندی بطور آفاقی فلسفوں کے اِسی طرح بھولے پن پر مبنی سادگی سے اِنسان دوستی پر مبنی نقطہ نظر پیش کرتے ہیں۔ یہ دُنیا جس کی وسعتوں کو قدرت کے فلسفے کے ذریعے جہاں تک ہم جان پائے ہیں بُری ہے نہ اچھی۔ اِس کا اِس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ آیا ہم خوش ہیں یا غمزدہ ایسے تمام فلسفے ذات کے خول سے پھوٹتے ہیں اور اُنکو ستاروں سے متعلق ننھا سا علم درست کرتا رہتا ہے۔

لیکن قدر کے فلسفے میں صورتِ حال اِس کے برعکس ہے۔ قدرت تو ہمارا اتنا ہی حصہ ہے جتنا کے ہم اِسے اپنے تصور کے ذریعے ہی سے جان سکتے ہیں۔ ہر اُس شئے کا چاہے وہ حقیقت میں ہو یا وہ جس کا ہم تصور کرتے ہیں کا جائزہ لے سکتے ہیں اور کوئی بھی بیرونی معیار دستیاب نہیں جس کی بنیاد پر اپنے جائزے کو غلط قرار دیں۔ لہٰذا ہم خود ہی ہر جائزے کے حتمی طور پر ثالث بن کر اس کا تعین کرتے ہیں کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح اور اس قدر والی دُنیا میں قدرت محض ایک حصہ ہے۔ خود قدرت رویئے کے اعتبار سے غیر جانبدار ہے۔ اچھی ہے نہ بُری تعریف کی مستحق ہے نہ ملامت کی یوں ہم قدرت سے کہیں زیادہ عظیم ہیں۔ یہ ہم ہی ہیں جو قدر تخلیق کرتے ہیں اور ہماری خواہشیں اِس دُنیا کو قدریں عطا کرتی ہیں۔ اِس راج دھانی میں ہم خود ہی فرمانروا ہیں اور ہم اُس وقت اپنی فرمانروائی کو خاک میں ملا دیتے ہیں جب ہم قدرت کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ اب اچھی زندگی کا تعین کرنا ہماری ذمہ داری ہے جو صرف ہمارے اپنے لیے ہو نہ کہ قدرت کے لیے بلکہ اُس قدرت کے لیے بھی نہیں ہونی چاہیے جس کو ہم خدا کی صورت میں تجسیم عطا کرتے ہیں۔

اچھی اور صاف ستھری زندگی

مختلف اوقات میں لوگوں کے درمیان اچھی اور صاف ستھری زندگی کے بارے میں مختلف خیالات و تصورات پائے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ کسی حد تک دلائل وزن کے حوالے سے قابلِ قبول بھی ہوتے ہیں کُچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جیل جرائم روکنے کا اچھا طریقہ ہے۔ کُچھ کا خیال ہوتا ہے کہ اِس سلسلے میں تعلیم بہتر کردار ادا کر سکتی ہے۔ ایسے اختلافات کے فیصلے حسبِ ضرورت گواہیوں اور شہادتوں کی مدد سے طے ہو جاتے ہیں۔ لیکن کُچھ اختلافات کی اِس طریقے سے آزمائش ممکن نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر ٹالسٹائی نے ہر قسم کی جنگوں کی مذمت کی ہے۔ جبکہ بہت سے دوسرے لوگ ایک سپاہی کو جو حق کی خاطر جنگ لڑ رہا ہو عظیم قرار دیتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں مقصد کے حصول کی خاطر استعمال کیے جانے والے ذرائع پر اختلافات کا اِمکان ہوتا ہے۔ وہ جو سپاہی کی تعریف کرتے ہیں عام طور پر گنہگار کے لیے سزا کو اچھا جانتے ہیں جبکہ ٹالسٹائی اس طرح نہیں سوچتا تھا۔ ایسے معاملات میں کوئی بھی دلیل ممکن نہیں ہوتی۔ اس لیے میں یہ نہیں ثابت کر سکتا کہ میرے ہی خیالات سو فیصد درست ہیں میں تو صرف اپنے خیالات ہی اِس اُمید پر بیان کر سکتا ہوں کہ میرے ساتھ زیادہ سے زیادہ لوگ اِتفاق کریں گے۔ میرے خیالات مندرجہ ذیل ہیں۔

''اچھی زندگی وہی ہوگی جو محبت سے بھرپور ہونے کے علاوہ علم و دانش سے مزین ہو۔''

علم اور محبت دونوں میں بے پناہ وسعتیں پائی جاتیں ہیں اور زندگی میں جہاں اِن کا اِمتزاج ہو وہاں زندگی کتنی سہانی اور قابلِ رشک ہوسکتی ہے اِس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے محبت کے بغیر علم ایک اچھی زندگی کی تشکیل نہیں کرسکتا اور نہ ہی علم کے بغیر محبت ایسا کر سکتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں ایک دفعہ کسی ملک میں بے حد خطرناک بیماری پھیل گئی چُنانچہ اُس وقت کے برگزیدہ لوگوں نے اپیل کی کہ چرچ میں اکٹھے ہوکر اُس بیماری سے نجات کے لیے دعا کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں دعا کی غرض سے آئے ہوئے ہجوم میں وہی بیماری اِس تیزی سے پھیلی کہ اُس کی مثال نہیں مِلتی ۔، یہ علم کے بغیر محبت کی ایک عمدہ مثال ہے۔ جنگ عظیم بذاتِ خود محبت کے بغیر علم کی تازہ مثال ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ دونوں کا نتیجہ وسیع پیمانے پر اِنسانی موت کی صورت میں نکلا۔ اگرچہ محبت اور علم دونوں ضروری ہیں۔ لیکن ایک خاص نقطہ نظر سے محبت زیادہ بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ کیونکہ اسی کے ذریعے ذہین لوگ علم کی طرف متوجہ ہونگے تاکہ وہ اپنے پیاروں کو علم کی بدولت کسی نہ کسی طرح فیض یاب کرسکیں۔ لیکن اگر وہ ذہین نہ ہونگے تو پھر وہ اُنہیں دقیانوسی عقائد پر ڈٹے رہیں گے جو اُنہیں پڑھائے یا سکھائے جاتے ہیں۔ یوں وہ اپنی تمام تر نیک خواہشات کے باوجود معاشرے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتے چلے جائیں گے۔ میرے نزدیک دوائیاں اِس سلسلے میں بہترین مثال پیش کرتی ہیں۔ ایک ماہر ڈاکٹر مریض کے لیے اُس کے جگری دوست سے زیادہ کارآمد ہوتا ہے۔ طبی علم میں ترقی کسی معاشرے میں جہالت پر مبنی اِنسان دوستی سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ تاہم سخاوت اور خیر خواہی کا جذبہ ہونا بھی ضروری ہے چاہے اِس سلسلے میں جدید دور کی دریافتوں کے ذریعے اُمراء مالی فوائد ہی کیوں نہ حاصل کررہے ہوں۔

محبت ایک ایسا لفظ ہے جو بہت سے احساسات کا احاطہ کرتا ہے۔ میں نے اِس لفظ کو جان بوجھ کر اِس لیے استعمال کیا ہے تاکہ میں اُن سب احساسات کو شامل کرسکوں۔ اصولی طور پر یہ لفظ میرے نزدیک مناسب دکھائی نہیں دیتا۔ دراصل یہ دو اِنتہاؤں کے درمیان حرکت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف خیال کے اعتبار سے خالصتاً فرحت کا احساس ہوتا ہے اور دوسری طرف خالصتاً فیض رسانی جب اِس کا تعلق کسی بے جان سے جڑتا ہو، تب صرف فرحت کا عنصر داخل ہوتا ہے۔ ہم قدرتی مناظر یا موسیقی سے فیض رسانی کا احساس نہیں کرسکتے اِس قسم کا لُطف غالباً فن کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ یہ احساس اصولی طور پر بچوں میں بڑوں کی نسبت زیادہ مضبوط ہوتا ہے جو چیزوں کو اُن کی افادیت کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن جب محض سادگی سے جمالیاتی ذوق کے پہلو سے غوروفکر کیا جائے تو یہ ہماری زندگی میں اِنسانوں کی طرف احساسات کے حوالے سے بہت اہم کردار ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جن میں سے کُچھ کے لیے تو جاذبیت ہوتی ہے اور کُچھ کے معاملے میں اس کے برعکس بشرطیکہ چیزوں کو بڑی سادگی سے جمالیاتی تخیل

کے حوالے سے دیکھا جائے۔

اس کی دوسری مخالف سمت میں اِنتہا خالصتاً فیض رسانی کا احساس ہوتا ہے بے شُمار لوگوں نے کوڑھ کے مریضوں کی مدد کرتے ہوئے اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ اِس سلسلے میں وہ جس طرح کی محبت محسوس کرتے ہیں اُس میں جمالیاتی ذوق سے متعلق کسی قسم کا احساس شامل نہیں ہوتا۔ والدین کی محبت کے احساسات بچے کی ایک جھلک دیکھنے سے حاصل شدہ لطف سے وابستہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر یہ عنصر موجود نہ بھی ہو تب بھی یہ احساس جوں کا توں مضبوط رہتا ہے۔ کسی ماں کی اپنے بیمار بچے میں دلچسپی کو فیض رسانی قرار دینا بڑا عجیب معلوم ہوگا کیونکہ مردانی جذبات کے اظہار کے لیے اِس لفظ کو گمراہ کن انداز میں بے تحاشہ استعمال کرنا ہماری عادت ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص کی فلاح و بہبود کی خواہش کے اظہار کے لیے کوئی دوسرا لفظ نہیں ملتا۔ جہاں تک والدین کا تعلق ہے یہ ایک حقیقت ہے اِس قسم کی خواہش کسی بھی حد تک شدت اِختیار کر سکتی ہے۔ لیکن دوسری حالتوں میں اس کی شدت کم بھی ہو سکتی ہے۔ حقیقتاً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایثار و محبت کے جذبات کی نوعیت ممتا کی محبت کے جام سے چھلکے ہوئے شہد کی سی ہوتی ہے یا بعض اوقات اسی کی ایک اعلیٰ وارفع شکل ہوتی ہے۔ لیکن یہاں میں یہ بات صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ میں صرف ایک جذبے کا ذکر کر رہا ہوں نہ کہ کسی اصول کا اور یہ کہ نہ میں اس میں کسی قسم کے احساس برتری کو جیسا کہ بعض اوقات اِس لفظ کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے شامل کرتا ہوں۔ لفظ ''ہمدردی'' کا اظہار بھی ایک حصہ ہے۔ جو میرے مطلب کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس پر کاربند ہونے کی سرگرمی کو خارج کر دیا جائے۔ حالانکہ میری خواہش ہے کہ وہ بھی شامل ہو۔

محبت اپنے بھرپور معنوں میں دو عناصر یعنی فرحت اور نیک خواہشات کا ناقابلِ تنسیخ امتزاج ہے۔ ایک خوبصورت بچے کی کامیابی پر والدین کی مسرت اور طمانیت میں یہ دونوں عناصر شامل ہوتے ہیں اور جب جنس بھی اپنی انتہا پر ہوتی ہے تو اُس میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیکن جنسی محبت میں فیض رسانی کا جذبہ صرف اُسی صورت میں موجود ہوگا جہاں احساسِ ملکیت پختہ ہوگا۔ ایسی صورت میں تصور کے حوالے سے کچھ زیادہ ہی لطف آور ہو سکتا ہے جبکہ اس کے برعکس حسد و کینہ اس کو تباہ کر دے گا۔ فرحت نیک خواہشات کے بغیر ظالمانہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ نیک خواہشات فرحت کے بغیر آسانی سے سرد مہری اور پستی کی طرف مائل ہو سکتی ہے۔ شدید جسمانی کمزوری جیسے کہ شیرخوارگی یا شدید بیماری کی حالت کے سوا ہر وہ شخص جو چاہتا ہے اُس سے محبت کی جائے تو وہ یہ بھی چاہے گا کہ اس کے چاہنے والے میں ایسی چاہت ہو جس میں مذکورہ بالا دونوں عناصر ہوں۔ اس حالت میں فیض رسانی کا عنصر بھرپور طریقے سے عین خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اُن حالات میں جن میں قوت اور طاقت کا عنصر شامل ہوتا ہے وہاں

فیض رسانی کے جذبے کے مقابلے میں تعریف زیادہ قابل قبول ہوتی ہے۔ یہ ذہن کی ایسی صورت حال ہوتی ہے جس میں رنگینیوں اور رعنائیوں کے حوالے سے ناموری اور حکمرانی کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کی نیک خواہشات اُتنی ہی نسبت سے ہوں جس طرح ہم خود بوقت ضرورت ان کی مدد کے لیے تیار ہوتے ہیں یا اُن سے کسی خطرناک صورت حال میں ان کی مدد کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اس سے کم از کم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی نہ کسی پہلو سے حیاتیاتی منطق سے مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن زندگی کے حوالے سے یہ قطعی طور پر غلط ہے ہمیں لگن اور چاہت کی آرزو محض اس لیے ہوتی ہے تاکہ ہم کسی طرح تنہائی کے احساس سے چھٹکارا پا سکیں حالانکہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض وقت گزاری ہوگی۔ یہ معاملہ تو ہمدردی کا ہے نہ کہ محض فیض رسانی کا۔ جس شخص کی طرف سے چاہ اور لگن کا اظہار ہو رہا ہو ضروری نہیں وہ ہمارے لیے اطمینان بخش بھی ہو کیونکہ اس کا امکان ہے کہ وہ ہمارے لیے نیک خواہشات نہ رکھتا ہو۔ لیکن ہماری خوشی کس پر مشتمل ہے اس کا جاننا ضروری ہے۔ چُنانچہ اچھی زندگی کے لیے ایک دوسرے عنصر کی ضرورت ہوتی ہے جسے علم کہتے ہیں۔

ہر لحاظ سے کسی کامل دُنیا میں ہر ذی حس کے لیے دوسرا ذی حس بھرپور محبت، فرحت، فیض رسانی، اتفاق و ہم آہنگی کے مرکب کا مرکزِ نگاہ ہوتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم اس حقیقت کی دنیا میں ہر اس ذی حِس کے لیے اسی قسم کے احساسات رکھیں جس سے ہمارا واسطہ پڑے۔ بے شمار لوگ موجود ہیں جن سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوتی بلکہ اُلٹا بیزار ہوتے ہیں اور اگر ہم فطرت کے ساتھ تھوڑی بہت زیادتی کرتے ہوئے اُن چیزوں کے اندر رنگینیاں اور رعنائیاں تلاش کرنے کی کوشش کریں جنہیں ہم خوبصورت سمجھتے ہیں۔ تب اُن کی حقیقت بے نقاب ہونے پر ہماری جمالیاتی حِس مجروح ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور پھر انسان تو کجا یہاں تو پسو، کھٹمل اور جوئیں تک موجود ہیں جن میں کسی قسم کے حسن کا تصور کرنے سے پہلے ہمیں قدیم ملاحوں کی طرح سخت جان اور سخت کوش ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کچھ اولیاء نے اِنکو خدا کے "ہیرے اور موتی" قرار دیا تاہم اُنہوں نے بھی ان میں خوشی یا مسرت کی نشاندہی کرنے کے بجائے اُلٹا ایسا موقع غنیمت جانا کہ خود کی پاکیزگی اور تقدس کی نمائش کرنے لگے۔

فیض رسانی کے احساس کو کافی آگے بڑھانا زیادہ آسان ہے لیکن اس کی بھی کچھ حدود ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی خاتون سے شادی کرنا چاہتا ہے اور جب اُسے بعد میں معلوم ہو کہ کوئی دوسرا بھی اُس سے شادی کا خواہشمند ہے تو وہ اُس کے حق میں شادی کے ارادے سے دستبردار ہونا بہتر سمجھتا ہے تو یہ خلاف معمول نہیں ہوتا۔ بلکہ ہم اِس سلسلے میں سماج کو ہر ایک کے لیے بے رُو رعایت مساوی مواقع ہونے کے ناطے سے مقابلے کے لیے کھلا میدان قرار دیتے ہیں۔ تاہم اُس شخص کے اپنے رقیب کی طرف احساسات

پوری طرح فیض رسانی کے زمرے میں نہیں آتے۔ میرا خیال ہے اچھی زندگی کی بھرپور تصویر کشی کے لیے ہمیں لازمی طور پر حیوانی جبلت اور اس کی فطری قوت کو خاص بنیادیں فرض کرنا ہونگی کیونکہ اس کے بغیر زندگی انتہائی بے کیف اور غیر دلچسپ ہو جائے گی۔ تہذیب کچھ اس قسم کی ہونی چاہیے کہ وہ کچھ اس میں اضافہ کرے نہ کہ کوئی متبادل فراہم کرے۔ زاہد اور درویش ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے دانا و بینا لوگ جو سماج سے کٹ کر رہتے ہیں یہ سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں کہ اِنسان کی بطور اِنسان کس طرح تکمیل ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے اُن میں سے کچھ لوگ سماج کو سنورنے میں مدد کا باعث ہوں۔ لیکن اگر ساری دُنیا اُن جیسی ہوجائے تو یوں جانیئے کہ اِس دنیا کا خاتمہ اِنتہائی درجے کی بوریت سے ہی ہوجائے گا۔

ان نقاط پر غور وفکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ فرحت و مسرت کا عنصر بہترین محبت کا اہم جزو ہے۔ اس حقیقی دنیا میں فرحت بڑے محدود معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ہم ایسے ہی احساسات پوری اِنسانیت کے لیے محسوس نہیں کر سکتے۔ جب فرحت اور فیض رسانی کے احساسات کے درمیان کسی قسم کا تذبذب یا کھینچا تانی آ جائے تو اصولی طور پر فیصلہ بین بین ہونا چاہیے یہ نہ ہو کہ ایک کا تو مکمل طور پر انتخاب کر لیا جائے جبکہ دوسرے کو سرے سے ہی نظر انداز کر دیا جائے۔ نیز جبلت بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہے اس کے بھی بڑے حقوق ہیں اگر ہم ان کو کسی خاص حد سے زیادہ نظر انداز کرتے رہیں تو وہ بھی بڑے ہی غیر محسوس اور نازک انداز سے انتقام پر اُتر آئے گی۔ اس لیے ایک حسین اور اچھی زندگی کے حصول کے پیشِ نظر اِنسانی اِمکانات کی حدود کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ یہاں سے اب علم کی ضرورت کی طرف دوبارہ واپس چلتے ہیں۔

جب میں علم کو بطور حسین زندگی کے جزو کا ذکر کرتا ہوں تو اس سے میری مرادِ علم الاخلاق نہیں ہوتا بلکہ ایسا علم جو سائنسی نقطہ نظر پر مبنی ہو اور وہ علم جس میں متعلقہ مخصوص حقائق ہوں۔ بڑے کڑے اور کھرے انداز میں بیان کروں تو میرا نہیں خیال کہ کوئی ایسی چیز دنیا میں موجود ہے جسے علم الاخلاق کہتے ہیں۔ اگر ہم کسی مقصد کو حاصل کرنے کی خواہش کریں تو علم ہمیں اُنکے حصول کے ذرائع کی نشاندہی کرتا ہے تب ہوسکتا ہے کہ یہ علم نہایت مبہم انداز سے اِخلاقیات کے قریب سے گذر جائے اور یہ کہ کونسا رویہ غلط اور کونسا صحیح ہے اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے سوائے اُس صورتِ حال میں جب اُس کے اِمکانی نتائج ہمارے سامنے موجود ہوں۔ اگر ہمارے سامنے کسی مقصد کا حصول ہو تو سوال سائنس سے متعلق ہوتا ہے۔ سائنس کا کام ایسا ذریعہ دریافت کرنا ہوتا ہے جس سے اُس مقصد کو حاصل کیا جا سکے۔ مزید یہ کہ تمام اِخلاقی اصولوں کو اِس کسوٹی پر پرکھا جانا چاہیے کہ آیا وہ ہمارے مقاصد کے حصول میں مددگار ہوتے ہیں یا نہیں۔ میں یہاں جب مقاصد کا ذکر کرتا ہوں تو اُن سے مراد وہ مقاصد ہوتے ہیں جو ہمیں مطلوب ہوتے ہیں نہ کہ وہ

جن کا ہمیں شدت سے طالب ہوتا چاہیے۔ ہمیں شدت سے کیا خواہش کرنی چاہیے محض وہ ہوتی ہے جو دوسرے ہم سے توقع کرتے ہیں کہ ہم ایسا چاہیں۔ عام طور پر مختلف جگہوں میں طرح طرح کی حاکمیتیں قائم ہیں جو چاہتی ہیں کہ ہم اُن کی خواہشات کے مطابق چاہیں۔ میرا مطلب والدین، سکول ماسٹر، پولیس کا سپاہی اور جج حضرات وغیرہ۔ جب آپ کہتے ہیں کہ آپ کو فلاں فلاں کام ضرور کرنا چاہیے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ کے بیان کی پشت پر ایسی قوت موجود ہے جو میری خواہش کو آپ کی منظوری یا نامنظوری اِس حد تک محتاج کر سکتی ہے جس سے ممکنہ طور پر سزا اور انعام کا انحصار آپ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی سے وابستہ ہو۔ چونکہ خواہش تمام رویوں کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ تو پھر صاف ظاہر ہے کہ اِخلاقی تصورات کوئی معنی نہیں رکھتے سوائے اُس صورتِ حال کے جب وہ خود خواہش پر اثر انداز ہوں وہ ایسا منظوری کی خواہش اور نامنظوری کے خوف کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہ سماج کی انتہائی طاقتور قوتیں ہیں لہٰذا ہم اگر کوئی سماجی مقصد حاصل کرنا چاہیں تو ہم فطری طور پر اُن قوتوں کو اپنے حق میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ کس رویئے کی اِخلاقیات کو اُس کے ممکنہ نتائج کے پیشِ نظر جانچنا ہوتا ہے تو اس سے میری مراد یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اُس پسندیدگی کا جائزہ بھی لیا جائے جو اس خاص رویئے کے بارے میں ہمارے مطلوبہ مقصد کی اِمکانی تکمیل کے لیے اِختیار کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ اُس ناپسندیدگی کو بھی دیکھا جائے جو رویہ اُس کے برعکس ہوتا ہے۔ بہر حال بہت سے دقیانوسی قسم کے لگے بندھے اصول موجود ہیں جن کے مطابق پسندیدگی اور ناپسندیدگی اور اُنکے ساتھ سزا اور جزا کی وابستگی کے حوالے سے اُنکے نتائج سے قطع نظر جانچا جاتا ہے۔ اس وقت تو اِس کا جائزہ لینا ممکن نہیں لیکن یہ ایک ایسا موضوع ہے جسکا ذکر کہیں آگے چل کر کیا جائے گا۔

نظریاتی اِخلاقیات کی سطحیت سادہ سے معاملات میں ہی واضح ہو جاتی ہے۔ فرض کریں آپ کا بچہ بیمار ہے۔ اُس کے علاج کی خواہش کرنا محبت کا تقاضہ ہے۔ سائنس آپ کو آگاہ کرتی ہے کہ ایسا کیونکر کیا جائے۔ یہاں غور طلب نقطہ یہ ہے کہ بچے کے علاج کی خواہش اور اُس کے علاج کے طریقے سے آگاہی کے درمیان کوئی بھی ایسا مرحلہ نہیں آتا جہاں پر اِخلاقیات کا دخل ہو کیونکہ "آپ کے بچے کا علاج ہونا چاہیے" کہنے کی نہ نوبت آتی ہے اور نہ ہی کہنے کی گنجائش رہتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا عمل براہ راست مقصد کے حصول کی خواہش اور اُس کی تکمیل سے متعلق ذریعے کے بارے میں علم سے پھُوٹتا ہے۔ غرض تمام اعمال اس سے قطع نظر وہ اچھے ہیں یا بُرے کی نوعیت عین اسی طرح کی ہوتی ہے البتہ مقاصد مختلف ہوتے ہیں اور اُنکے حصول کے ذرائع کے بارے میں علم بھی کہیں کم اور کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن کوئی ایسا قابلِ تصور طریقہ موجود نہیں جس سے لوگوں کو باور کرایا جاسکے کہ وہ کوئی ایسا عمل کریں جو وہ کرنا

نہیں چاہتے۔ البتہ جو چیز ممکن ہے وہ یہ کہ سزا اور جزا کا ایسا نظام تخلیق کیا جائے جس سے اُن کی خواہشات ہی کو تبدیل کیا جا سکے جن میں سماجی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی کوئی اہمیت نہ رہے اس لیے اِخلاقی قوانین کے سامنے یہ سوال کھڑا ہو جاتا ہے کہ سزاؤں اور جزاؤں کا نظام کس طرح ترتیب دیں تاکہ قانون سازی کے مجاز حکام زیادہ سے زیادہ وہ سب کچھ حاصل کر سکیں جو اُنکو مطلوب ہو۔ اگر میں قانون سازی کے مجاز حکام کی خواہشات کو بُرا قرار دوں تو اس سے میری مراد محض یہ ہوتی ہے کہ اُن کی خواہشات سماج کے اُس حصے کی خواہشات سے متصادم ہیں جس سے میرا تعلق ہے اور یہ بات طے ہے کہ اِنسانی خواہشات کی حدود سے باہر کسی اِخلاقی معیار کا وجود نہیں ہوتا۔

یوں جو چیز اِخلاق کو سائنس سے الگ کرتی ہے وہ کسی خاص قسم کا علم نہیں ہوتا بلکہ وہ تو محض خواہش ہوتی ہے۔ اِخلاق میں جو علم درکار ہوتا ہے وہ عین وہی ہوتا ہے جس کی کہیں بھی ضرورت ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں انوکھی بات یہ ہے کہ کچھ خاص مقاصد کے حصول کی خواہش کے سلسلے میں درست رویہ وہی ہے جو اُن خواہشات کی تکمیل کا باعث بنے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر درست رویئے سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ دور دور تک مرغوب بنانا ہو تو اس کے مقاصد بھی ایسے ہونے چاہیں کہ اِنسانیت کا ایک بڑا حصہ اس کی خواہش بھی کرے۔ میں جو رویہ میری اپنی آمدنی میں اضافہ کرے اُسے ہی درست قرار دوں تو کوئی بھی قاری مجھ سے اتفاق نہیں کرے گا۔ کسی بھی اِخلاقی دلیل کی مکمل اثر پذیری سائنسی اندازِ فکر میں پنہاں ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک قسم کا رویہ دوسرے کے مقابلے میں مقصد کے حصول کے ذریعے کے اعتبار سے زیادہ مفید ثابت ہو مزید یہ کہ دور تک قابلِ رشک ستائش بھی ہو۔ تاہم میں اِخلاقی تعلیم اور اِخلاقی دلیل میں فرق کرتا ہوں۔ اوّل الذکر کچھ مخصوص خواہشات کو مضبوط دوسری کو کمزور کرتا ہے۔ یہ ایک بالکل مختلف قسم کا عمل ہے جس پر الگ سے کہیں بعد میں زیرِ بحث آئے گا۔

ہم اب اچھی اور حسین زندگی کے مفہوم کی وضاحت زیادہ بہتر انداز میں کر سکتے ہیں جیسے کہ میں نے اس باب کے آغاز میں کہا تھا کہ علم کی امامت میں محبت سے مزین زندگی ہی اچھی اور حسین زندگی ہوتی ہے۔ جب میں نے یہ کہا تھا تو اُس وقت مجھے اسی خواہش نے اُکسایا تھا کہ میں جس طرح بھی ممکن ہو اسی سلیقے سے زندگی گزاروں اور یہ کہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی ایسے ہی انداز میں زندگی گزارتے ہوئے دیکھوں۔ میرے اس بیان کی منطقی نوعیت ہی ایسی ہے کہ کسی سوسائٹی میں لوگ جب اس انداز میں رہیں گے تو اس میں مقابلتاً کہیں زیادہ خواہشات کی تکمیل ہو پائے گی نسبتاً جہاں کم محبت اور کم علم ہوگا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ایسی زندگی ''پارسائی'' کی ہوتی ہے جبکہ اس کے برعکس ''گناہ آلود'' جبکہ میرے نزدیک یہ ایسے فلسفے ہیں جن کا کوئی جواز نہیں۔

اِخلاقی اُصول

اِخلاق کی عملاً ضرورت مختلف خواہشات کے درمیان تصادم کی صورت میں نمودار ہوتی ہے یہ متضاد خواہشات مختلف لوگوں کی بھی ہو سکتی ہیں یا ایک ہی شخص کی مختلف اوقات میں ہی نہیں بلکہ بیک وقت بھی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک شخص رات کو شراب بھی پیتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ اگلی صبح کام کرنے کے لیے تروتازہ بھی رہے۔ اگر وہ تھوڑی سی پی لیتا ہے تاکہ وہ پوری طرح نہ سہی کم از کم کسی حد تک اطمینان بخش طریقے سے اپنی خواہش کی تکمیل کر سکے تو ہم ایسے شخص کو بد اِخلاق قرار دینگے۔ ہم اُنکو بھی بری نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنی عام زندگی میں فضول خرچی کرتے ہیں اور جلد باز قسم کے ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ سوائے اپنے کسی کے لیے کسی بھی قسم کی ضرر کا باعث نہیں بنتے۔ بینتھم کا خیال تھا کہ ساری اِخلاقیات کو ''مثبت نقطہ نظر پر مبنی ذاتی مفاد'' سے اخذ کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ وہ شخص جو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ اپنے اطمینان کے حصول کی غرض سے عمل کرتا ہے طویل عرصے میں وہ ہمیشہ درست عمل کرتا ہوا ثابت ہوگا۔ میں اِس خیال سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ بے شُمار لوگ ہو گزرے ہیں جنہیں پُر تشدد مناظر سے لُطف محسوس ہوتا رہا ہے۔ میں ایسے لوگوں کا قطعی طور پر معترف نہیں ہو سکتا جو کسی روز اپنے شکار کو کسی مصلحت یا دور اندیشی کے پیش نظر اس خیال سے چھوڑ دیں کہ ''چلو آج نہ سہی تو کل کسی دوسرے شکار کے تماشے کا معائنہ کرلیں گے'' تاہم دور اندیشی ایک اچھی اور حسین زندگی کا حصہ ہوتی ہے بشرطیکہ باقی دوسرے حالات جُوں کے توں رہیں۔ روبن سنسکرورز کی زندگی میں بھی کئی ایسے مواقع آئے جب اُس نے جدوجہد، تحمّل اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا۔ چنانچہ ان کو اِخلاقی صفات تسلیم کرنا لازم ہے۔ کیونکہ اُنہوں نے اس کے اطمینان کو مخالف سمت میں کسی کی اذیت رسانی کی مدد سے توازن قائم کیے بغیر بے پناہ اضافہ کیا اِخلاقیات کے اس پہلو نے چھوٹے بچوں جن میں مستقبل کے بارے میں فکر کرنے کا رجحان بے حد کم ہوتا ہے کی تربیت میں بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگر اس پہلو کے حوالے سے ان کی بعد میں آنے والی زندگی کے دوران قدرے زیادہ شدت سے زور دیا جاتا تو دُنیا بڑی تیزی سے جنت کا نمونہ بن جاتی کیونکہ جنگوں کی روک تھام کے لیے یہی کافی ہوتا ہے۔ یہاں ذہن نشین رہنا چاہیے کہ جنگیں دلدل کی بجائے غیض وغضب کے جذبات کا شاخسانہ ہوتی ہیں۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ دور اندیشی بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن یہ پھر بھی اِخلاقیات کا سب سے دلچسپ پہلو نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی اس کا کسی طرح سے حصہ ہے جو دانائی پر مبنی سوالات کھڑے کرئے کیونکہ اس میں ذاتی دلچسپی سے ماوراء ہو کر غور و فکر کرنا درکار نہیں ہوتا۔

اِخلاقیات کا یہ حصہ اگر دور اندیشی میں شامل نہ کیا جائے تو پھر اس نوعیت کی کلب کے قوانین یا

اصولوں سے مشابہہ ہو جاتی ہے یہ طریقہ کار لوگوں کو ایسے سماج میں اکٹھا رہنے کے قابل بناتا ہے جس میں ان کی آپس کی خواہشات کے تصادم کا اِمکان بھی ہو سکتا ہے۔ آگے چل کر سماج میں رہنے کے لیے بھی دو مختلف طریقے ہو جاتے ہیں۔ ایک تو فوجداری قانون کا طریقہ ہوتا ہے جس کا مقصد بیرونی طور پر ناپسندیدہ و متضاد اعمال کے نتائج کو ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے جس سے مخصوص طریقوں سے دوسروں کی خواہشات دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔، اس کے ساتھ جڑی ہوئی سماجی علامت بھی ہوتی ہے۔ جس کے تحت سوسائٹی کی طرف سے لعن طعن کا سامنا کرنا بھی سزا ہی کی ایک شکل ہے۔ اکثر و بیشتر لوگ ایسے کسی فعل سے اجتناب کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کسی سوسائٹی میں مروجہ اصولوں کے منافی ہو۔ لیکن اس کے علاوہ ایک دوسرا طریقہ بھی ہے جو نہ صرف اس سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے بلکہ کامیابی کی صورت میں زیادہ اطمینان بخش بھی جس کا مقصد لوگوں کے کردار اور ان کی خواہشات کو ہی اس پیرائے میں تبدیل کر دیا جائے جس میں ایک شخص کی خواہشات کو دوسرے سے اتنا ہم آہنگ کر دیا جائے کہ ان کے درمیان تصادم کے کم سے کم مواقع پیدا ہوں۔ اس لیے محبت نفرت سے بہتر ہے۔ کیونکہ یہ متعلقہ لوگوں کی خواہشات کے درمیان تصادم کی بجائے ہم آہنگی کا باعث بنتی ہے۔ دو اشخاص کے درمیان اگر محبت ہے تو پھر ناکامی یا کامیابی دونوں مشترکہ ہونگی۔ جبکہ نفرت کی صورت میں اگر ایک کی کامیابی ہوگی تو یہ دوسرے کی ناکامی ہوگی۔

اگر ہمارا یہ کہنا صحیح تھا کہ اچھی اور حسین زندگی وہی ہو سکتی ہے جو محبت سے بھرپور ہونے کے علاوہ علم و دانش اس میں مشعلِ راہ ہوں تو پھر یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کسی سوسائٹی کے اِخلاقی قوائد و ضوابط حتمی اور خود کفیل یا باقی دُنیا سے الگ تھلگ نہیں ہوتے۔ لیکن ان کو اس نقطہ نظر سے جانچنا ہوتا ہے کہ آیا وہ عقل و دانش اور جذبہ خیر خواہی سے مطابقت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ اِخلاقی قوائد و ضوابط ہمیشہ نقائص سے پاک نہیں رہے ہیں۔ آزٹکس لوگوں کا ایمان تھا کہ اِنسانی گوشت کھانا اِن کا تکلیف دہ فریضہ ہے کہ کہیں سورج کی روشنی مدھم نہ ہو جائے۔ سائنس کا علم نہ ہونا ان کی سب سے بڑی غلطی تھی اگر وہ اپنے قربانی کے اِنسان سے تھوڑی سی محبت محسوس کرتے تو ہو سکتا ہے کہ اُنہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا۔ کُچھ قبائل اپنی دس سے سترہ سال کی بچیوں کو کال کوٹھڑیوں میں اس خوف سے محصور رکھتے کہ سورج کی کرنیں انہیں حاملہ نہ کر دیں۔ کیا اب ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج کی جدید دور کی اِخلاقیات کے قوائد و ضوابط میں اس قسم کی رسومات کی کوئی گنجائش نہیں؟ اور کیا ہم یقینی طور پر روشن خیال ہو گئے ہیں کہ ہم پر اُس رویئے پر بندش لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو اِنسانیت کے لیے ضرر رساں ہوں؟ مزید یہ کہ کیا ہم خود اُن قابلِ نفرت رسومات ادا کرنے سے باز آ گئے ہیں جن کا کوئی بھی مہذب اِنسان کسی طرح بھی دفاع نہیں کر سکتا؟ مجھے نہیں یقین کہ ایسا سب کُچھ ہو چکا ہے۔

موجودہ دور میں اخلاقیات، نظریہ افادیت اور توہم پرستی کا عجیب و غریب ملغوبہ تو ہے لیکن اس میں

توہم پرستی کا حصہ بڑا بھی ہے اور مضبوط بھی۔ کیونکہ قدرتی طور پر اخلاقی اصول توہم پرستی کی پیداوار ہیں۔ آغاز میں کچھ خاص اعمال کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ خداؤں کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں اور اس لیے انہیں قانون کے تحت ممنوع قرار دے دیا گیا۔ کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ خدا کا غیض وغضب محض اس شخص تک محدود نہیں نہیں رہ جائے گا جو کسی ناپسندیدہ عمل کا مرتکب ہو۔ بلکہ وہ پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا۔ یوں اس کے بعد ہی گناہ کے تصور نے اس پیرائے میں جنم لیا کہ وہ اعمال خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ لیکن کسی بھی وجہ کا تعین نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اعمال خدا کے نزدیک کیونکر ناپسندیدہ ہو گئے۔ اس اُلجھن کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ مثلاً بچے کا ماں کا دودھ پیتے ہوئے بچے کی طرف سے ناگواری کا اظہار کرنا خدا کے نزدیک ناپسندیدہ کیوں ہے لیکن اس کے بارے میں ہمیں آسمانوں سے اتری ہوئی وحی سے پتہ چلتا ہے کہ کیوں بعض اوقات خدائی احکام کی بڑے عجیب وغریب طریقے سے تفسیر کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہفتے کو کام کرنا منع ہے جبکہ پروٹسٹنٹ یہ مطلب لیتے ہیں کہ اتوار کو کام کرنا منع ہے لیکن یہ نیا ممنوعہ بھی اسی برگزیدہ ہستی سے منسوب کیا جاتا ہے جس سے کہ پرانا۔

یہ بات تو صاف ہے کہ جو زندگی کو سائنسی نقطہ نظر سے دیکھتا اور پرکھتا ہے اس کو چرچ کی تعلیمات یا کسی صحیفہ کے متن سے ڈرایا یا دھمکایا نہیں جاسکتا۔ وہ محض اس سے مطمئن نہیں ہوتا کہ فلاں فلاں عمل گناہ ہے اور معاملہ وہیں ختم کردے بلکہ وہ تو اُلٹا تحقیق کرنا شروع کردے گا کہ آیا وہ عمل کس پہلو سے ضرررسانی کا باعث ہے یا جس کے تحت اس عمل کو گناہ قرار دیا گیا ہے وہ عقیدہ ہی ضرررسانی کا باعث ہے۔ خاص طور پر اسے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ موجودہ زمانے کی اِخلاقیات میں خالصتاً توہم پرستی کی جڑیں کس حد تک گہری ہیں اور اس کی شروعات میں اس کا کیا دخل رہا ہے نیز اُسے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ آزٹکس کے عقیدے میں پائی جانے والی توہم پرستی میں غیر ضروری ظلم وجبر کا عنصر کیونکر پرورش پایا اور اسے یہ بھی ادراک ہوجائیگا کہ اس دور میں اگر لوگوں کے درمیان پیار ومحبت کے جذبات کو فروغ مِلا ہوتا تو اس قسم کی بیہودگی کا فوراً کیسے صفایا ہوجاتا۔ لیکن روائتی قسم کی اِخلاقیات کے محافظین میں شاذونادر ہی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کے دل اِنسانیت کی محبت سے سرشار ہوں۔ اس کا مشاہدہ چرچ کے اکابرین کی جنگ بازی کیساتھ شدت سے محبت کے مظاہرے سے کیا جاسکتا ہے۔ جس سے اِنسان یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ وہ تو ایسی اِخلاقیات کے علمبردار ہیں جس کے ذریعے وہ ایسی قدروں کو فروغ دیتے ہیں۔ جس سے ایک طرف تو دوسروں کی اذیت رسانی کا سامان فراہم ہو اور دوسری طرف ان کی اذیت کو محسوس کرکے ان کی اپنی تسکین کا ذریعہ ثابت ہو۔ اس کے لیے کسی کو گنہگار قرار دینا ان کے لیے نہ صرف بہترین ذریعہ ثابت ہوتا ہے بلکہ شدید عدم رواداری کا جواز بھی مِل جاتا ہے۔

اب آئیں اور کسی عام شخص کی پیدائش سے اس کی موت تک کے سفر کا جائزہ لیتے ہوئے ان نقاط پر غور کریں کہ اس کی زندگی میں کن کن مرحلوں پر اُسے توہم پرستی پر مبنی اِخلاقیات کے ذریعے کون کونسی قابلِ تدارک خواہ مخواہ کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں اس کا آغاز اس کی پیدائش سے کرنے جا رہا ہوں۔ کیونکہ یہیں پر توہم پرستی کے مرتب کردہ اثرات انتہائی غور طلب ہیں کہ اگر والدین غیر شادی شدہ ہیں تو بچے پر ناحق تہمتوں کی بوچھاڑ اِسقدر قابلِ مذمت ہوتی ہے کہ اس سے زیادہ قابل ملامت اور کوئی فعل ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر والدین میں سے کوئی ایک کسی جنسی بیماری میں مبتلاء ہو تو بچے کو اس کے ورثے میں آنے کا اِمکان ہوتا ہے۔ اگر اس خاندان میں آمدنی کے اعتبار سے بہت زیادہ بچے ہیں تو غربت وافلاس، ناکافی غذائیت اور ضرورت سے زیادہ اجتماع کے علاوہ دوسری عورتوں سے ناجائز تعلقات کا بھی قوی امکان ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اِخلاقیات کے علمبرداروں میں یہ اتفاق موجود ہے کہ والدین کو اس قسم کی مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے مانع حمل کی ترکیبوں کا نہ ہی علم ہو سکے تو بہتر ہے۔ اِخلاقیات کے علمبرداروں کو خوش کرنے کے لیے لاکھوں اِنسانوں کی زندگی محض اس لیے شدید اذیت میں مبتلا رہتی ہے کہ بچے کی خواہش کے بغیر میاں بیوی میں ہم بستری کو بدچلنی کے مترادف فرض کر لیا جاتا ہے اور یہ کہ اس وقت بدچلنی تصور نہیں ہوتی جب بچے کی خواہش موجود ہو جبکہ ایسے حالات ہی کیوں نہ ہوں جس میں چاہے خود بچے کی پرورش بھی بدنصیبی اور بدبختی سے عبارت ہو اچانک ایک جھٹکے سے قتل کر دینا اور پھر آزٹکس Aztecs کا اپنے ''شکار'' کا گوشت نگل لینا اس اذیت سے مقابلتاً کہیں کم ہے جس اذیت سے اس بچے کو اپنے اردگرد خستہ حالی اور بیچارگی کے دوران کسی ورثہ میں ملی بیماری سے آلودگی کی حالت میں پیدائش کے بعد گزرنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں اس سے بھی بڑی مصیبت بِشپ اور سیاستدان ملکر اِخلاقیات کے نام پر جان بوجھ کر ڈھاتے ہیں۔ اگر ان کے دل میں محبت یا رحم کی ذرہ بھر بھی چنگاری ہوتی تو وہ یوں خباثت سے بھرپور ظلم و جبر پر مبنی اِخلاقی قواعد و ضوابط سے چمٹے نہ رہتے۔

پیدائش اور اپنے بچپن کے ابتدائی دنوں میں عام بچے کو توہم پرستی سے زیادہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اچھی خاصی مالدار خواتین بچوں کو بہترین ڈاکٹر، بہترین نرسز، بہترین غذا، آرام کرنے کے واسطے اچھا بستر اور ورزش کے لیے بہترین ساز و سامان مہیا کرتیں ہیں۔ جبکہ محنت کش طبقے کی خواتین ان تمام فوائد سے محروم ہوتیں ہیں۔ لہٰذا ان کی محرومی کی وجہ سے ان کے بچے بہت جلد موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ ماؤں کی نگہداشت کے سلسلے میں متعلقہ حکام اوّل تو اس طرف توجہ ہی نہیں دیتے اور اگر کبھی توجہ دیں بھی تو اس میں ہچکچاہٹ کا عنصر بڑا نمایاں ہوتا ہے جبکہ اخراجات بچانے کے لیے اس وقت بھی دودھ پلانے والی ماؤں کو دودھ کی فراہمی روکنے کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ پبلک حکام اُمراء کے ان رہائشی

اضلاع کی سڑکوں کو پختہ کرنے کے لیے وسیع اخراجات کریں گے جہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کا ایسا فیصلہ دراصل کئی ایک ان بچوں کی موت کا سبب بن جائے گا جن کا جرم محض غربت و افلاس ہوگا۔تاہم پوپ کی سربراہی میں پادریوں کی بے پناہ اکثریت نے سماجی ناانصافی کے حق میں دنیا بھر کی توہم پرستی کی فوج کے ساتھ حکمران پارٹیوں کی مدد کا عہد کر رکھا ہے۔

تعلیم کے تمام مرحلوں پر توہم پرستی تباہ کن اثرات مرتب کر رہی ہے۔عام طور پر ایک خاص نسبت سے کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں جنہیں سوچنے کی عادت ہوتی ہے۔ہمارے ہاں تعلیم کا اور بہت سے مقاصد کے علاوہ ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ سوچنے کی عادت کی اس قدر حوصلہ شکنی کی جائے کہ بالآخر وہ سرے سے ہی ختم ہو جائے۔ناپسندیدہ سوالات کو تکلیف دہ سمجھ کر ''زیادہ نہیں بولتے'' کہہ کر خاموش کرا دیا جاتا ہے اور اگر اس سے کام نہ چلے تو سزا مقرر ہو جاتی ہے۔ایک خاص عقیدے کو پروان چڑھانے کے لیے مخصوص قسم کے اجتمائی جذبے کو ترجیح دی جاتی ہے اس سلسلے میں سرمایہ دار، جنگ باز اور کلیسا کے معززین تعلیم کے میدان میں ایسے جذبے کو بڑھاوا دینے میں پیش پیش ہوتے ہیں کیونکہ ان سب کی طاقت اور اقتدار کا انحصار نہ صرف رائج الوقت جذباتیت پر ہوتا ہے بلکہ تنقیدی جانچ و پرکھ کی نایابی پر ہے۔عین انسانی فطرت کی مدد سے انسان کے میلانات کو زیادہ شدت سے بڑھاوا دینے میں تعلیم کو کامیاب بنایا جاتا ہے۔توہم پرستی اپنے اثرات کے زیر اثر اُستاد کے انتخاب کے ذریعے بھی تعلیم کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔معاشی وجوہ کی بنا پر استانی کا غیر شادی شدہ ہونا لازم ہوتا ہے اور اخلاقی وجوہ کی بنا پر اس کا کسی ناجائز جنسی تعلق کا نہ ہونا بھی لازم ہوتا ہے۔تاہم ہر وہ شخص جس نے علم نفسیات کا تھوڑا بہت مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا کی ہو جانتا ہے کہ طویل عرصہ کا کنوارہ پن کسی بھی عورت کے لیے اتنا غیر معمولی نقصان دہ ہوتا ہے کہ ایک صحت مند سوسائٹی میں ایسی عورت کی بطور اُستاد کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی لہٰذا اس پابندی کی وجہ سے نسبتاً زیادہ باصلاحیت اور مستعد خواتین کی تعلیم کے پیشے میں داخل ہونے کی مستقل حوصلہ شکنی ہوتی رہی۔یہ سب کچھ توہم پرستی پر مبنی تارک الدنیا ہونے کے نظریہ کے زیر اثر ہوتا رہا۔

مڈل اور ہائی سکولوں میں معاملہ اور بھی زیادہ افسوسناک ہے وہاں چرچ سروس ہونے کی وجہ سے اخلاقیات پر توجہ رکھنا صرف پادریوں کے ہاتھ میں ہوتا اور یہ کہ اخلاقیات کا اُستاد ہونے کی حیثیت سے پادری ہمیشہ دو طرح سے ناکام رہتے ہیں مثلاً وہ ایسے اعمال کی مذمت کرتے ہیں جو ضرر رساں نہیں ہوتے اور وہ ایسے اعمال کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں جو بہت زیادہ نقصان دہ ہوتے ہیں یہ سب کے سب ان غیر شادی شدہ لوگوں کے درمیان جنسی تعلقات کی مذمت کرتے ہیں جو ایک دوسرے سے لگاؤ رکھتے ہیں لیکن انہیں ابھی تک یہ یقین نہیں ہو پاتا کہ آیا وہ ساری زندگی اکھٹے رہنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ان کی

اکثریت برتھ کنٹرول کی مذمت کرتی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسے خاوند کی مذمت نہیں کرتا جس کی بیوی ہر سال بچہ جنتی ہو اور بالآخر ایک دن اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے۔ میں ایک اچھے بھلے فیشن ایبل پادری کو جانتا ہوں جس کی بیوی نے نو سال میں نو عدد بچے جنے تب ڈاکٹروں نے اسے تنبیہ کی کہ تمہاری بیوی اگلے بچے کی پیدائش کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ اگلے سال اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور وہ فوت ہو گئی۔ کسی نے اس کی مذمت کرنا تو کجا اس کی طرف توجہ تک نہ دی۔ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا اس کا عہدہ برقرار رہا اور اگلے سال اس نے دوبارہ شادی رچالی۔ جب تک پادری لوگ ظلم و بربریت کو نظر انداز کرتے رہیں گے اور معصومانہ مسرت و اطمینان کی مذمت میں مشغول رہیں گے ان سے نوجوانوں کے اِخلاق کے سرپرست ہونے کے ناطے سے کسی خیر خواہی کی توقع ہو ہی نہیں سکتی اُلٹا وہ ہمیشہ نقصان کا باعث ہوتے رہیں گے۔

جنس کے بارے میں کسی قسم کی معلومات یا اس کے متعلق راہنمائی کی عدم موجودگی کی بناء پر توہم پرستی تعلیم پر بہت بُرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس سے پہلے کہ بچے اپنے سنِ بلوغت کو پہنچیں یعنی ذرا اس دور سے قبل جب وہ جنس کے ہاتھوں ہیجان میں مبتلاء ہوتے ہوں انہیں جنس کے بارے میں چیدہ چیدہ اور اہم نفسیاتی حقائق سے بے حد سادہ اور قدرتی انداز میں آگاہ کر دینا چاہیے اور جب وہ سن بلوغت کو پہنچ جائیں تب انہیں کسی بھی قسم کی توہم پرستی کے عنصر سے پاک اِخلاقیات سے ضرور آگاہ کرنا چاہیے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو ہدایت دینی چاہیے کہ باہمی میلان اور رضامندی کے بغیر جنسی ملاپ کا کوئی بھی جواز قابلِ قبول نہیں ہو سکتا ہے یہ چرچ کی تعلیمات کے بالکل برعکس ہو جس کے مطابق عورت اور مرد کا شادی شدہ ہونا لازم ہے دوسرا یہ کہ جنسی ملاپ سے پہلے مرد میں بچے کی خواہش بھی ہونا لازمی ہے تب وہ اس حد تک بھی جائز سمجھا جاتا ہے چاہے بیوی اس کے لیے قطعی رضامند نہ ہو۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تعلیم بھی دینا ضروری ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کی باہمی آزادی کا احترام کریں انہیں یہ احساس دلانا ضروری ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر کسی قسم کی برتری حاصل نہیں مزید یہ کہ انہیں یہ بھی احساس ہونا چاہیے کہ حسد اور ملکیت کا احساس محبت کو کھا جاتا ہے۔ انہیں اس قسم کی تعلیم دینا ضروری ہے کہ اِنسان کی اس دنیا میں آمد ایک بے حد سنجیدہ مسئلہ ہے اور انہیں بچے کی آمد کا اس وقت تک بیڑا نہیں اٹھانا چاہیے جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ نئے آنے والے مہمان کو صحت کے لیے مناسب بندوبست، اچھا صاف ستھرا ماحول اور خود والدین کی نگہداشت میسر ہو گی۔ برتھ کنٹرول کے طریقوں سے بھی انہیں بخوبی آگاہ کرنا چاہیے تا کہ وہ اس اَمر کو یقینی بنا سکیں کہ بچہ اسی وقت جنم لے جب اس کی ضرورت ہو اور آخر میں انہیں جنسی بیماریوں کے خطرات اور ان سے بچاؤ اور علاج کے طریقوں کی تعلیم بھی دینا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر جنسی تعلیم ان خطوط پر استوار ہو

جائے تو اس سے اِنسانی خوشی و مسرت میں بے پناہ اضافہ یقینی ہو سکتا ہے۔

بچوں کی غیر موجودگی میں آپس میں جنسی تعلقات خالصتاً ذاتی مسئلہ تسلیم کرلیا جانا چاہیے جن اس کا ہمسایوں یا ریاست سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ جنس کی وہ مخصوص صورتِ حال جس میں بچے کی پیدائش ممکن نہیں ہوتی لیکن اس کی فوجداری قوانین کے تحت سزا خالصتاً توہم پرستی کے زمرے میں آتی ہے کیونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں سوائے ان فریقین کے جو اس میں براہ راست ملوث ہوتے ہیں کوئی اور کسی بھی طرح سے متاثر نہیں ہوتا۔ جہاں بچے موجود ہوں تو ان کے بہترین مفاد کو مدِ نظر رکھ کر ان کے درمیان طلاق کو مشکل بنانے کا مفروضہ غلط ہے۔ تاہم حد سے زیادہ شراب نوشی، ظلم و جبر اور پاگل پن ایسی وجوہات ہیں جن کی بناء پر طلاق نہ صرف بچوں کی خاطر اس قدر ضروری ہو جاتی ہے جتنی خود میاں اور بیوی کے لیے زنا کاری کے ساتھ جو عجیب و غریب اہمیت وابستہ کر دی جاتی ہے نہایت ہی نامناسب رویہ ہے۔ یہ واضح رہے کہ نازیبا رویوں کی بہت سی شکلیں ازدواجی زندگی کی خوشیوں کے لیے کبھی کبھار کی بے وفائی سے کہیں زیادہ مہلک ہوتی ہیں۔ مرد کی جانب سے ہر سال ایک بچے کا اصرار گو کہ روایتی طور پر ناشائستہ رویہ یا ظلم تصور نہیں ہوتا لیکن میرے نزدیک یہ سب سے زیادہ مہلک ہوتا ہے۔

اِخلاقی اصول قطعی طور پر ایسے نہیں ہونے چاہیں جن سے جبلی مسرت کا حصول ناممکن ہو جائے تاہم اِس کا اثر وہاں شدت سے محسوس کیا جاتا ہے جہاں ایک میاں اور ایک بیوی کی شادی کے رواج کی سختی سے پابندی ہو اور ساتھ ہی مردوں اور عورتوں کی تعداد میں عدم توازن ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے حالات میں مروجہ اصولوں کی خلاف ورزی ہوگی۔ لیکن جب اصول ایسے ہوں کہ سماج کی خوشیوں کو تو بڑی حد تک تیاگ کر ہی ان کی پیروی ہو سکے اور جب یہ محسوس ہو کہ ان پر عمل پیراء ہونے سے بہتر ہے کہ ان کی خلاف ورزی کی جائے تو یقینی طور پر وہی مناسب ترین وقت ہوتا ہے کہ ان اصولوں کو ہی تبدیل کر دیا جائے اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو ان لوگوں کو جو سماج کے اجتماعی مفاد کے برعکس عمل سے گریز کرتے ہیں ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس میں انہیں ناحق متبادل کے طور پر منافقت اور رسوائی کا راستہ اِختیار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن چرچ کو منافقت کی پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ موقع کی مناسبت سے یہ (منافقت) دراصل چرچ کے اِختیارات کی خوشامدانہ عقیدت کے مترادف ہوتی ہے جبکہ کسی بھی اور موقع پر اسے بدی کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

قوم پرستی بذاتِ خود تو ہم پرستی کی ایک شکل ہے جو مذہبی توہم پرستی سے زیادہ ضرر رساں ہوتی ہے جس کے تحت فرد کا ریاست پر قربان ہونا اس کا اولین فریضہ ہوتا ہے اور اس کے علاوہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی مزید یہ کہ اس کے اپنے ہم وطنوں کی طرف کچھ حدود ہوتی ہیں جو محبت کے اُن اصولوں کے منافی ہوتی ہیں جن کے بارے میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہی اچھی اور حسین زندگی کی تشکیل پذیری میں بنیاد ہونی چاہیں اور

یہ خود دراصل روشن خیالی پر مبنی خود غرضی کے برعکس بھی ہوتی ہے کیونکہ خالص قوم پرستی سے بے پناہ خون خرابے کے باوجود فاتح اقوام کو بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

مجرموں کیساتھ سلوک کے بارے میں گناہ کے مذہبی تصور کے پہلو سے بھی سوسائٹی کو کرب ناک صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کسی بھی قسم کی معقول اِخلاقیات اس خیال کی حمایت نہیں کر سکتی کہ مجرم ''بد'' ہوتے ہیں اور یوں سزا کے مستحق ٹھہرائے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ مخصوص لوگ ایسے اعمال کے مرتکب ہوتے ہیں جن کی معاشرہ روک تھام چاہنے کے علاوہ انہیں درست کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش بھی کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک نہایت ہی سادہ سی قتل کی مثال لے لیتے ہیں اگر سماج نے ایک اکائی کے طور پر متحد رہنا ہے اور ہم نے اس کے فوائد اور لطائف سے بہرہ ور بھی ہوتے رہنا ہے تو ہم اس اَمر کی قطعی طور پر لوگوں کو اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ جب چاہیں ایک دوسرے کو ہلاک کر دیں۔ اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کے لیے سائنسی نقطہ نظر کی رُوح کے مطابق ہونا چاہیے۔ ہمیں خود سے یہ سادہ سا سوال کرنا ہوگا کہ وہ کون سا بہترین طریقہ کار ہو سکتا ہے جس سے قتل جیسے جرم کی روک تھام ہو سکے؟ اس کے لیے دو طریقہ ہائے کار مساوی انداز میں مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک تو یہ قابل ترجیح ہونا چاہیے جس میں قاتل کی کم سے کم ایذا رسانی ہو۔ سرجیکل اپریشن کے دوران درد کی طرح قاتل کی ایذا رسانی افسوسناک ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ مساوی طور پر یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں کہ جس سے کسی قسم کا اطمینان یا لُطف اُٹھایا جائے۔ مزید براں اس سلسلے میں کینہ سے بھرپور احساس کو ہم اِخلاقی اشتعال انگیزی بھی کہہ سکتے ہیں جو ظلم کی ایک شکل ہے۔ کینے اور انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کر مجرم کو سزا دینے کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تعلیم کیساتھ شفقت و ملائمت کا امتزاج اس سلسلے میں مؤثر ثابت ہو سکے تو نہ صرف اس کو ترجیح دی جائے بلکہ اس کو مزید مؤثر بنایا جائے بلاشبہ جرم کی روک تھام اور جرم کی سزا دو مختلف سوال ہیں۔ مجرم کی ایذا رسانی عبرت سے جڑا ہوا مفروضہ ہے۔ اگر جیلوں میں نرم و ملائم اور اِنسان دوست رویوں کے برتاؤ کا رواج ہوتا اور اس کے ساتھ مفت میں اچھی تعلیم دینے کی سہولت بھی ہوتی تو لوگ شاید صرف اسلئے جرائم کا ارتکاب کرتے تاکہ وہ جیلوں میں داخلہ لے سکیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جیلوں کے ماحول کا آزادی کے ماحول سے کم خوشگوار رہنا لازمی ہونا چاہیے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آزادی کے ماحول کو بعض دفعہ یہاں موجود ماحول سے کہیں بہتر بنانا ہوگا تاہم میں نہیں چاہتا کہ اب میں تعزیری اِصلاحات کا موضوع زیرِ بحث لاؤں۔ میں تو صرف یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ ہمیں مجرم کیساتھ عین اسی طرح کا سلوک کرنا چاہیے جیسا ہم طاعون کے مریضوں سے کرتے ہیں۔ دونوں ہی مفادِ عامہ کے لیے خطرہ ہیں۔ دونوں کی آزادی اسوقت

تک سلب رکھنا لازم ہے جب تک وہ خطرہ نہ رہیں۔لیکن جو شخص طاعون کا مریض ہو وہ تو ہمدردی و غمگساری کا مستحق ہوتا ہے جبکہ مجرم لعن طعن کا مرکز یہ ایک نامعقول رویہ ہے۔ان رویوں میں فرق ہی وہ سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بناء پر جیلیں مجرمانہ رجحانات کا علاج کرنے میں ہسپتالوں میں مریضوں کے علاج کے مقابلے میں بہت کم کامیاب رہتی ہے۔

انفرادی اور اجتماعی نجات

انفرادیت پسندی کا شمار بھی روایتی مذہب کی خامیوں میں سے ہوتا ہے اور یہ خامی بھی اس کے ساتھ جڑی ہوئی اخلاقیات کے ساتھ وابستہ ہے۔ماضی میں روایتی مذہبی زندگی بھی کچھ اس طرح کی تھی جیسے کوئی رُوح اور خدا کے درمیان مکالمہ ہو۔رضاءِ الٰہی کی اطاعت نیکی تصور ہوتی تھی اور سماج کی کسی بھی حالت سے قطع نظر ایک فرد کے لیے ایسا کرنا عین ممکن تھا۔تب پروٹسٹنٹ فرقوں نے ''نجات پانے'' کا نظریہ تراش لیا حالانکہ مسیحیت کی تعلیمات میں یہ ہمیشہ سے موجود تھا۔جُداگانہ رُوح پر مبنی انفرادیت پسندی تاریخ کے مختلف مراحل میں خاصی اہمیت کی حامل رہی ہے۔لیکن آج کی جدید دنیا میں ہمیں فلاح و بہبود کے انفرادی تصور کی بجائے اجتماعی سماجی تصور کی ضرورت ہے۔میں اس باب میں اس امر پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا کہ یہ انفرادیت پسندی ہمارے اچھی اور حسین زندگی کے تصور کو کس طرح مجروح کررہی ہے۔

مسیحیت رومن سلطنت میں ایک ایسی آبادی میں نمودار ہوئی جہاں کے لوگ سیاسی لحاظ سے مکمل طور پر بے دست و پاء ہو چکے تھے اور جن کی بکھری ہوئی قومی ریاستیں تباہ و برباد ہو کر پھر سے مجتمع ہو کر عظیم الشان وسیع شہنشاہت میں مدغم ہو چکی تھیں مسیحیت کی پہلی تین صدیوں کے دوران وہ افراد جنہوں نے مسیحیت اِختیار کرلی ان سماجی اور سیاسی اداروں کو تبدیل نہ کرسکے جن کے تحت وہ زندگی گزار رہے تھے حالانکہ ان میں اپنی کم مائیگی کا شدت سے احساس بھی موجود تھا۔ان حالات میں ایک ایسا عقیدہ اِختیار کرلینا عین فطری تھا کہ اس غیر کامل دنیا میں کامل اِنسان کی تکمیل ہوسکتی ہے اور یہ کہ ایک اچھی اور حسین زندگی کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔اس سلسلے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں افلاطون کی ریپبلک سے تقابل کرتے ہوئے واضح ہوجائے گا۔جب افلاطون نے اچھی زندگی کی خصوصیات کو بیان کرنا چاہا تو اس نے فرد کی بجائے پورے سماج کی وضع قطع بیان کردی۔اس نے انصاف کے خطوط واضح کرنے کے لیے ایسا کیا جو کہ لازمی سماجی تصور ہے۔اس کے نزدیک ریپبلک کی شہریت کے خوگر ہونے کے ناطے سے سیاسی ذمہ داری پہلے ہی سے تسلیم شدہ حقیقت تھی۔یونانی آزاد اندازِ فکر کے کھو جانے کے ساتھ ہی صوفیانہ اندازِ فکر کو بڑھاوا ملنا شروع ہوگیا جو اچھی زندگی کے بارے میں انفرادی نوعیت کا تصور ہونے کے حوالے سے اِفلاطون کے برعکس مسیحیت سے

مطابقت رکھتا تھا۔

ہم جیسے جمہوری ممالک کے باشندوں کو زیادہ مناسب اخلاقیات پانے کے لیے مطلق العنان روم کی بجائے آزاد ایتھنز کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ ہندوستان میں جہاں سیاسی حالات تقریباً کرائسٹ کے زمانے میں بدھ کے دور سے ملتے جلتے ہیں مہاتما گاندھی کو کرائسٹ کی تعلیمات سے ملتی جلتی تبلیغ کرتے ہوئے پاتے ہیں اور ساتھ ہی اسے اسی طرح مسیح کو صلیب پر چڑھانے کے لیے حکم جاری کرنے والے پونٹیس پائیلیٹ Pontius Pilate کے جانشینوں کے ہاتھوں سزا پاتے ہوئے مشاہدہ کر رہے ہیں۔ لیکن زیادہ انتہا پسند ہندوستانی قوم پرست انفرادی نجات سے غیر مطمئن ہونے کی وجہ سے قومی نجات کی طرف راغب ہیں اور یوں اس نقطہ نظر سے مغربی جمہورتیوں کی طرف ان کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میں یہاں یہ کہنا چاہوں گا کہ اس نقطہ نظر کے پھلنے پھولنے میں نہ صرف کرسچن اثرات رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں بلکہ انفرادی نجات کا عقیدہ بھی اس کی شعوری توانائی اور اس کے اظہار میں حائل ہو رہا ہے۔

ہمارے تصور کے مطابق اچھی زندگی ایسے لاتعداد سماجی حالات کا تقاضہ کرتی ہے جن کے بغیر ہمارے خواب کی تعبیر ناممکن ہے۔ اچھی زندگی سے ہماری مراد وہ ہے جو علم کی امامت میں محبت سے بھرپور ہو۔ اس کے لیے مطلوبہ علم وہیں موجود ہوسکتا ہے جہاں حکومتیں اور کروڑ پتی لوگ اس کے پھیلاؤ اور اس کی دریافتوں پر اپنی بھرپور کاوشیں مرکوز کر دیں۔ مثال کے طور پر اس وقت کینسر کی بیماری تشویش ناک حد تک بڑھ چکی ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب اس کی روک تھام کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ سرِ دست اس کے بارے میں علم نہ ہونے کی وجہ سے اس کا جواب کسی کے پاس نہیں جبکہ اس کے علاج کے بارے میں علم کا حصول کمال درجے کی تحقیق کے بغیر ممکن نہیں۔ مزید براں سائنس، تاریخ، لٹریچر اور اِن سے متعلق علوم ہر اُس شخص کے لیے لازمی طور پر قابل حصول ہونے چاہیں جو ان کی خواہش کرے۔ اس کے لیے حکومتی سطح پر مناسب منصوبہ بندی کے تحت جامع پروگرام کی تکمیل کے لیے وسیع پیمانے پر انتظامات کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ محض عقائد میں ترمیم یا مذہبی ردو بدل سے کسی ایسے مقصد کا حصول ممکن نہیں ہوسکتا۔ مزید یہ کہ بیرون ملک تجارت بھی بے حد اہمیت رکھتی ہے ورنہ اس کے بغیر برطانیہ میں مقیم تقریباً آدھی آبادی بھوک کی نذر ہو جائے اور اگر ہم اس طرح مسلسل مرتے رہیں تو اچھی زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لیے بہت کم لوگ بچ پائیں گے۔ بہرحال اس سلسلے میں مزید مثالیں دینے کی ضرورت نہیں لیکن اہم ترین نقطہ یہ ہے کہ اچھی اور بری زندگی کے درمیان امتیاز کے حوالے سے دنیا کو ایک اکائی کی حیثیت حاصل ہے اور جو لوگ مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے آزاد و خود مختار زندگی گزارنے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر حقیقتاً دھرتی پر حشرات الارض کی طرح ہیں۔

سیاسی غلامی تلے دبے ہوئے ابتدائی مسیحیوں کے لیے انفرادی نجات کا نظریہ دلاسہ اور اطمینان فراہم کرتا تھا۔ لیکن تنگ نظری پر قائم اچھی زندگی کے تصور سے ذرا غافل ہونے سے انفرادی نجات کا نظریہ فوراً ہی ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ آرتھوڈوکس مسیحیوں کے نزدیک نیکی کی زندگی ہی اچھی ہوتی ہے اور نیکی خدا کی مرضی کے سامنے سربسجود ہونے پر مشتمل ہے اور خدا کی مرضی ضمیر کی آواز کے ذریعے منکشف ہوتی ہے یہ سارے کا سارا تصور کسی اجنبی کی مطلق العنانیت کی پسندیدگی اور منظوری سے مشروط ہے اور ضمیر اس سلسلے میں بدترین اور بیہودہ راہنما ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ان دُھندلی اور مبہم یادوں اور تصورات پر مشتمل ہوتا ہے جو زندگی کے ابتدائی ایام میں کانوں میں اُنڈیلے جاتے ہیں۔ اسی لیے وہ متعلقہ شخص کے والدہ یا نرس سے کسی طرح بھی زیادہ دانشمندانہ نہیں ہو سکتے۔ اچھی زندگی اپنے بھرپور مفہوم میں بسر کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اچھی تعلیم میسر ہو، دوست احباب ہوں، محبت ہو بچے (اگر ضرورت یا خواہش ہو) جن کے لیے اتنی آمدنی ہو کہ کسی چیز کی کمی یا اندیشہ نہ ہو، اچھی صحت ہو اور روزگار کا ایسا ذریعہ میسر ہونا بھی لازم ہے جو غیر دلچسپ نہ ہو۔ ان سب چیزوں کا انحصار سماج کی اندرونی بُنتر کی نوعیت اور سیاسی واقعات پر ہوتا ہے جو مذکورہ بالا ضرورتوں کی فراہمی میں مددگار یا رکاوٹ کا باعث ہوتے ہیں۔ اچھی زندگی ایک اچھے سماج ہی میں ممکن ہوتی ہے جبکہ اس کے برعکس صورتِ حال میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

اشرافیہ کے سماج میں فن، سائنس اور دوستی پھل پھول سکتے ہیں۔ یہ سب عناصر یونان میں موجود تھے لیکن ان کی بنیاد غلامی پر ہوا کرتی تھی اور یہ ہم میں اب بھی استحصال کی بنیاد پر موجود ہے۔ لیکن محبت ہمدردی کی شکل میں اور فیض رسانی کے جذبے اشرافیہ کے سماج میں آزادانہ طور پر فروغ نہیں پا سکتے اور یہی اشرافیہ کے آئیڈیل کی سب سے بڑی خامی ہے۔ اشرافیہ کے فرد کو خود کو بھی یقین دلانا پڑتا ہے کہ یہ غلام، پرولتاری اور رنگ دار اشخاص کسی گھٹیا قسم کی مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور یہ کہ ان کے مسائل اور مصیبتیں کسی اہمیت کی حامل نہیں آج بھی ایک انگلش جنٹلمین افریقیوں پر بے پناہ کوڑے برساتا ہوا پایا جاتا ہے جس سے اکثر و بیشتر افریقی کوڑے کھانے کے بعد چند گھنٹوں کے اندر اندر اذیت کی شدت کیوجہ سے زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ شُرفاء اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی کیوں نہ ہوں، فنونِ لطیفہ کا اعلیٰ ذوق بھی رکھتے ہوں اور انتہائی قابلِ تعریف شگفتہ گفتگو کے ماہر بھی کیوں نہ ہوں لیکن میں نہیں مان سکتا کہ وہ ایک اچھی زندگی گذارتے ہیں۔ بلا شبہ اِنسانی فطرت میں ہمدردی کے عنصر کا نفوذ ہوتا ہے لیکن وہ اس حد تک نہیں ہوتا جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ایک جمہوری انداز میں پھلتے پھولتے سماج میں صرف ایک پاگل ہی کا مذکورہ رویہ ہو سکتا ہے۔ ہمدردی کی حد بندی میں جب اشرافیہ کا آئیڈیل شامل ہو جائے تو مذمت کی صورت نمودار ہوتی ہے۔ نجات اشرافیائی آئیڈیل ہے۔ وہ اس لیے کہ یہ انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے اسی بنیاد پر ذاتی نجات کے

نظریئے کو جس طریقے سے بھی بڑھا چڑھا کر تشریح کر کے کتنا ہی سجایا اور سنوارا جائے یہ اچھی زندگی کی ترقی کے لیے کسی بھی پہلو سے مددگار ثابت نہیں ہو سکتا۔ نجات کا یہ نظریہ ایک ہولناک تبدیلی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے جیسے کہ سینٹ پال کی راہ نمائی میں ہوا اور سب کچھ تہس نہس ہو گیا شیلے کی نظمیں بھی ایسے ہی نظریہ کی احاطہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ''ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب ہر شخص کی قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے تب سماج کا خون چوسنے والے عناصر کا خاتمہ ہو جاتا اور ایک عظیم دور کا آغاز ہو جاتا ہے'' آپ کہہ سکتے ہیں کہ شیلے ایک شاعر ہونے کے ناطے سے ایک غیر اہم شخص ہے۔

جس کے خیالات کسی طرح بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے لیکن میرے نزدیک زیادہ انقلابی تر سیاستدانوں کے خیالات شیلے جیسے ہی تھے اُنہیں پختہ یقین تھا کہ بے بسی بیچارگی، ظلم و جبر اور تذلیل و تحقیر دُنیا میں ظالموں و جابروں، پادریوں و سرمایہ داروں اور جرمنوں کی پیدا کردہ ہیں اگر اِن بدی کے سرچشموں کا خاتمہ ہو جائے تو تب ہی ہم سکھ چین سے رہنے کے قابل ہونگے۔ اِس مقصد کے حصول اور جنگوں کے خاتمے کے لئے جنگ کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نسبتاً خوش قسمت تھے وہ لوگ جنہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا اور موت نے اِنہیں نگل لیا اور بدقسمت تھے وہ جو فتحیاب ہوئے اور پھر اپنی چمکتی دمکتی اُمیدوں کو خاک میں ملتے ہوئے پا کر مردم بزاری کا شکار ہو گئے کیونکہ کرسچن اندازِ فکر کے خاتمے کے لئے یہی اختیار کردہ راستہ اُن کی اُمیدوں کا حتمی سرچشمہ تھا۔

میں یہ قطعی طور پر باور نہیں کرانا چاہتا کہ انقلابات کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی لیکن میں یہ ضرور باور کرانا چاہتا ہوں کہ امن، عدل اور حقیقی خوشی کے حصول کے لیے یہ کسی طرح بھی مختصر راستہ ثابت نہیں ہوتے۔ اچھی زندگی کے حصول کے لیے بھی کوئی مختصر راستہ ہو ہی نہیں سکتا چاہیے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی اگر اچھی زندگی کی تعمیر مطلوب ہو تو ذہانت، تحمل اور ہمدردی کی تعمیر کرنا ہوگی۔ یہ محض کیمیتی معاملہ ہے۔ ایک ایسا معاملہ جو بتدریج بہتری کا تقاضہ کرتا ہے۔ جہاں ابتدائی تربیت اور تعلیمی تجربات کی ضرورت ہوتی ہے اچانک بہتری اور بے صبری بھی عقیدے کی راہ ہموار کرتی ہے۔ تاہم ممکنہ بتدریج بہتری اور وہ طریقہ ہائے کار جن سے اس کا حصول ممکن ہو سکے۔ مستقبل کی سائنس کا معاملہ ہے لیکن اس کے بارے میں کُچھ چیزیں اب بھی بیان کی جا سکتی ہیں جو کُچھ کہا جا سکتا ہے اس کا کُچھ حصہ جن حقائق پر مشتمل ہو سکتا ہے ان کی نشاندہی میں آخری باب میں کرنے کی کوشش کروں گا۔

سائنس اور مسرت

اِخلاق کے علمبرداروں کا مقصد لوگوں کے رویوں میں بہتری لانا قابلِ تعریف آرزو ہے لیکن ان کا

اپنا رویہ اکثر و بیشتر افسوس ناک ہوتا ہے لیکن وہ جس قسم کی مخصوص بہتری لانا چاہتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے جو طریقہ ہائے کار عمل میں لاتے ہیں وہ قطعی طور پر قابل تعریف نہیں ہیں۔ ان کا بظاہر طریقہ کار اِخلاقی پند و نصائح ہے لیکن اگر وہ روایت پسند (Orthodox) ہیں تو ان کا اصل طریقہ کار سزا و جزا کے نظام پر مشتمل ہوتا ہے اوّل الذکر کا اثر یا تو سِرے سے ہوتا ہی نہیں اور اگر ہو بھی تو اِتنا معمولی اور عارضی نوعیت کا ہوتا ہے جس کا اندازہ ساوونارولا Savonarola سے لیکر آج تک نشاۃ ثانیہ کے علمبرداروں کی تبلیغ کے اثر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ البتہ مؤخر الذکر یعنی سزا اور جزا کا تصور بڑے گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے تحت اِنسان بیوی کی بجائے پیشہ ور عورتوں کو ترجیح دینے لگتا ہے کیونکہ اس کے لیے یہی وہ واحد طریقہ کار رہ جاتا ہے جس کو وہ نہایت آسانی سے چھپائے رکھنے میں کامیاب رہتا ہے اور یوں اِخلاق کے علمبردار ایک طرف عملی طور پر پیشہ ور عورتوں کی تعداد میں اضافے کا سبب بنتے ہیں تو دوسری طرف جنسی بیماریوں کو تحفظ فراہم کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نتائج ان کی خواہشات سے مطابقت نہیں رکھتے لیکن چونکہ ان کا نقطہ نظر غیر سائنسی ہوتا ہے اس لیے وہ اتنے احمق ہوتے ہیں کہ اس طرف توجہ دینے میں ناکام رہتے ہیں۔

کیا اس تبلیغ اور آزادروش کے ملغوبے کا کوئی بہتر متبادل بھی ہو سکتا ہے؟ تو میرا فوری جواب یہ ہے کہ ہاں یقیناً ہو سکتا ہے۔

لوگوں کے اعمال جہالت یا ان کی بُری خواہشوں کی وجہ سے ضرر رساں ہوتے ہیں۔ سماجی نقطہ نظر سے جس کو ہم بری خواہش قرار دیتے ہیں اصل میں اس سے مراد وہ خواہش ہے جو دوسروں کی خواہشات قلع قمع کرنے میں مددگار ہو یا وہ جو دوسری بہت سی خواہشات کو ناکام کرنے میں مفید ثابت ہو۔ للٰہذا اس ضرر رسانی پر توجہ دینا ضروری ہو جاتا ہے جو جہالت سے پھوٹتی ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ تعلیم اور زیادہ سے زیادہ تحقیق ہی بہتری کی سمت میں رہنمائی کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ ضرر رسانی جو بری خواہشات سے پھوٹتی ہے اس کا تدارک ایک ٹیڑھا مسئلہ ہے۔

کسی مخصوص دشمن کے لیے عام مردوں اور عورتوں میں کینے سے بھرپور نہایت فعال مخاصمانہ رویہ پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی دوسروں کو مصائب میں مبتلاء دیکھ کر انہیں عجیب و غریب لذت کا احساس بھی ہوتا ہے جسے چھپائے رکھنے کی غرض سے فصاحت و بلاغت سے مزین جملوں کا استعمال رائج ہے اور تقریباً آدھی اِخلاقیات محض اس کی پردہ پوشی کے لیے وقف ہے۔ اگر اِخلاقیات کے علمبرداروں کا مقصد لوگوں کے اعمال میں بہتری لانا ہے تو پھر لازی طور پر اس مسئلے کا آگے بڑھ کر سامنا کرنا ہوگا۔ اس کا جائزہ ایک بار نہیں ہزار ہا بار سرسری یا تفصیل سے لیتے ہوئے یہ حقیقت آپ کے سامنے واضح ہو جائے گی کہ جب

لوگوں کی انتہائی خوشی وطمانیت کا مشاہدہ اس وقت ہوتا ہے جس وقت وہ بڑے یقین کے ساتھ کسی سکینڈل کا بار بار ذکر کر رہے ہوتے ہیں یا وہ ایسے مجرموں کو پٹتے ہوئے پائیں جن کے بارے میں باقاعدہ ثبوت موجود ہوں جبکہ انہیں بلا تشدد بھی کسی بہتر طریقے سے راہ راست پر لایا جا سکتا ہو۔ سفید فاموں کی طرف سے سیاہ فاموں کی شدید پٹائی کا مشاہدہ بھی ان کی کینہ بھری لذت میں اضافہ کرتا ہے۔ اسی قسم کی لذت بوڑھی خواتین اور پادریوں میں قدرے زیادہ شدت سے دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے جب وہ فوجی جوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کے فرائض کی نشاندہی کر رہے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ بچے بھی بے دریغ ظلم کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈیوڈ کاپرفیلڈ اور آلیور ٹوِسٹ کسی طرح بھی تصوراتی کردار نہیں ہیں۔ اس قسم کا فعال کینہ اِنسانی فطرت کی بدترین خصوصیت ہے۔ اگر اس دنیا کو خوشیوں کا گہوارہ بنانا مقصود ہو تو اس فطرت کو تبدیل کرنا ضروری ہے شاید یہی وہ واحد اتنی بڑی یہ وجہ ہے جو جنگ سے اس قدر منسلک ہے کہ اس کے مقابلے میں سیاسی اور معاشی وجوہات مل کر بھی اتنا وزن نہیں رکھتیں تو پھر کینے کی روک تھام کے مسئلے سے کس طرح نمٹا جائے؟

آئیں سب سے پہلے اس کی وجوہات کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں اس کی کچھ وجوہات سماجی نوعیت کی ہیں اور کچھ نفسیاتی۔ یہ دُنیا آج بھی ماضی کی طرح 'زندگی یا موت' کی نوعیت کے مقابلے کی بنیاد پر قائم ہے۔ جنگ کے دوران سوال یہ تھا کہ جرمن اور اتحادی ممالک کے بچوں کو قحط اور قلت سے مرنے دیا جائے (اس سے قطع نظر کہ دونوں فریقین میں کینہ موجود تھا۔ لیکن کوئی معمولی سی بھی وجہ موجود نہ تھی کہ کیوں نہ دونوں فریقین کے بچے محفوظ رہیں) اکثر و بیشتر لوگوں کے ذہنی پس منظر میں تباہی و بربادی کا خوف مسلط رہتا ہے اور یہ بات صاحب اولاد کے بارے میں زیادہ درست ہے۔ دولت منداس خوف میں مبتلاء رہتے ہیں کہ کہیں بالشویک اِن کا سرمایہ ضبط نہ کرلیں غریب پر صحت اور روزگار چھین جانے کا خوف مسلط رہتا ہے۔ غرض ہر شخص ایک ایسے جنون میں مبتلاء ہے کہ کسی بھی طرح تحفظ حاصل کر سکے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی فرض کرلیا گیا کہ اپنے دشمنوں کو مستقل طور پر زیرِ نگین رکھنے سے ہی تحفظ حاصل کیا جا سکتا ہے اور پھر وہ لمحات آتے ہیں جب ہر طرف خوف و ہراس کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ظلم و جبر کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور چاروں اطراف سے خباثت اپنے پنجے گاڑ دیتی ہے۔ رجعت پسند خوف کی طرف مائل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ انگلینڈ میں بالشوزم کا خوف پھیلایا جاتا ہے۔ فرانس میں جرمنی کا اور جرمنی میں فرانس کے خوف کا ہوا تعمیر کیا جاتا ہے یہ سب کچھ کرنے اور ان کی اپیلوں کا واحد مقصد اس خطرے کو بڑھاوا دینا ہوتا ہے جس کے خلاف وہ تحفظ چاہتے ہیں۔

اس لیے سائنسی نقطہ نظر سے اِخلاقیات کا جائزہ لینے والے اساتذہ کی سب سے بڑی دلچسپی کا مرکز

خوف سے نبرد آزما ہونے کے لیے اُن تدابیر کا کھوج لگانا ہونا چاہیے جن سے اس کا خاتمہ ہو سکے۔ یہ سماجی تحفظ اور جرأت کے احساس کو فروغ دینے ہی سے ممکن ہو سکتا ہے جب میں خوف کا ذکر کرتا ہوں تو اس سے میری مراد غیر مناسب جذبے کی ہوتی ہے نہ کہ کسی ایسی پیش بندی کی جس کے تحت ایسے اقدامات کیے جاتے ہیں تا کہ کوئی ممکنہ حادثہ نہ ہو جائے۔ مثال کے طور پر جب کسی تھیٹر کو آگ لگ جائے تو معقول انداز فکر کے حامل شخص پر اس سے پھیلنے والی تباہی کا اندازہ اُتنا ہی واضح ہوتا ہے جتنا کہ اس سے خوف زدہ ہونے والے کو لیکن اوّل الذکر ایسے طریقے اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے جس سے تباہی کے اِمکانات کو کم کیا جا سکے۔ جبکہ مؤخر الذکر بوکھلاہٹ میں تباہی کے اضافے کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ یورپ 1914ء سے آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے ایک تھیٹر میں خوف سے لرزاں بیٹھے ہوئے شائقین کی سی حالت میں ہے۔ لہٰذا ان لمحات میں نہایت احتیاط، تحمل، بردباری اور غور و فکر سے ایسا راستہ تلاش کرنے کی ضرورت ہے جس سے ہم پاؤں تلے روندے جائے یا ایک دوسرے کے ٹکڑے اُڑائے بغیر باہر نکل سکیں۔ ملکہ وکٹوریہ کا دور اپنی لاتعداد فریب کاریوں کے باوجود تیز رفتار ترقی کا دور تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس وقت لوگ خوف کی بجائے اُمیدوں سے لیس تھے اور اگر اب بھی ہم نے آگے بڑھنا ہے تو ہم پر ایسے ماحول کو فروغ دینا لازم ہو گا جس میں اُمید کی فرمانروائی ہو۔

ہر وہ کوشش جو عمومی سماجی تحفظ میں اضافہ کرے ظلم و جبر میں یقینی طور پر کمی کا باعث ہو گی اور یہی بات جنگوں کی روک تھام کی کوششوں پر بھی منطبق ہوتی ہے چاہے ان میں سے کوئی جنگ لیگ آف نیشنز کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے کیوں نہ لڑی جائے یا کسی اور صورت میں۔ اس کے علاوہ غربت و افلاس کا خاتمہ، صحت میں بہتری کے لیے جدید سے جدید تر دواؤں کی فراہمی، حفظانِ صحت کے اصولوں اور نکاسیٔ آب کی سہولتوں میں اضافہ غرض وہ تمام طریقہ ہائے کار عمل میں لانا ہونگے جو لوگوں کے ذہنوں کی اتھاہ گہرائیوں میں بیٹھی وہ دہشت جو رات کے اندھیروں میں گھات لگائے بھیانک خواب بن کر منڈلاتی رہتی ہے کو کم کر سکیں یہاں یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ فرانسیسی جرمنوں کی قیمت پر سرمایہ دار محنت کشوں کی قیمت پر یا سفید فام سیاہ فاموں کی قیمت پر حتیٰ کہ انسانیت کا کچھ حصہ خود انسانیت ہی کے دوسرے حصے کی قیمت پر تحفظ حاصل کرنے کی کوشش کریگا تو اس کے تباہ کن نتائج برآمد ہونگے۔ اس قسم کا طریقہ دہشت میں اضافے کا باعث بن کر متاثرین کو بغاوت پر مائل کرتا ہے۔ اس سلسلے میں انصاف ہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر سماجی تحفظ کو یقینی بنایا جا سکتا ہے اور انصاف سے میری مراد دنیا بھر کے انسانوں کے لیے پوری دنیا پر فرداً فرداً مساوی دعوے کو حق بجانب تسلیم کیا جانا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تحفظ کی فراہمی خوف میں کمی کا باعث بنتی ہے لیکن اس کے علاوہ ایک دوسرا

طریقہ کار موجود ہے جو قدرے زیادہ براہ راست نوعیت کا ہوتا ہے اور وہ ہے بہترین صحت کے لیے بہترین غذا کی فراہمی اور اس کا بہترین اصولوں کے تحت استعمال جنگ میں جرأت کے عنصر کی اہمیت کے بارے میں اِنسان نے ابتدائی ایام ہی میں جان لیا تھا کہ اس کو اچھی خوراک اور تعلیم کے ذریعے بڑھاوا دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں قدیم زمانے میں یہ مفروضہ بھی پایا جاتا تھا کہ جرأت میں اضافہ کرنے کے لیے خود اِنسانی گوشت بطور خوراک مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن فوجی نوعیت کی جرأت مندی پر حکمران طبقات کی بالا دستی ان کے پیدائشی حق کے طور پر تسلیم کی جاتی تھی جیسے کہ سپارٹا کے باشندوں کو ان کے غلاموں پر رُعب و دبدبہ برطانوی افسران کا عام ہندوستانیوں پر غلبہ جبکہ مرد کو عورت پر بالا دستی کا حق اب بھی حاصل ہے۔ یہ تصور کہ جرأت اور دبدبہ صرف اشرافیہ کا ہی خاصہ ہے صدیوں قائم رہا۔ حکمران طبقے کے اندر جرأت میں ہر اضافہ محکوم طبقات پر مزید ایک نیا بوجھ بن کر نمودار ہوتا ہے جو ان کے اندر خوف کے نئے میدان ہموار کرتا ہے یوں ظلم و جبر کا لامتناہی سلسلہ قائم و دائم رہتا۔ لہٰذا نئے اِنسان کی تشکیل سے قبل جرأت کو جمہوری روپ دینا لازم ہے۔

بہت حد تک جرأت جمہوری روپ اختیار کر چکی ہے ان خواتین نے جو اپنے لیے حق رائے دہی کا مطالبہ کرتیں رہیں اپنی جدوجہد سے ثابت کر دیا کہ وہ کسی بھی باہمت اور جوانمرد شخص سے کسی طرح کم نہیں ایسا ولولہ انگیز مظاہرہ کرنا ووٹ کے حق کو تسلیم کروانے کے لیے لازمی تھا۔ ایک عام سپاہی کو اپنے کیپٹن یا لیفٹیننٹ کے مساوی جرأت کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ جنرل کے مقابلے میں اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے لیکن اس کا زیادہ تر تعلق فوج سے برخواستگی کے بعد اس کی غلامانہ خصلت سے جُڑا ہوتا ہے۔ بالشویک جو خود کو پرولتاریوں کا چمپئین قرار دیتے اُن کے بارے میں کُچھ بھی کہہ لیں لیکن ان کے جرأت و ہمت کا پیکر ہونے میں کسی شک وشُبہ کی گُنجائش نہیں جو کہ ان کے قبل از انقلاب کے ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے۔ اس سے قبل جاپان میں ساموراری Samurai کو جنگجویانہ جذبے پر گویا اجارہ داری حاصل تھی اور پھر جبراً بھرتی کیے گئے جوانوں کے اندر خاص طور پر اور تمام مردوں کی آبادی میں عام طور پر ایسے جذبے کو شدت سے پمپ کرنا لازم تھا۔ یوں تمام بڑی طاقتوں نے پچھلی نصف صدی میں اس سلسلے میں اتنا زیادہ کام کیا ہے کہ اب اشرافیہ کا جرأت و دبدبہ پر اجارہ داری کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج جمہوریت کو اس سے کہیں بڑے خطرات کا سامنا ہوتا جو آج اُسے درپیش ہیں۔

لیکن جنگیں لڑنا ہی بہادری نہیں بلکہ ایسی بہادری کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ اصل شجاعت و بہادری غربت و افلاس کے خاتمے کے لیے کاوشوں کے دوران، خود اپنی تضحیک اور اپنے ہی سماج کے اندر نفرتوں کا سامنا کرنے کے لیے درکار ہوتی ہے۔ لیکن ان تمام میدانوں میں اکثر و بیشتر بہادر ترین سپاہی بھی

لڑنے کے افسوسناک حد تک نااہل ہوتے ہیں۔ درحقیقت خطرے کو بھانپ کر پُرسکون رہتے ہوئے مناسب انداز میں اس کا مقابلہ کرنے اور خود پر کسی قسم کی گھبراہٹ، خوف یا غصہ طاری ہونے کی اجازت نہ دینے میں ہی اصل بہادری ہے۔ انہی صفات کے حصول کے لیے علم بے حد مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ اچھی صحت، اچھی جسمانی ساخت، اچھی غذا اور بنیادی لازمی محرکات کی آزادانہ نشوونما سے ہر طرح کی مطلوبہ جرأت سے متعلق تعلیم آسانی سے میسر آسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی بلی اور خرگوش کے خون کا باہمی جائزہ لیتے ہوئے جرأت کے کسی فزیالوجیکل سرچشمے کا سراغ بھی مل جائے۔ اس کے لیے سائنسی علوم میں بے پناہ امکانات موجود ہیں جن کی مدد سے جرأت میں اضافہ کیا جاسکتا ہے اور یہ کئی ایک طریقہ ہائے کار سے ممکن ہوسکتا ہے۔ مثلاً خطرے کے تجربے سے مثالی نمونہ پیش کرنے سے اتھلیٹک زندگی اور مناسب غذا سے ان تمام چیزوں سے بڑی حد تک صرف اونچے طبقات کے بچے ہی استفادہ کررہے ہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ محض یہ ہے کہ جہاں وہ پیدا ہوئے وہاں پہلے سے دولت موجود تھی۔ ابھی تک جس جرأت کو سماج کے نچلے طبقات میں فروغ حاصل ہورہا ہے بے حد محدود نوعیت کی ہے۔ اس میں جہاں پہل کاری کا بھی فقدان ہے وہیں رہنمائی کا عنصر بھی مفقود ہے۔ جب بھی ایسی صفات جو راہنمائی عطا کرتی ہیں آفاقی صورت اختیار کرلیں گی تب نہ کوئی لیڈر رہے گا اور نہ پیروکار یوں آخرکار جمہوریت کی تکمیل ہوگی۔

لیکن کینہ محض خوف کا واحد سرچشمہ نہیں بلکہ رقابت اور مایوسی بھی اس کے برابر کے حصہ دار ہیں۔ کُبڑے اور معذوروں کا بغض اور رقابت تو محاوروں میں استعمال ہوتے ہیں۔ انہیں کینے کا سرچشمہ بھی جانا اور مانا جاتا ہے لیکن ان کے علاوہ دوسرے بدنصیبی پر مبنی حالات بھی ایسے ہی نتائج مرتب کرتے ہیں۔ جنسی طور پر ناکام رہنے والی عورت یا مرد رقابت کا شکار ہونے کے لیے نہایت موزوں ثابت ہوتے ہیں۔ جنسی طور پر خوش قسمت ثابت ہونے والے خاص طور پر ان کی لعن طعن کا نشانہ بنے رہتے ہیں یہ گویا ان کی طرف سے رقابت کا اظہار ہوتا ہے۔ امراء سے رقابت کا جذبہ انقلابی تحریکوں کے لیے ڈرائیونگ کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسد رقابت کی ایک مخصوص شکل ہے۔ مثال کے طور پر بوڑھے نوجوانوں سے محبت تو کرتے ہیں لیکن اگر ان کا نوجوانوں سے مقابلے کی نوعیت کی سی صورتِ حال میں سامنا ہوجائے تو وہ ان سے ظالمانہ رویہ اختیار کرنے کو مناسب سمجھتے ہیں۔

جہاں تک مجھے علم ہے رقابت سے نمٹنے کے لیے کوئی بھی طریقہ کار کارگر ثابت نہیں ہوسکتا۔ سوائے اس کے کہ رقابت میں مبتلاء شخص کو خوشی سے بھرپور زندگی گذارنے کے مواقع فراہم کیے جائیں اور اس کے ساتھ ہی نوجوانوں میں مسابقت کی بجائے رفاقت کے جذبے سے مل جل کر کام کرنے کے رجحان کو تقویت دی جائے۔ رقابت اپنی بدترین شکل میں ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو خوشگوار ازدواجی زندگی گذارنے،

اپنے بچوں کو مناسب تربیت دینے اور اپنے کیریئر کے سلسلے میں مناسب مقام حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں اس قسم کی بدنصیبی پر مبنی حالات سے ہر قسم کے سماجی اداروں کے ذریعے بچا جاسکتا ہے۔ تاہم یہ اعتراف کرنا بھی لازم ہوگا کہ رقابت اِمکانی طور پر وہاں جوں کی توں ہی رہے گی۔ تاریخ میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ کئی جنرلوں نے ایک دوسرے کی شہرت کو خراب کرنے کو اپنی شکست پر ترجیح دی۔ ایک ہی پارٹی کے سیاستدانوں اور ایک ہی مکتبہ فکر سے وابستہ فنکاروں کے درمیان حسد ہونا تقریباً یقینی ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں کچھ بھی نہیں ہوسکتا سوائے اس کے کہ ایک دوسرے کو اس حد تک دور رکھا جائے تا کہ وہ ایک دوسرے کو کوئی نقصان نہ پہنچا ئیں اور لازم ہے ان میں سے کسی کی جیت اعلیٰ معیار کی بنیاد پر ہو۔ دو فنکاروں کے درمیان رقابت عام طور پر بے ضرر قسم کی ہوتی ہے۔ اس حالت میں زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا ہے کہ اس میں مبتلاء فنکار اسی میں عافیت سمجھتا ہے کہ وہ دوسرے سے بہتر تصویر پینٹ کرے کیونکہ وہ دوسرے کی پینٹ شدہ تصویر کا خاتمہ نہیں کرسکتا۔ جہاں رقابت کا سامنا کیے بغیر چارہ نہ رہے تو بھی اس جذبے کو اپنی کوششوں کو تحریک دینے کے لیے استعمال ہونا چاہیے نہ کہ رقیب کی کوششوں کو ناکام بنانے میں استعمال ہو۔

سائنس کے اِمکانات خوشی ومسرت کو بڑھانے میں صرف اس حد تک محدود نہیں کہ اس کے ذریعے اِنسانی فطرت کے ان پہلوؤں کو کم کیا جائے جو لوگوں کی باہمی شکست کا باعث ہوتے ہیں اور جنہیں ہم ''بُرا'' کہتے ہیں اور شاید اس میں اِنسان کی مثبت خوبیوں کو جلاء بخشنے کی اتنی زیادہ صلاحیت موجود ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اس کی بدولت ماضی پرستوں کی آہ وبکا کے باوجود صحت کے میدان میں پہلے ہی اتنی بہتری آچکی ہے کہ آج ہم اجتماعی طور پر اتنے تندرست وتوانا ہیں کہ 18 ویں صدی کی کسی قوم یا طبقے کے لیے اس کا تصور کرنا محال تھا۔ آج ہمیں ماضی کے مقابلے میں جہاں نسبتاً کم بیماریوں کا سامنا ہے وہیں ہم طویل زندگی سے لُطف اندوز ہورہے ہیں۔ جتنا علم ہمیں آج میسر ہے اس کے نہایت معمولی سے حصے کو بھی بروئے کار لایا گیا ہوتا تو ہم اس سے بھی کہیں زیادہ صحت مند ہوتے جتنے کہ ہم آج ہیں اور مستقبل میں اس کی بدولت اس عمل کی رفتار میں اضافہ کے اِمکانات یقینی ہیں۔

اب تک فزیکل سائنس ہماری زندگی پر بے پناہ اثرات مرتب کرتی آرہی ہے۔ لیکن مستقبل میں فزیالوجی اور سائیکالوجی کا اس سے کہیں زیادہ مؤثر ثابت ہونے کا اِمکان ہے جب ہم یہ معلوم کرچکے ہونگے کہ کردار کا انحصار کن فزیالوجیکل حالات پر ہوتا ہے تو ہم جس اِنسان کو آج قابلِ تعریف سمجھتے ہیں اس سے کہیں بہتر اِنسان پیدا کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔ بلاشبہ سائنس کی بدولت، ذہانت، فنی صلاحیت اور فیض رسانی، کی خوبیوں میں اضافہ ہوگا۔ اگر سائنس کو دانش مندی سے استعمال کیا گیا تو ایک اچھی دُنیا تخلیق

کرنے میں یہ کتنی زبردست مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ میں یہیں کہیں اس خدشے کا اظہار کر چکا ہوں کہ لوگ سائنس کی طاقت کو نادانی سے بھی استعمال کر سکتے ہیں لیکن اس وقت میری توجہ اس اَمر پر مرکوز ہے کہ لوگ ''اچھا'' کرنا چاہیں تو وہ کیا کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت یہ زیرِ بحث نہیں کہ اگر وہ ''بُرا'' کرنا چاہیں تو کیا کر سکتے ہیں۔

اِنسانی زندگی پر سائنسی علم کے نفوذ کے بارے میں ایک مخصوص رویہ پایا جاتا ہے جس سے مجھے ہمدردی تو ہے اگرچہ میں اس سے آخری تجزیئے میں اتفاق نہیں کرتا۔ یہ اُن لوگوں کا رویہ ہے جو ''غیر فطری'' ہونے سے ڈرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ یورپ میں رُوسو Roussseau اس خیال کا زبردست حامی ہے اور ایشیاء میں لاؤزے Lao۔Tza دو ہزار چار سو سال قبل اس خیال کو زیادہ مؤثر انداز میں پیش کر چکا ہے۔ میرا خیال ہے فطرت کی اُن کی طرف سے تعریف میں سچ جھوٹ کی آمیزش پائی جاتی ہے اس لیے ان کو الگ الگ کرنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ یہیں سے آغاز کرتے ہیں کہ آخر یہ ''فطری'' ہوتا ہے کیا؟ لگ بھگ وہ جس سے بولنے والا اپنے بچپن میں مانوس ہوتا ہے۔ لاؤزے سڑکوں، باربرداری اور کشتیوں پر معترض ہے۔ یہ وہ تمام اشیاء ہیں جو شاید اُس گاؤں میں ناپید تھیں جہاں وہ پیدا ہوا۔ جبکہ رُوسو اِن چیزوں کو آغاز ہی سے دیکھنے کا عادی تھا۔ اسی لیے وہ انہیں غیر فطری قرار نہیں دیتا۔ لیکن بلا شُبہ اگر وہ ریولے کی آمد تک زندہ رہتا تو اس کی شدت سے مذمت کرتا۔ پکوان اور لباس اتنے قدیم ہیں کہ فطرت کے اکثر و بیشتر بڑے سے بڑے حامیوں نے کبھی اِن کی مذمت نہیں کی۔ اگرچہ اُن کے فیشن میں کسی بھی تبدیلی پر معترض رہتے ہیں۔ وہ تجرد کی زندگی کو برداشت کر رہے ہیں لیکن اُنکے نزدیک برتھ کنٹرول قابلِ مذمت ہے اس کی سادہ سی وجہ ہے کہ اوّل الذکر رواج چونکہ قدیم سے چلا آ رہا ہے لہٰذا وہ اس کے عادی ہو چکے ہیں جبکہ موخرالذکر جدید ہے اس لیے اس سے سمجھوتہ کرنے میں دُشواری پیش آتی ہے۔ قصہ مختصر فطرت کا پرچار کرنے والے بذاتِ خود فکری لحاظ سے تضادات کا شکار ہیں چنانچہ ان کو کنزرویٹیو قرار دیتے ہوئے نظرانداز کر دینا چاہیے۔

تاہم ان کے حق میں بھی تھوڑا بہت کہنے کے لیے کُچھ موجود ہے۔ مثال کے طور پر وِٹامنز کو لے لیں۔ ان کی دریافت سے سخت ردِعمل ہوا جس سے لوگوں میں فطری خوراک سے وِٹامنز لینے کا رجحان قائم رہا اور بس یہی کُچھ نیچریسٹوں کے حق میں کہا جا سکتا ہے۔ چونکہ فطری خوراک کے علاوہ بھی وِٹامنز کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وِٹامنز کی فراہمی مچھلی کے تیل اور الیکٹرک لائٹ سے حاصل ہوسکتے ہیں جو اِنسان کی فطری خوراک کے زمرے میں نہیں آتے۔ اس صورتِ حال سے ظاہر ہوتا ہے ''فطرت'' سے نئی علیحدگی علم کی غیر موجودگی میں غیر متوقع نقصان کا باعث بھی ہوسکتی ہے۔ جب نقصان

اور اس کی وجہ بھی معلوم ہو جائے تو پھر اس کے علاج کا مداوا انسان کی طرف سے ایک نئی طرح کی اختراع اور سعی سے ہو جاتا ہے گویا یہ انسان کی طرف سے فطرت میں مداخلت کے مترادف ہے۔ جہاں تک ہماری خواہشوں کی تکمیل کے لیے فزیکل ماحول اور فزیکل ذرائع کا تعلق ہے۔ میرا نہیں خیال ''نیچر'' کا اندازِ فکر سوائے مخصوص قسم کی تنبیہہ یا احتیاط کے علاوہ نئی اور عملی طور پر مفید راہیں اختیار کرنے کے لیے کسی قسم کا جواز فراہم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر لباس فطرت کے خلاف ہے۔ اگر بیماری سے بچنا درکار ہو تو اُس کا دھونا بھی ضروری ہے۔ ایک تو لباس فطرت کے خلاف ہے اور اوپر سے اُس کا دھونا فطرت کی دُہری خلاف ورزی لیکن یہ دونوں عوامل مِل کر اِنسان کو زیادہ صحت مند بناتے ہیں جبکہ جانور اِن دونوں چیزوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔

اِنسانی خواہشات سے متعلق ''فطرت'' کے بارے میں اور بھی بہت کُچھ کہنے کو ہے کسی مرد، عورت یا بچے پر ایسی زندگی مسلط کرنا جس میں اُن کے مضبوط ترین جبلتیں اور محرکات ہی دَب جائیں نہ صرف ظلم ہے بلکہ خطرناک بھی ان معنوں میں چند مخصوص شرائط کے ساتھ ''فطرت'' کے مطابق زندگی کا گذر قابلِ مذمت ہے۔ مثال کے طور پر زیرِ زمین ریلوے سے زیادہ مصنوعی چیز اور ہو ہی نہیں سکتی لیکن جب اس کے ذریعے بچے کو سفر کرایا جاتا ہے تو بچے کی فطرت کی کسی طرح بھی کوئی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے برعکس تمام بچے اس تجربے سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ اِنسان کی بنائی ہوئی اشیاء جو عام اِنسان کی خواہشات کی تکمیل کریں اچھی ہوتی ہیں بشرطیہ دیگر حالات جُوں کے تُوں رہیں۔ لیکن زندگی کے ان طریقہ ہائے کار کے بارے میں کُچھ نہیں کہا جاتا جو کسی حاکم یا معاشی ضرورت کے تحت مسلط ہوتے ہیں۔ زندگی کے اِس پہلو سے ایسے طریقہ ہائے کار موجودہ حالات میں کسی حد تک ضروری بھی ہیں۔ اگر بھاپ سے چلنے والے جہازوں یا کشتیوں میں کوئلہ ڈالنے والے نہ ہوں تو سمندری سفر بے حد دُشوار گزار ہو جائے۔ لیکن اس قسم کی ضرورتیں افسوسناک ہیں لہٰذا ایسے طریقہ ہائے کار کا تدارک لازم ہے۔ ایک خاص مقدار میں کام کوئی ایسی چیز نہیں جس سے شکایت پیدا ہو بلکہ دس میں سے نو حالتوں میں کام کرنا مکمل کاہلی سے کہیں زیادہ لُطف و سرور انگیز ہوتا ہے۔ لیکن عام لوگوں کو موجودہ حالات میں کام کی نوعیت اور اس کی مقدار کے حوالے سے جس کرب سے گذرنا پڑتا ہے بہت بڑی بدی کے مترادف ہے۔ مزید یہ کہ زندگی بھر کی معمول کی بندش اس سے بھی بدتر ہوتی ہے زندگی اتنی باقاعدہ نہیں ہونی چاہیے کہ وہ قوائد وضوابط میں جکڑی جائے۔ ہمارے اندر کے محرکات جب وہ یقینی طور پر دوسروں کے لیے تباہ کن یا نقصان دہ نہ ہوں تو لازم ہے کہ اُنہیں آزادانہ طور پر پھلنے پُھولنے دیا جائے۔ مزید براں نئی سے نئی اختراع اور مہم جوئی کی گنجائش بھی ہونی چاہیے غرض ہمیں اِنسانی فطرت کی ہر طرح سے پذیرائی کرنی چاہیے کیونکہ ہمارے اندر محرکات اور خواہشیں ایسا مواد فراہم

کرتی ہیں جس سے خوشی اور مسرت نے تشکیل پذیر ہونا ہے کوئی تصورات میں لپٹی ہوئی ناقابلِ تجسیم شئے جسے ہم ''اچھا'' کہتے ہیں لوگوں کو دینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اگر ہمیں ان کی خوشیوں اور مسرتوں میں اضافہ درکار ہے تو ہم پر لازم ہے کہ ان کو ایسی چیزیں فراہم کریں جو ان کی خواہشات اور ضرورتوں سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت سائنس ترقی کر کے وہ منزل بھی حاصل کر لے جس کے ذریعے ہماری خواہشیں اس پیرائے میں ڈھل جائیں کہ وہ دوسروں کی خواہشات سے اس حد تک متصادم نہ ہوں جس حد تک وہ اب ہیں۔ تب ہم آج کے مقابلے میں اپنی خواہشات کے بہت بڑے حصے کی تکمیل کے قابل ہو جائیں گے اور صرف تب ہی وہ ہماری خواہشات اچھی نوعیت کی گردانی جائیں گی۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ کسی بھی خواہش کو معاشرے سے الگ کر کے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کوئی بھی خواہش دوسری خواہش کے مقابلے میں نہ اچھی ہوتی ہے نہ بُری لیکن اُن تمام خواہشات کا وہ مجموعہ جس کی بیک وقت تکمیل ہو سکے اُن خواہشات کے مجموعے سے بہتر ہوتا ہے جس میں مختلف خواہشات ایک دوسرے سے متصادم ہوں۔ یہی وجہ ہے محبت نفرت سے بہتر ہوتی ہے۔

فزیکل نیچر کا احترام کرنا احمقانہ فعل ہے۔ البتہ فزیکل نیچر کا مطالبہ اور اس کی تحقیق اس پیرائے سے کی جانی چاہیے کہ یہ اِنسان کے مقاصد میں کس ممکن حد تک مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ جبکہ خود نیچر اِخلاقی اعتبار سے نہ اچھی ہوتی ہے نہ بُری اور جہاں فزیکل نیچر اور اِنسانی نیچر ایک دوسرے سے باہم اُلجھ جائیں جیسے کہ آبادی کے سوال پر ان کی موجودہ کیفیت ہے تو ہمیں جنگ، قحط، متعدی بیماریوں اور بڑھتی ہوا اِنسانی تخم ریزی کو مقدر سمجھ کر واحد حل تسلیم کرتے ہوئے فطرت کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دیوتاؤں کے فرمان نے اس معاملے کے فزیکل پہلو پر سائنس کے اطلاق کو بدی قرار دیا ہے۔ ان کے فرمان کے مطابق لازم ہے کہ اِنسانی پہلو پر اِخلاقیات کا نفوذ کرتے ہوئے پرہیز اور اجتناب کا اطلاق کریں۔ قطع نظر اس حقیقت کے کہ ہر شخص بشمول خدا جانتا ہے کہ اس فرمان کی پابندی نہیں ہو سکے گی تو پھر مانع حمل کی فزیکلِ ذرائع سے تدابیر کو کیوں اور کس طرح بدی قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں زمانہ قدیم سے تراشے ہوئے جواب کے سوا ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ باقی بچتا ہی نہیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ دیوتاؤں کی طرف سے فطرت کی خلاف ورزی اُتنی ہی بڑی ہے جتنی کہ برتھ کنٹرول کے نفاذ میں مطلوب ہوتی ہے۔ دیوتا چاہتے ہیں کہ اِنسانی فطرت کی خلاف ورزی ہو جو کامیابی سے ہمکنار ہو کر غم و الم، رقابت، تشدد کے رجحان میں اضافے اور اکثر و بیشتر پاگل پن کی صورت میں نمودار ہو۔ جبکہ میں فزیکل نیچر کی خلاف ورزی کو ترجیح دیتا ہوں۔ جس کی سادی سی نوعیت دھوپ یا بارش سے بچنے کے لیے چھتری یا کسی انجن میں بھاپ کے استعمال جیسی ہوتی ہے۔ اس مثال سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ نیچر کے مطابق چلنے کے اصول

کی تلقین کا اطلاق کس قدر مبہم اور غیر یقینی ہے۔

اب وہم وگمان کے بادل دن بدن جس تیزی سے چھٹ رہے ہیں اس سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ فطرت کے ساتھ اِنسانی فطرت بھی مفروضوں سے نجات پا کر ہمارے سامنے ایسے روپ میں ظاہر ہوگی جیسا کہ سائنس کے بخوبی استعمال نے اسے بنا رکھا ہے۔ سائنس کی مدد سے ہم اگلی نسلوں کو علم، تحمل اور ایسے کردار سے مزین کر سکتے ہیں جو ہم آہنگی اور بھائی چارہ پیدا کرے۔ غرض ایسی دُنیا تخلیق ہو سکتی ہے جہاں تصادم کا نام ونشان نہ ہو۔ جبکہ موجودہ حالات میں سائنس بچوں کو ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کی تعلیم دے رہی ہے۔ کیونکہ ہمارے اکثر و بیشتر سائنسدان اپنے عارضی مفاد کی خاطر پوری اِنسانیت کو داؤ پر لگانے کے لیے تُلے ہوئے ہیں۔ لیکن اس دور کا اس وقت خاتمہ ہوگا جب لوگ اپنے جذبات پر اس قدر حکمرانی کے قابل ہو جائیں گے جس قدر اُنہیں اس وقت بیرونی دنیا کی فزیکل فورسز پر حکمرانی حاصل ہے۔ تب ہی ہم حقیقی آزادی سے ہمکنار ہو پائیں گے۔

باب ۔۔۔ ۴

فانیت اور لا فانیت

اس سے پہلے کہ ہم اس بات پر تبادلہ خیال کریں کہ کیا ہم موت کے بعد بھی زندہ رہیں گے ہم پر جب تک یہ واضح نہ ہو کہ کچھ مخصوص معنوں میں کیا آج والا اِنسان وہی ہے جو کل تھا ہماری گفتگو مفید ثابت نہیں ہوسکتی۔ فلسفیوں کا خیال تھا کہ رُوح اور جسم کی شکل میں خاص مادی جو ہر موجود ہیں جو دن بدن اختتام پذیر ہوتے رہتے ہیں اور یہ کہ رُوح ایک دفعہ تخلیق ہو جائے تو وہ آئندہ ہمیشہ کے لیے برقرار رہتی ہے جبکہ جسم عارضی طور پر موت کی وجہ سے اس وقت تک کے لیے برقرار نہیں رہتا تا آنکہ حشر کے دن اُسے دوبارہ زندہ کیا جائے۔

اس اندازِ فکر کا یہ حصہ جو ہماری موجودہ زندگی سے متعلق ہے سِرے سے ہی غلط ہے جسم کا مادہ لحہ بہ لحہ غذائیت سے بھرپور غذا اور اُس کے ضیاع کے عمل کی بدولت تبدیلی کی حالت میں رہتا ہے اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی فزکس کے مطابق ایٹم با قائدہ تسلسل کے ساتھ وجود نہیں رکھتے یوں یہ کہنا کہ "یہ وہی ایٹم ہے جو چند منٹ پہلے وجود رکھتا تھا" بے معنی ہے۔ لہٰذا اِنسانی جسم کا تسلسل اُس کے ظہور اور رویئے کا معاملہ ہے نہ کہ مخصوص جوہر کا۔ یہی اُصول ذہن پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ ہم سوچتے ہیں، محسوس کرتے ہیں اور عمل کرتے ہیں لیکن افکار، احساسات اور اعمال کے علاوہ کوئی خاص وجود ذہن یا رُوح نہیں ہوتی جوان پر عمل پیرا ہو یا ایسی صورتِ حال میں سے گزرے یوں کسی شخص کا ذہنی تسلسل دراصل عادت اور یاداشت کا تسلسل ہوتا ہے۔ کل ایک شخص تھا جس کے احساسات میں یاد کر سکتا ہوں اور اس شخص کو میں خود اپنے کل کے حوالے سے زیرِ غور لاتا ہوں۔ لیکن درحقیقت کل کا میں خود صرف مخصوص ذہنی واقعات میں سے تھا جو اب یاد کیا جاتا ہے اور اُنکو ایک شخص (میں) کے حصے کے طور پر سمجھا جاتا ہے اُب اُنہیں یاداشت میں لا رہا ہے۔ قصہ مختصر سلسلہ و تجربات اور ان کے ساتھ جُڑی ہوئی یادداشتیں اور مخصوص مماثلتیں وہ عناصر ہیں جو ایک شخص کو تشکیل دیتے ہیں۔

اگر ہم یقین کر لیں کہ کوئی شخص موت کے بعد بھی موجود رہتا ہے تو ہمیں لازمی طور اس پر بھی یقین

کرنا پڑے گا کہ وہ یادداشتیں اور عادات جو کسی شخص کی تشکیل کرتی ہیں واقعات کی ایک نئی ترتیب میں دکھائی دیتیں رہیں گی۔

کوئی یہ ثابت ہی نہیں کر سکتا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ لیکن دلچسپ اُمر یہ ہے کہ یہ معلوم کرنا نہایت آسان ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہماری یادداشتیں اور عادات بالکل اُسی انداز سے ذہنی ڈھانچے کے ساتھ جُڑی ہوئی ہیں جس طرح کوئی دریا اپنی تہہ کے ساتھ جُڑا ہوتا ہے۔ دریا کا پانی اپنے بہاؤ کی وجہ سے ہمیشہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ پانی کا بہاؤ وہی راستہ جاری رکھتا ہے جو گذشتہ بارش کا پانی اپنی گھسائی اور رگڑائی کی وجہ سے بنا چکا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح گذشتہ واقعات ذہن کے اندر اپنی رگڑائی سے گذرگاہ کی پٹی تعمیر کرتے ہیں اور پھر ہمارے خیالات اسی پٹی پر رواں دواں رہتے ہیں۔ یہی یادداشت اور ذہنی عادات کا سبب ہے۔ لیکن بوقتِ موت ذہن بطور ڈھانچے کے تحلیل ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یادداشت بھی تحلیل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے برعکس سوچنے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ مثال کے طور پر اگر کہیں وادی ہو وہاں جب ایک ہولناک زلزلہ دریا کے راستے میں پہاڑ کھڑا کر دے تو ہم اس دریا کی گُذرگاہ کو وہیں پر قائم رہنے کی توقع نہیں کر سکتے۔ تمام یادداشتیں بلکہ یہ کہنا زیادہ دُرست ہوگا کہ تمام اذہان کا انحصار ایک خاص قسم کی انتہائی توجہ طلب خصوصیت پر ہے جو مخصوص قسم کے مادی ڈھانچوں کے علاوہ کہیں نہیں پائی جاتی اور وہ خصوصیت یہ ہے کہ باہم ملتے جُلتے واقعات کے تیزی سے وقوع پذیر ہونے کے نتیجے میں عادات کی صورت اِختیار کرنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر چمکدار روشنی سے پُتلیاں سکڑ جاتی ہیں۔ اگر آپ بار بار ایک شخص کی آنکھوں میں تیز روشنی کی چمک ڈالتے جائیں اور ساتھ ہی ایک گُونج دار گھنٹی بجاتے جائیں تو بالآخر نتیجہ یہ ہوگا کہ اکیلی وہ گھنٹی کی آواز ہی اس کی پُتلیوں کے سکڑنے کا باعث بن جائے گی۔ یہ دماغ اور اعصابی نظام کے بارے میں ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے اس سے مذکورہ مخصوص مادی ڈھانچے کی خصوصیت کے باہم ملاپ سے ہماری زبان کا استعمال اور اس کے ردِعمل کے طور پر ہماری یادداشت اور جذبات کا اُبھرنا، ہماری اِخلاقی یا بد اِخلاقی پر مبنی عادات اور رویوں کی وضاحت بھی ہوتی ہے اور ساتھ ہی یہ سب عناصر مِل کر شخصیت کی ذہنی تشکیل بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس میں وہ حصہ شامل نہیں جو موروثیت متعین کرتا ہے یہ وہ حصہ ہے جو آئندہ نسلوں کو منتقل ہوتا ہے تاہم یہ حصہ بھی فرد کے جسم کے بکھرنے سے قائم نہیں رہ سکتا۔ ہمارے تجربات یہی ظاہر کرتے ہیں کہ دونوں قسم کے یعنی موروثی حصہ اور وہ حصے جو شخصیت سے متعلق ہوتے ہیں مخصوص جسمانی ڈھانچوں کی خصوصیت سے جُڑے ہوتے ہیں۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ ذہن کو چوٹ لگ جائے تو ساری یادداشت جاتی رہتی ہے Emcophalitis Lethargica (ایک کیمیکل) سے ایک متقی اور پرہیزگار کو بدکردار شخص میں تبدیل کیا جا

سکتا ہے اور ایک ہوشیار اور چالاک بچہ ایوڈین کی کمی سے احمق بن سکتا ہے۔ ان تمام ملتے جلتے حقائق کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بوقت موت سر کے مکمل تباہی کے بعد ذہن کا باقی بچ رہنا بعید از قیاس ہے۔ لہٰذا اس مضمون کے آغاز میں بیان کیے گئے دلائل مناسب نہیں ہیں لیکن ایسے جذبات ضرور ہیں جو مستقبل کی زندگی کے بارے میں عقیدہ تخلیق کرتے ہیں۔

موت کا خوف ان سب جذبوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے جو جبلی اور بائیولوجیکل اعتبار سے مفید بھی ہے اگر سنجیدگی اور دِل وجان سے زندگی کے بعد زندگی پر ہمارا ایمان ہو تو ہمیں قطعی طور پر موت سے کسی بھی قسم کا خوف نہیں ہونا چاہیے اور اگر حقیقت میں ایسا ہو جائے (جبکہ ایسا نہیں ہوتا) تو اس کے اثرات بڑے عجیب وغریب ہوں گے کیونکہ آئندہ کی زندگی کے بارے میں ایسی سہانی تصویر کشی کی جاتی ہے کہ ہم میں سے اکثریت موجودہ زندگی کو افسوسناک قرار دینے لگیں گے۔ لیکن ہمارے اِنسانی اور کم تر درجے کے غیر اِنسانی آباؤ اجداد نے اپنی جرأت سے استفادہ کرتے ہوئے کروڑوں سال پر محیط جنگ میں اپنے تمام دُشمنوں کا قلع قمع کر دیا اور یوں جرأت ایک ایسا عنصر ہے جس کی بدولت بقاء کی جدوجہد میں کئی ایک مواقع پر موت کے فطری خوف پر قابو پانے میں کامیاب رہے۔ جانوروں اور جنگلی وحشیوں میں جبلی طور پر اس مقصد کے لیے جنگجو یانہ تُند خوئی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ لیکن ترقی کے ایک خاص مرحلے پر سب سے پہلے مسلمانوں نے لوگوں میں جنگجو یانہ تُند خوئی کو بڑھا کر جنت کے عقیدے کی زبردست فوجی اہمیت کو ثابت کیا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ایک طرف تو جنگ باز لافانیت کے عقیدے کو فروغ دینے میں کامیاب رہے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی اہتمام کرتے رہے ہیں کہ کہیں یہ عقیدہ ضرورت سے اتنی زیادہ شدت اِختیار نہ کر جائے کہ لوگ دُنیاوی امور سے بالکل ہی بیگانہ ہو جائیں۔

اِنسان کی اپنی شان وشوکت کی حد سے زیادہ تعریف کا جذبہ بھی لافانیت کے عقیدے کو بڑھاوا دیتا آ رہا ہے۔ اس سلسلے میں بشپ آف برمنگھم کہتے ہیں کہ ''اِنسان کا ذہن اتنا لطیف اور عمدہ ہے کہ آج تک اس سے بہتر چیز اس دُنیا میں منظر عام پر نہیں آئی۔ وہ اچھے اور بُرے میں تمیز کر سکتا ہے۔ وہ ویسٹ منسٹر میں راہبوں کی اقامت گاہ تعمیر کر سکتا ہے۔ ہوائی جہاز بنا سکتا ہے اور تو اور وہ زمین سے سورج تک کے فاصلے کو بھی ناپ سکتا ہے۔ تو پھر بوقت موت کیا وہ مکمل طور پر نیست ونابود ہو جائے گا اور کیا اس کے جسم کے ساتھ اُس لاثانی ذہن (رُوح) کا بھی قلع قمع ہو جائے گا۔''

بشپ اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اس کائنات کا تعین ذہانت سے بھرپور عزم اور منشاء کے مطابق کیا گیا ہے اور یہ اَمر نہایت غیر دانش مندانہ ہوگا کہ اِنسان کو محض اِس لیے بنایا جائے تا کہ اُسے فنا ہونے دیا جائے۔''

اس دلیل کی کئی وجوہات ہیں سب سے پہلے تو یہ ہے کہ فطرت کے بارے میں سائنسی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اخلاق اور جمالیاتی ذوق کی مداخلت ہمیشہ سے دریافتوں کی راہ میں حائل رہی ہے ماضی میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اجرام فلکی لازمی طور پر ایک دائرے میں گھومتے ہیں کیونکہ دائرہ ہی اپنی کامل شکل یعنی خمیدگی کا حامل ہوتا ہے اور لازم ہے کہ تمام جیون ناقابلِ تغیر و تبدل اور ایسے کامل ہیں جن میں بہتری کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی اور یوں متعدی بیماریوں سے (سوائے توبہ استغفار کے) لڑنا فضول ہے۔ کیونکہ یہ سزا کے طور پر نازل ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تاہم جہاں تک ہمارے مشاہدے کا تعلق ہے اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ فطرت اپنے رویئے کے اعتبار سے ہماری قدروں سے بے نیاز ہے اور جب تک ہم اپنے اچھائی اور برائی کے تصورات کو ایک طرف نہ رکھ دیں اس وقت تک اس کے بارے میں ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں ہوسکتا ہے اس کائنات کے بنائے جانے میں کوئی مقصد ہو اور ہمارا اس کے بارے میں کچھ نہ جاننا ہمیں یہ باور کراتا ہے کہ اس کا مقصد خود ہمارے مقاصد سے مطابقت رکھتا ہے نہ ہی اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو ہمارے لیے حیرانگی کا باعث ہے۔ لیکن ڈاکٹر برنز کا کہنا ہے کہ اِنسان "اچھائی اور برائی" کو بخوبی پہچانتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم بشریات کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ اچھائی اور برائی کے تصورات اتنے مختلف نوع ہیں کہ اُن میں سے کسی ایک کی بھی مستقل حیثیت نہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان اچھائی اور برائی کے درمیان تمیز کرسکتا ہے۔ لیکن یہ صرف اسی وقت ہوسکتا ہے جب کچھ لوگ ایسا کریں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کون لوگ کریں؟ نطشے ایسی اِخلاقیات کے حق میں دلائل دیتا ہے جو کرائسٹ سے بالکل مختلف ہیں کچھ طاقتور حکومتوں نے نطشے کی تعلیمات کو اپنا لیا۔ اگر اچھائی اور برائی کے بارے میں لافانیت کے حوالے سے علم مقصود ہو تو ہم پر لازم ہے کہ سب سے پہلے نطشے اور کرائسٹ کے درمیان کسی ایک کا انتخاب کریں کہ ان دونوں میں سے کس کا تعین کریں اور تب ہی یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ مسیحی لافانی ہیں جبکہ ہٹلر اور مسولینی قطعی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قضیے کا حل مطالعہ کی بجائے میدانِ جنگ میں ہی ہوسکتا ہے اور پھر جس فریق کے پاس زیادہ بہتر اور مہلک ہتھیار ہونگے وہی لافانی ہوگا۔

نیکی اور بدی کے موضوع پر ہمارے احساسات اور عقائد ہر شئے کی طرح ہمیں سے متعلق ہیں۔ وہ فطری حقائق جو بقاء کی جدوجہد کے نتیجے میں نمودار ہوتے ہیں ان کی نوعیت نہ تو آسمانی ہوتی ہے اور نہ ہی اُن کا مخرج ماورائے فطرت آئیسوپ Aesop ایک حکایت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک شیر کو ایسی تصویریں دکھائی گئیں جن میں شکاری شیروں کو پکڑ رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہوئے شیر بولا کہ اگر اس نے یہ تصویریں پینٹ کی ہوتیں تو وہ ان میں شیروں کو شکاری پکڑتے ہوئے دکھاتا ڈاکٹر برنز کے مطابق اِنسان بے مثل ہے۔ کیونکہ وہ ہوائی جہاز بنا سکتا ہے۔ تھوڑا عرصہ ہوا ہے ایک گانا لوگوں

میں بڑا مقبول ہوا جو مکھیوں کی چالاکی کے بارے میں تھا۔ بہت سی مکھیاں ہوا میں نیچے اُوپر اُڑتے ہوئے باہم مل کر کچھ یوں گا رہی تھیں ۔ کیا لائڈ جارج بھی ایسے اُڑ سکتا ہے؟ کیا مسٹر بالڈوِن اس طرح اُڑ سکتا ہے۔ بلکہ کوئی بھی اِنسان نہیں اُڑ سکتا ''تو ہم بے مثل ہیں'' مکھیوں کے اس عمل کی بنیاد پر کوئی مذہبی رجحان رکھنے والی بزرگ مکھی کوئی بڑا معنی خیز قسم کا ایسا قول تراش سکتی ہے جو باقی مکھیوں میں اتنی مقبول ہو جائے کہ وہ تقدس کا درجہ حاصل کر لے۔

مزید یہ کہ ایسا تبھی ہوتا ہے جب اِنسان کے بارے میں تصوراتی اندازِ فکر کے ساتھ خیال آرائی کی جائے۔ اگر ٹھوس اور قطعی انداز میں لوگوں سے رائے لی جائے تو ان میں سے اکثریت کی یہ رائے ہو گی کہ اکثر و بیشتر لوگ بہت بُرے ہوتے ہیں بڑی بڑی مہذب ریاستیں ایک دوسرے کے شہریوں کو ہلاک کرنے پر تلی ہوئی ہیں اس مقصد کے حصول کے لیے اُنھوں نے اپنی آمدنی کا نصف وقف کر رکھا ہے۔ اگر تاریخ پر سرسری سی نگاہ ہی ڈال لیں تو معلوم ہو گا کہ وہ اِخلاقیات کے جذبے سے سرشار اِنسان نُما حیوانوں کے ہاتھوں روشن خیالوں اور ناستکوں پر بے پناہ تشدد کے علاوہ یہودیوں اور مختلف مکتبہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والوں کی وقتاً فوقتاً تھوک کے حساب سے قتل و غارت سے بھری پڑی ہے۔ یہاں میں خود کو یہ فرض کرنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ اس ساری بربریت کو ڈاکٹر برنز کے پُرجوش ساتھی جائز سمجھتے ہیں کیونکہ وہ ایسے عقیدے کو جس کے تحت تشدد اور جنگ کا کوئی جواز ہی نہیں غیر مسیحی جانتے ہیں۔ کیا اس خباثت اور گھناؤنے اندازِ فکر کو جس کے تحت اُن کا طرزِ عمل وقوع پذیر ہوتا ہے ایک ذہین خالق کے ہونے کی شہادت کو کافی سمجھا جائے؟ تو کیا ہم سوچ بھی سکتے ہیں یا ایسی خواہش کا گمان بھی کر سکتے ہیں کہ جو اِنسان اس طرح سے عمل پیرا ہوں ہمیشہ کے لیے زندہ رہیں؟ اس دُنیا کو جس میں ہم زندہ ہیں کو اُلٹ پھیر اور ہلچل کی حالت اور حادثات کے نتائج سے ہی ہم سمجھ سکتے ہیں اور اگر یہ دُنیا کسی منشاء کا نتیجہ ہے تو لازم ہے کہ وہ منشاء کسی شر انگیز کی ہو گی۔

باب ــــ ۵

مادام ایسا بالکل نہیں ہوتا

"یہ مضمون 1899 میں لکھا گیا اس سے قبل اس کی اشاعت نہیں ہو پائی اس کو اب اُسی طرح پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو خود اس کی اپنی تاریخی حیثیت ہے اور دوسرے یہ کہ اس میں رَسل کی طرف سے ہیگل کے فلسفہ سے پہلی دفعہ بغاوت کا اظہار ہوا۔ وہ جبکہ ابتدائی دِنوں میں کیمرج میں زیرِ تعلیم تھا۔ اگرچہ اُن دِنوں اس کی طرف سے مذہب کی مخالفت اتنی گہری اور واضح نہ تھی جتنی کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد نُمایاں ہوئی۔"

اُن دِنوں جب فلسفے کا حجم بہت بڑا تھا اور مزید پھل پھول بھی رہا تھا۔ فلسفہ اِس کے شیدائیوں کے لیے طرح طرح کی خدمات سرانجام دیا کرتا تھا۔ مثلاً ابتداء میں اطمینان بخشنا، دانشورانہ شکل میں وضاحت فراہم کرنا اور اِخلاقی پریشانی میں راہنمائی عطا کرنا۔ اس میں حیرت کی بات نہیں جب اس کے استعمال کی ایک مثال چھوٹے بھائی کو بتائی گئی تو اس نے اپنی جوانی کے جوش میں یہ اشعار کہے

فلسفہ ایک مقدس اور انتہائی پُرکشش چیز ہے
نہ ہی یہ کھردرا ہے نہ ہی ناخوشگوار ہے
نہ یہ ٹیڑھا میڑھا ہے جیسا کہ کُند ذہن غبی فرض کر لیتے ہیں
یہ تو سُریلا میٹھا موسیقی سے بھرپور اپالو کی بانسری کی طرح ہے

لیکن اب وہ خوشگوار زمانہ ماضی کا حصہ ہو چکا ہے۔ کیونکہ فلسفے کی اپنی اولاد (علم کے مختلف شاخیں) بتدریج فتوحات کے ذریعے ایک ایک کر کے اس کے حقوق غصب کر رہی ہے۔ دانشورانہ مشکلات

کے ایک بڑے حصے کو سائنس پہلے ہی اپنی گرفت میں لے چکی ہے۔ فلسفے کی تشویش کے وہ استثنائی سوالات جن کے جواب کے لیے فلسفہ اپنی کوششوں میں مصروف ہے لوگوں کی اکثریت اُنہیں سیاہ اَدوار کی باقیات قرار دیتی ہے جبکہ اب وہ سوالات بھی تیزی سے سائنس کے سخت جبڑوں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ جہاں تک اِخلاقی اُلجھنوں کا تعلق ہے انہیں ابھی حال ہی میں خود فلسفیوں نے اپنے دائرہ حکمرانی کے سپرد کیا تھا اب اسے ترک کر کے علم شُماریات اور عام فہمی کی ترنگ کے سُپرد کر دیا گیا ہے۔ لیکن اطمینان اور سکون فراہم کرنے کا اِختیار بقول مِکگارٹ اب بھی اسی بے اِختیار فلسفے کو ہی حاصل ہے۔ یہی وہ آخری اثاثہ ہے جو اس کے قبضہ قدرت میں باقی رہ گیا ہے۔ آج شب چاہوں گا کہ جدید دیوتاؤں (جدید عُلوم) کی ضعیف و ناتواں ماں سے اِسے بھی چھین لُوں۔

پہلی نظر میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ بڑی آسانی اور اختصار کے ساتھ حل ہو جائے گا۔ مِکگاٹ کا کہنا ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ فلسفہ اطمینان بخشتا ہے۔ کیونکہ یہ میرے لیے یقینی طور پر سکون کا باعث ہے۔ تاہم میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ ایسے نتائج جو اُسے اطمینان بخشتے ہیں خود اس کے دعوے کے برعکس ہیں جو بلاشُبہ حقیقت میں اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں صرف اس وجہ سے کہ یہ اس کے لیے اطمینان کا باعث بنتے ہیں۔

میں یہاں فلسفے کی سچائی زیرِ بحث نہیں لانا چاہتا۔ بلکہ میں تو صرف اس کی جذباتی قدر پر ہی بات کروں گا۔ اس سلسلے میں ایک ایسے تصور کو درست باور کروں گا جس کا انحصار حقیقت اور اس کی ظاہری شکل و صورت میں فرق پر ہے۔ جبکہ اوّل الذکر وقت سے ماوراُ کُلی طور پر کامل ہو۔ اس قسم کے تصور کے اُصول کا مطلب مختصر الفاظ میں یوں ہے کہ خدا عالم بالا میں بڑے آرام و سکون سے ہے جبکہ دُنیا برائی سے اَٹی پڑی ہے لیکن یہ فرض کر لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چُونکہ وہ عالم بالا میں ہے اور ہمیشہ وہیں رہتا رہا ہے تو ہم توقع کر سکتے ہیں کہ ایک دِن ضرور آئے گا کہ جب وہ زمین پر اُتر آئے اور اگر وہ یہ جانچنے کے لیے نہ بھی آئے کہ آیا اس کا آخر ہو چکا ہے یا کُچھ باقی ہے تاہم وہ فلسفیوں کو اُن کے یقین کی بناء پر انعام و اکرام سے ضرور نوازے گا۔ اس کی دُنیاوی معاملات سے طور یل بے خبری اس کی ضبط نفس کی دلالت کرتا ہے۔ جس سے اپنی اُمیدیں وابستہ کرنا جلد بازی کے مترادف ہے۔

لیکن اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو ایسے اندازِ فکر کی جذباتی قدر جس کے تحت ابتلاء میں سکون میسر ہو تو اس کا انحصار مستقبل کے بارے میں پیشن گوئی پر ہے۔ جذباتی انداز میں ذکر کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل ماضی سے زیادہ اہم ہوتا ہے بلکہ حال سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے جیسے کہ آفاقی عام فہمی پر مبنی رجائیت کے بارے میں یہ قول ہے کہ جس کا انجام اچھا تو سب اچھا۔ حتیٰ کہ حال کے بارے میں بھی ایسا ہی

سُنتے آئے ہیں کہ اکثر بوریت سے شروع ہونے والے سویروں کا انجام خوشگوار دِنوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اِسے رجائیت کہتے ہیں جبکہ یاسیت کے مطابق

''میں نے رنگوں سے بھری کئی شاندار صبحیں دیکھیں
جو الہامی نظر سے پہاڑیوں کی چوٹیوں پر پھڑ پھڑاتی ہیں
اور اپنے سُنہرے منہ سے سرسبز مرغزاروں کو چومتی ہیں
ملمع کاری کی ہوئی سُنہری ندیاں آسمانی کیمیا کے ساتھ
اور وہ جلد ہی معمولی سے بادلوں کو آسمانی چہرے کے بھدے
ڈھانچے کیساتھ سوار ہونے کی اجازت دیتی ہیں اور موہوم
دُنیا سے اُسکا چہرہ چھپ جاتا ہے اور اس حسین منظر کیساتھ
اپنی سمت ملانے کے لیے غیر مرئی مناظر کو چراتی ہیں''

جذباتی طور پر کائنات کے بارے میں ہمارا انداز فکر اچھا ہوتا ہے یا بُرا اس کا انحصار مستقبل پر ہے ہمیں کسی ایک وقت میں اس کی ظاہری حالت سے ہی دلچسپی ہوتی ہے اور جب تک ہمیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ مستقبل حال سے اچھا ہوگا تو یہ سمجھ سے باہر ہوتا ہے کہ اطمینان کیسے ہو۔

مستقبل اُمیدوں سے اس قدر جڑا ہوا ہے کہ خود مِکگاٹ (جس کی اپنی اُمیدوں کا انحصار وقت کی نفی پر ہے) تکمیل کے بارے میں مستقبل کی صورتِ حال کے ذریعے عکاسی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے مثلاً اس کا کہنا ہے کہ ''کسی نہ کسی دِن ہم آہنگی ظاہر ہو کر رہے گی'' اس تضاد پر زور دینا اس پے زیادتی ہوگی کیونکہ اس حقیقت کا ادراک مجھے مِکگاٹ سے ہی ہوا ہے۔ کوئی بھی اطمینان جو ایسے اندازِ فکر سے پھُوٹے جس کے تحت حقیقت وقت سے بے نیاز ہو اور اچھی ہو۔ لیکن میں جس چیز پر زور دینا چاہتا ہوں کہ جو اطمینان ایسے طریقہ کار سے پیدا ہو کہ جب حقیقت وقت سے بے نیاز ہو اور یہ کہ ازل سے ابد تک اچھی ہو تو وہ اسی تضاد کی پیداوار ہوتا ہے۔ وقت سے بے نیاز حقیقت کا نہ ماضی سے تعلق ہو سکتا ہے اور نہ مستقبل سے اور اگر اس کی کامل شکل اب تک ظاہر نہیں ہوئی تو یہ فرض کرنا ہی محال ہے کہ کبھی ایسا ہوگا اور اس کا بھی پختہ اِمکان موجود ہے کہ خدا ہمیشہ آسمانوں پر ہی قیام پذیر رہے گا اور وہ کبھی نیچے نہ آئے گا۔ ہم آہنگی کے بارے میں بھی اتنی ہی دُرستگی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھی اب ہمیشہ کے لیے واضح ہو چکی ہے اور وہ یہ کہ ''میری خوشی قصہ پارینہ ہو چکی ہے آئندہ صرف غم ہی رہ گئے ہیں'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہمیں اس سے کسی قسم کا اطمینان حاصل نہیں ہوسکتا۔

ہمارے تمام تجربات وقت کیساتھ وابستہ ہوتے ہیں اس کا تصور ہی محال ہے کہ کوئی تجربہ وقت سے بے نیاز ہو اور اگر ایسا ہو بھی تو ہم بلا کسی تضاد کے حائل ہوئے بغیر فرض کر سکتے ہیں کہ ہمیں کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوگا یہ بات بھی طے ہے کہ کوئی بھی تجربہ جو فلسفے کی بنیاد پر ہو اس کی مشابہت اُسی سے ہوگی جسے ہم جانتے اور پہچانتے ہیں اور اگر ہمیں یہ بُرا لگے تب ہمیں حقیقت سے متعلق اندازِ فکر جو ظاہریت سے الگ ہو کسی قسم کی اُمید فراہم نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تب ہم دُہرے پن کے ایک ایسے گڑھے میں پھسل جاتے ہیں جس میں نا اُمیدی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایک طرف تو ایسی دُنیا ہمارے سامنے ہوتی ہے جسے ہم اچھی طرح جانتے ہیں یہ واقعات کے اعتبار سے بیک وقت خوشگوار بھی ہے اور ناخوشگوار بھی۔ اس میں ناکامی، تباہی، بربادی اور اموات بھی ہیں دوسری طرف ایک ایسی تصوراتی دُنیا ہوتی ہے جہاں ہم حقیقی دُنیا کو مسیحی لباس زیب تن کرواتے ہیں اور پھر حقیقت کی وسعت کے ذریعے اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ ہر قسم کا ایسا نشان مِٹ جائے جس سے ایسا محسوس ہو کہ حقیقت میں کوئی دُنیا موجود ہی نہیں۔ تو اب ہمارے پاس صرف یہی ایک بنیاد رہ جاتی ہے جو ہم تصور کی قوت سے تخلیق کیے ہوتے ہیں اور اُسے ہم یوں پیش کرتے ہیں کہ اگر سمجھ سکو تو یہی وہ حقیقی دُنیا ہے۔ لیکن جب اس تصورات کے تانے بانے پر تعمیر شدہ دُنیا کو ہم ایک ایسی دُنیا سے بے حد مختلف پاتے ہیں جس سے ہمارا روزمرہ کی زندگی سے واسطہ ہوتا ہے تب ہمیں اس نام نہاد حقیقت کی دُنیا سے کسی طرح کا بھی کوئی تجربہ نہیں ہوتا سوائے اس تجربے کے جس کا ہم تانا بانا بُنتے ہوئے پہلے ہی حاصل کر چکے ہوتے ہیں یوں موجودہ بُرائیوں کے پیشِ نظر خیالات کی دُنیا تخلیق کرنے سے کسی بھی قسم کی تسکین حاصل نہیں ہو سکتی مثال کے طور پر لافانیت کے ہی مسئلے کو لیں۔ ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ لافانی ہو اس کی بڑی وجہ بے پناہ ناانصافیوں کے ازالے کے لیے ہوتی ہے یا پھر موت کے بعد اپنے پیاروں سے ملنے کا اِمکان جبکہ اس دوسری وجہ کا احساس ہم سب کو ہوتا ہے اور اگر فلسفہ اس سلسلے میں کسی طرح ہمیں دلاسہ دے سکے تو ہم اس کے بے حد مشکور ہونگے۔ لیکن فلسفہ زیادہ سے زیادہ ہمیں یہ یقین دلا سکتا ہے کہ رُوح وقت سے بے نیاز ہوتی ہے۔ لیکن اس کا اپنا اِظہار کب ہو اس کا کُچھ علم نہیں لہٰذا موت کے بعد زندگی کا اندازِ فکر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور یوں موت کے بعد وجود ہونے کے اندازِ فکر سے بجا طور پر کوئی بھی نتیجہ اخذ نہیں ہوتا جان کیٹ John Keat چاہے کتنا ہی افسوس کا اظہار کرتا رہے۔

کہ اب میں کبھی بھی تمہیں نظر بھر نہیں دیکھوں گا۔
اور نہ ہی کبھی نامکمل محبت کی جادوئی طاقت کا مزا چکھوں گا
اور اگر اُسے یہ کہا جائے

یہ بھی سچ ہے کہ ماضی میں خوش اُمیدی پر مبنی مسیحیت سمیت سب نے جتنے بھی دعوے کیے اُن کی بنیاد یہ تھی کہ اس دُنیا پر نہایت مہربان اور شفیق خدا کی ابدی حکمرانی ہے اور یوں یہ تصوراتی اعتبار سے اچھا ہی ہے۔ لیکن اس کی تہہ میں یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ اس کا مقصد یہ باور کرانا ہوتا ہے کہ اس دُنیا کا انجام شاندار ہے مثال کے طور پر اچھے لوگ موت کے بعد بہت خوش رہیں گے آخر کار یہی نتیجہ نکالا جانا ہوتا ہے چاہے ایسا نتیجہ نکالا جانا کتنی ہی ناجائز بات ہوتا ہم اس سے بڑا اطمینان ملتا ہے کہ فلاں شخص بہت اچھا ہے اس لیے موت کے بعد وہ بہت خوش وخرم رہے گا۔

گو کہ خالی الفاظ کے ہیر پھیر سے یہ ثابت کرنا آسان ہے کہ دُنیا بہت اچھی ہے اور شاید اس سے کُچھ سکون بھی ملتا ہوتا ہم میرے نزدیک یہ انتہائی نا قابلِ قبول ہے۔ اگر یہ اندازِ فکر درُست بھی ہو تب بھی اس میں اطمینان دینے والی کوئی بات نہیں۔ میرے دلائل کا نچوڑ یہ ہے کہ وہ حقیقت جو تصورات کے تانے بانے سے تعمیر کی گئی ہو اس کا تجربے کی دُنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ تخیلاتی اور ایسی مجردسی ہوتی ہے جس سے کوئی مناسب نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا اور جو اس دُنیا سے مطابقت نہ رکھتا ہو جس کا ہمیں سامنا ہوتا ہے اور جس سے ہمارے مفادات وابستہ ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ دانش وارانہ مفادات بھی جن سے خود تصورات جنم لیتے ہیں اور جن سے خود ظاہری دُنیا کی وضاحت ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ اس ٹھوس حقیقی دُنیا کی معقولیت پر مبنی وضاحت کی جائے آئیڈیلسٹ اس کے بالکل برعکس اپنے تصورات کی مدد سے ایسی دُنیا تعمیر کرتے ہیں جو حقائق سے اتنی دور ہوتی ہے جن کا حقیقی تجربات سے کوئی واسطہ نہیں رہتا اسلئے روزمرہ کی زندگی غیر متاثر رہتی ہے دوسری طرف خیالات کے انبار اس طرح بڑھتے چلے جاتے ہیں کہ گویا حقیقی دُنیا کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یوں اگر کسی کو اس بات کی اجازت بھی مِل جائے کہ وہ فرض کر لے کہ حقیقت کی دُنیا بھی ہوتی ہے جو عالم بالا سے تعلق رکھتی ہے لیکن کہیں آسمانوں ہی میں واقع ہے تب یہ سوچ کر شاید اطمینان ہو جائے کہ چلو اگر ہم محروم ہیں تب بھی کوئی تو ہیں جنہیں کامل تجربہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ہمارا اپنا تجربہ ہی کامل ہے جس کے بارے میں ہمیں خود معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کام کا نہیں تب بھی ہم اندھیرے میں ہی رہتے ہیں کیونکہ یہ فلسفے پر پورا نہیں اُترتا اس لیے کہ آسمانوں پر رہنے والے خدا کو ہم ایک علیحدہ شخص قرار نہیں دے سکتے تب پھر ہم ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو جاتے ہیں جس میں ہمارا موجودہ تجربہ جس سے ہم گذر رہے ہوتے ہیں کامل ہے جس کا کُچھ بھی مطلب نہیں ہوتا۔ جس سے ہم خود کو کسی طرح بھی پہلے سے بہتر صورتِ حال میں نہیں پاتے۔ اس لیے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت کی دُنیا محض تصورات پر مبنی کتابوں میں پائی جاتی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی صورتِ حال ہو مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم فلسفے میں مذہب سے وابستہ اطمینان تلاش نہیں کر سکتے۔

ایسے بہت سے حوالے موجود ہیں جن کے تحت اس اَمر کی تردید ہوتی ہے کہ فلسفہ ہمیں کسی قسم کا اطمینان فراہم کرسکتا ہے اس کا اِمکان ہے کہ ہم کسی مظہر کو فلسفے کا لباس پہناتے ہوئے کچھ صبحیں بڑے اطمینان وسکون سے گزار لیں اس حوالے سے حاصل شدہ اطمینان کا اُن اطمینان بخش شاموں سے بخوبی موازنہ کر سکتے ہیں جو ہم پینے پلانے میں گذار دیتے ہیں اس طرح ہم اپنے حُسن ذوق کی خاطر اسپی نوزا Spinoza سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہم شاعری اور مابعدالطبعیات سے خوشگوار مزاج تخلیق کر لیتے ہیں تا کہ کائنات کے بارے میں کوئی نظریہ تراش لیں تا کہ زندگی کے بارے میں ایک خاص رویہ اِختیار کرنے میں مدد ملے جس سے پیدا شدہ ذہنی کیفیت کا جائزہ لیا جا رہا ہوتا ہے کہ جب شاعری کے جذبات اس نسبت سے اُبھرے نہیں ہوتے جو جانے مانے عقائد کی سچائی سے مطابقت رکھتے ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا اطمینان ایسے ہی مزاج کی دین ہے یوں مابعدالطبعیات کے ماہر کے دعوؤں کے عین برعکس ہماری تشفی ہوتی ہے۔ اس سے ایک ایسا اطمینان ہوتا ہے جس میں چند لمحوں کے لیے حقیقت کی دُنیا اور اس کی برائیوں کو بھول کر ہم خود اپنی پسندیدہ دُنیا تخلیق کر لیتے ہیں چنانچہ یہی وہ وجوہات ہیں جن کی بناء پر براڈلے Bradley مابعدالطبعیات کا جواز فراہم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''جب شاعری، فن اور مذہب میں دلچسپی ختم ہو جائے یا جب ان سے حتمی مسائل کو سمجھنے میں اُلجھن کا شکار ہو جائیں اور جب پُراسراریت اور وہم وگمان ذہن قبول کرنے سے انکار کر دے اور جب شفق میں کوئی کشش باقی نہ رہے تب پھر مابعدالطبعیات بیکار ہو کر رہ جاتی ہے''۔ مابعدالطبعیات ہم پر جس طرح اثر انداز ہوتی ہے اسی طرح عالمِ ارواح بھی اثر رکھتی ہے لیکن یہ نقطہ نظر اپنی قدر کے حوالے سے سچائی سے ماوراٗ ہوتا ہے لیکن اس کی یہ وجہ نہیں ہوتی کہ پرسپیر کا جادُو ہمیں عالمِ ارواح سے متعارف کرواتا ہے اور یہ بھی نہیں کہ جمالیاتی ذوق کے حوالے سے ہمیں عالمِ ارواح کی خبر ہوتی ہے یہی وہ مقام ہے جہاں جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوتی ہے جسے میں جائز قرار دیتا ہوں اور مذہبی سکون بھی ملتا ہے جس سے میں فلسفے کو محروم کرنا چاہتا ہوں جہاں تک جمالیاتی اطمینان کا تعلق ہے اس کے لیے دانش وارانہ یقین غیر ضروری ہوتا ہے اس لیے یوں جب ہم چاہیں مابعدالطبعیات کا انتخاب کر سکتے ہیں جس سے ہم جی بھر کے اطمینان حاصل کر سکتے ہیں ایک اور بات جو بڑی اہم ہے وہ یہ کہ مذہبی اطمینان کے حصول کے لیے عقیدہ ہونا لازم ہے۔ اس لحاظ سے میں قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جس مذہب پر ہمارا اعتقاد ہوتا ہے۔ مابعدالطبعیات کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور یوں ہمیں مذہب سے کسی قسم کا اطمینان نہیں ملتا کم یا زیادہ شدت سے صوفیانہ نظریہ اپناتے ہوئے اس کا اِمکان ہے کہ دلائل میں شگفتہ جذبات اور نازک خیالی کو متعارف کرائیں اور یہ بات بھی قطعیت کیساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگرچہ ہم کبھی کبھی ایسے بھرپور طریقے سے کُلی طور پر حقیقت کا

تجربہ نہیں کر سکتے جیسی کہ وہ دراصل ہے تاہم کچھ تجربات ایسے ضرور ہوتے ہیں جو دوسروں کے مقابلے میں حقیقت سے قریب تر ہوں لیکن ایسے تجربات فن اور فلسفے سے ہی حاصل ہوتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کے زیرِ اثر ایسا صوفیانہ اندازِ فکر اختیار کرلیا جاتا ہے جس سے بعض دفعہ فلسفے کے ذریعے اس دُنیا کا بدلا ہوا رُوح پرور منظر پیش کیا جاتا ہے جو اُن لوگوں کے لیے جو مابعدالطبعیات کے ہاتھوں جنون کی حد تک مغلوب ہوتے ہیں بے حد پسندیدہ اور مسحور کُن ہوتا ہے جیسے کہ براڈلے کا کہنا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف لوگوں کا مختلف ذرائع سے موجودہ دکھائی دینے والی دُنیا کے اُس پار جو کچھ بھی ہے اُس سے میل جول یا ارتباط موجود ہے اور کسی ایک طرح سے وہ ایک ایسی اعلیٰ وارفع شئے پاتے ہیں۔ جو بیک وقت ہماری تائید بھی کر رہی ہوتی ہے اور تحقیر بھی ہمیں اعتدال میں بھی رکھتی ہے اور سہارا بھی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ مخصوص لوگوں کے لیے یہی وہ سب سے اہم طریقہ ہے جس سے اُنہیں دیوتا کا تجربہ ہوتا ہے یوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے حتمی سچائی پانے کی جستجو کرنے کے لیے یہ ایک دوسرا سبب بھی ہے۔

ممکن ہے کہ جس خیال کی میں وکالت کر رہا ہوں شاید بہت سے لوگوں کو اپنی چمک دمک کے اعتبار سے دُھندلا دکھائی دیتا ہو لیکن جیسا کہ ایک محاورہ ہے کہ ''جب ہر شئے گل سڑ جائے تب یہ اِنسان کا کام ہوتا ہے کہ خرابیِ بسیار کا چرچا ضرور کرے'' لیکن میں یہ ضرور باور کرانے کی کوشش کروں گا کہ جب مابعدالطبعیات مذہب کی تائید کرنا شروع کردے تو یہ اُس کی بہت بڑی غلطی ہوتی ہے کیونکہ جب وہ ایسا کرتی ہے تو بذاتِ خود برائی کا روپ دھار لیتی ہے۔ لہٰذا یہ کیوں نہ تسلیم کرلیا جائے کہ مابعدالطبعیات بھی سائنس کی طرح دانش وارانہ جُستجو کو بڑھاوا دینے میں مددگار ثابت ہوتی ہے؟ لازم ہے کہ ہم یہ تسلیم کریں کہ جب ہم مابعدالطبعیات سے ہی اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہم خواہ مخواہ فضول قسم کے دلائل میں گھر کر دانش وارانہ بددیانتی کے مرتکب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسلئے مذہب کو خیرباد کہنے ہی میں خیریت ہے اس پس منظر میں جن لوگوں میں دانشورانہ جستجو قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے اس کا قوی اِمکان ہے وہ ہر قسم کی توہم پرستی سے آزاد ہو جائیں۔ میں ایک دفعہ پھر بارڈلے کا حوالہ دیتا ہوں اس کا کہنا ہے کہ'' ایک ایسا شخص جس کی فطرت ہی ایسی ہو کہ جب اُس کی اعلیٰ ترین خواہش کی تکمیل کے لیے محض ایک ہی راستہ ہو۔ وہ راستہ جیسا بھی ہو اور دُنیا اُس کے بارے میں کیسی ہی رائے رکھتی ہو وہ اُسی راستے پر گامزن ہونے کی کوشش کرتا ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ خود قابلِ مذمت ہے۔''

باب ۔۔۔ ۶

کُچھ کیتھولک اور

پروٹسٹنٹ منحرفین کے بارے میں

کوئی بھی شخص جس کا واسطہ مختلف مما لک سے تعلق رکھنے والے اُن آزادخیال لوگوں سے رہا ہو جن کا ماضی ایک دوسرے سے مختلف رہا ہو اور جو کیتھولک یا پروٹسٹنٹ تھے اُنکے درمیان فرق محسوس کر کے ششدر رہ جائے گا چاہے وہ اُس مذہب سے کتنے ہی دُور کیوں نہ ہو گئے ہوں جو اُنہیں بچپن میں پڑھایا یا سکھایا گیا تھا۔ یہ فرق خود آزدخیال لوگوں کے درمیان اُتنا ہی نُمایاں ہے جتنا کہ خود کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مذہب کے پیروکاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کے بنیادی اختلافات کو دریافت کرنا شاید بہت آسان ہوگا کیونکہ وہ بظاہر لگے بندھے نظریات کے پردوں میں چھپے ہوئے نہیں ہوتے۔ اگرچہ تھوڑی سی مُشکل ضرور پیش آسکتی ہے کیونکہ پروٹسٹنٹ ناستک حضرات کی اکثریت انگریزوں یا جرمنوں جبکہ کیتھولک ناستک زیادہ تر فرانسیسیوں پر مُشتمل ہوتے ہیں۔ انگریز جو گِبن کی طرح فرنچ خیالات سے قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے کیتھولک آزادخیالوں کی خصوصیات کے حامل ہو جاتے ہیں چاہے اُن کی شروعات بطور پروٹسٹنٹ ہی کے کیوں نہ ہوں۔ تاہم اختلافات اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ لیکن یہ کہ وہ اختلافات کس نوعیت کے ہوتے ہیں اُنکو جاننے کی کوشش کرنا دِلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں جیمز مِل بطور پروٹسٹنٹ ایک مکمل نمائندہ مثال ہے۔ اس کے بیٹے کا اپنی سوانح عمری میں یہ کہنا ہے کہ ''میرے والد نے پریسبیٹیرین چرچ کے زیر اثر تعلیم پائی۔ انہوں نے ابتدائی دنوں میں ہی اپنے طور پر مطالعے اور اس سے پیدا شدہ خیالات کے ذریعے نہ صرف وحی کے نزول کو مسترد کر دیا بلکہ اُن بنیادوں کو بھی رَد کر دیا جنہیں عام طور پر فِطری مذہب کہا جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے خیال کے برعکس میرے والد کی طرف سے مذہبی عقیدے کا استرداد منطق اور مشاہدے کی بنیاد پر نہ تھا۔ بلکہ اُس کی بنیاد کچھ تو اخلاقی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اُس کی اپنی دانشمندی تھی اس کے لیے یہ تسلیم کرنا ناممکن تھا کہ برائیوں

سے اُٹی ہوئی اس دنیا کو بنانے والا ایسا بے پناہ طاقت اور قوت والا ہو سکتا جس کے ساتھ کامل راست بازی سچائی اور اچھائی وابستہ ہو۔ اس کی مذہب سے نفرت لیوکریٹس کی طرح کی تھی اس کا مذہب کے بارے میں احساس محض ذہنی مغالطہ نہ تھا بلکہ یہ ایک بہت بڑی برائی تھی یہ میرے والد کے نظریہ کے خلاف ہوتا کہ میں مذہب کے بارے میں کوئی ایسا تاثر قائم کرلوں جو اس کے عقائد اور احساسات کے برعکس ہو۔ اس نے ابتداء ہی میں مجھے ذہن نشین کرادیا تھا کہ اس دُنیا کی تخلیق ایک ایسا موضوع ہے جس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا'' لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ وہ پروٹسٹنٹ ہی رہا۔ اس کے بیٹے نے مزید لکھا کہ ''وہ مجھے تحریک اصلاح کلیسا کے بارے میں بہت زیادہ توجہ دینے کی تلقین کرتے رہے اور کہتے کہ یہ تحریک دراصل پاپائیت کے جبر کے خلاف آزادی خیال کی جدوجہد ہے۔''

یوں جیمز مل جان کنوکس کے جذبے کی تکمیل کر رہا تھا اگرچہ وہ ایک انتہا پسند فرقے سے تعلق رکھتا تھا مذہب میں بڑی دلجمعی سے دلچسپی لیتا جو کہ اس کے پیشرووں کی شناخت تھی۔ اس کے باوجود کیتھولک کے مقابلے میں پروٹسٹنٹ کا ایمان نہ رکھنے سے شروعات کرنا ہی اُنکا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی ایک عقیدے کو اُتار پھینکنا گویا یہ تحریک کا مزید ایک قدم آگے بڑھنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اخلاقی جوش و خروش بنیادی نچوڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔

پرٹسٹنٹ اور کیتھولک اخلاقیات میں صرف ایک نُمایاں فرق ہے۔ پروٹسٹنٹ کے نزدیک وہی آدمی اچھا ہوتا ہے جو حکام کی مخالفت کرتا ہو۔ اچھائی کا پروٹسٹنٹ تصور انفرادی اور الگ تھلگ نوعیت کا ہوتا ہے۔ میری اپنی تعلیم پروٹسٹنٹ ماحول میں ہوئی اور مجھے اپنی نوجوانی میں بڑے طویل عرصے تک ایک ہی فقرے نے متاثر کیے رکھا کہ ''تم ہرگز برائی کے لیے ہجوم کی پیروی نہ کرو گے'' آج بھی اگر میں سنجیدگی سے کسی کاروائی کے سلسلے میں کوئی قدم اُٹھاتا ہوں تو یہ متن میرے زیرِ غور رہتا ہے۔ جبکہ کیتھولک لوگوں کا نیکی کے بارے میں تصور عاجزی سے عبارت ہے۔ یہ عاجزی نہ صرف خدا کی آواز کے لیے ہوتی ہے جس کا نزول ضمیر کے اندر ہوتا ہے بلکہ اُس چرچ کی حاکمیت کے لیے بھی ہوتی ہے جو الٰہیات کے مجموعے کا رکھوالا ہوتا ہے۔ اسی بناء پر ایک کیتھولک کو پروٹسٹنٹ کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسیع سماجی نوعیت کی نیکی کا تصور ملتا ہے یوں چرچ سے اُسکا تعلق منقطع ہو جائے تو اُسے خاصا بڑا دھچکا لگتا ہے۔ جبکہ ایک پروٹسٹنٹ کے لیے (جس فرقے میں بھی جنم لے اور پرورش پائے) اپنے فرقے سے لاتعلقی کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوتا کیونکہ اُس فرقے کے بانیوں نے کوئی بہت عرصہ نہیں گزرا ہوگا۔ یہی کیا تھا اور پھر اُس کی ذہنیت فوراً ہی نئے فرقے کی بنیاد سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ جبکہ کیتھولک چرچ سے علیحدہ ہونے والا شخص چرچ کے اعانت سے محروم ہونے کی وجہ سے خود کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ فری میسن جیسے کسی بھی ادارے میں شامل

ہوسکتا ہے لیکن وہ ایسا کرتا نہیں بلکہ وہ تشنگی اور بغاوت جیسے جذبے میں مبتلا رہتا ہے۔ عام طور پر وہ اس بات سے متفق رہتا ہے کہ اخلاقی زندگی چرچ کے ارکان کا ہی خاصا ہوسکتا ہے۔ اِس حوالے سے، کسی آزاد خیال کے لیے یہ ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کسی اعلیٰ ترین نیکی کا حامل ہو اور پھر یہ یقین اُس کو اس کے مزاج کے مطابق کہیں بھی لے جاسکتا ہے۔ اگر وہ خوش مزاج واقع ہو تو ولیم جیمز کی طرح سمجھتا ہے کہ چلو اخلاق سے خلاصی ہوئی اور پھر وہ اپنے کام میں جت جاتا ہے۔ مونٹیگنی اس سلسلے میں بہترین مثال ہے اس نے تو خود کو دانشورانہ سوچ بچار سے ہی الگ کرلیا۔ اُسے استخراجی طریقہ کار سے ہی نفرت ہوگئی۔ جدید دور کے لوگوں کو یہ احساس ہی نہیں کہ تحریک احیائے علوم کس حد تک عقل و دانش کی دُشمن تھی قرون وسطیٰ میں چیزوں کو ثابت کرنے کا رواج تھا جبکہ تحریک احیائے علوم نے چیزوں کو جانچنے کے لیے مشاہدے کو فروغ دیا۔ مونٹیگنی کو فلسفے کے صرف اُس طریقہ کار سے ہی دلچسپی تھی جس میں عمومیت سے آغاز کرتے ہوئے کسی مخصوص کی طرف منفی نتیجہ نکالا جائے۔ مثال کے طور پر وہ کہتا ہے کہ جنہوں نے ایریئس کی طرح وفات پائی وہ سب ملحد نہیں تھے اس کے بعد وہ بہت سے بڑے لوگوں کے نام گنواتا ہے جنہوں نے مذکورہ انداز سے ہی وفات پائی تو پھر کیا! آئرئیس کو بھی ایسی ہی قسمت کا سامنا ہوا۔ چونکہ خدا کی منشا یہی ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو نہیں چاہتا ہدایت نہیں دیتا اور یہ کہ اچھائی میں ضرور کوئی ایسی چیز موجود ہے جس سے اُمید کی جائے جبکہ بدی سے خوف منسلک ہوتا ہے'' ایسا پسند و ناپسند کا نظام کیتھولک آزاد خیالوں کے نزدیک قابل نفرت رہا ہے اور یہی بات پروٹسٹنٹوں کے برعکس اُن کی خصوصیت ہوتی ہے اس کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے کہ کیتھولک مذہبی فلسفے میں اتنا رُعب اور دبدبہ موجود ہے جو کسی فرد کو اس سے علیحدہ ہونے کی اجازت نہیں دیتا جب تک کے فرد میں خود اتنا غیر معمولی حوصلہ نہ ہو کہ اُس کے مقابلے میں اپنی اخلاقیات کا نظام کھڑا کرلے۔

یہی وجہ ہے کہ کیتھولک آزاد خیال کسی اخلاقی اور دانشورانہ متانت سے گریز کرتے ہیں جبکہ پروٹسٹنٹ اس کے برعکس عمل پیرا رہتے ہیں جیسے کہ جیمز مل پروٹسٹنٹ تھا تب ہی اپنے بیٹے کو کہتا ہے کہ میرا خالق کون ہے کا جواب اس لیے نہیں دیا جاسکتا کیونکہ ہمارے پاس نہ تو اس کے متعلق کوئی تجربہ ہے اور نہ ہی کوئی ایسی مستند معلومات جس کی بنیاد پر کوئی تسلی بخش نتیجہ اخذ کرسکیں البتہ اگر کوئی جواب ہو بھی تو وہ ہمیں ایک قدم مزید دور لا پھینکتا ہے کیونکہ ہمیں بالآخر اس سوال کا ناگزیر طور پر سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ''خدا کو کس نے بنایا؟''

مونٹیگنی اور والٹیئر زندہ دلی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھے حالانکہ کیتھولک چرچ سے تعلق رکھنے والے آزاد خیال لوگ اکثر و بیشتر زندہ دلی سے عاری رہتے ہیں۔ اُنہیں ہمیشہ سخت گیر قسم کے عقائد کی ضرورت رہتی ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ کمیونسٹ بھی ہو جاتے ہیں۔ جن میں لینن ایک اعلیٰ ترین مثال

ہے۔ لینن کی آزاد خیالی ایک پروٹسٹنٹ آزاد خیال شخص کی مرہونِ منت تھی (یہودیوں اور پروٹسٹنٹوں کی درمیان ذہنیت کے اعتبار سے فرق کرنا ممکن نہیں ہوتا) لیکن اس کو بازنطینی ماضی نے مجبور کر دیا کہ کسی سخت گیر قسم کے عقیدے کی تجسیم تخلیق کرئے۔ اس سے قدرے کم کامیاب مثال آگسٹ کومٹے ہے اس قسم کے مزاج کے لوگ جلد بدیر پھر سے چرچ کی گود میں آگھستے ہیں۔ بشرطیکہ اُنکے اندر سماجی دباؤ کا سامنا کرنے کے لیے غیر معمولی صلاحیت کا فقدان ہو۔ فلسفے کی دُنیا میں مسٹر سانتایانا ایک بڑی دلچسپ مثال موجود ہے جسے رُجعت ہمیشہ پسندیدہ رہی لیکن وہ ہمیشہ ہی اس بات کا آرزومند رہا کہ اُسے کوئی ایسا عقیدہ مل جائے جو کیتھولک چرچ کے عقیدے کے مقابلے میں قدرے کم قابلِ نفرت ہو اگرچہ اُسے کیتھولک عقیدہ بھی بہت پسند تھا۔ اُسے نہ صرف کیتھولک چرچ بطور ادارے کے پسند تھا بلکہ اُسکا سیاسی اثر ورسُوخ بھی اُس کے لیے پسندیدہ تھا۔ وہ اُن تمام باتوں کا کھلے عام اعادہ کیا کرتا جو چرچ کو روم اور یونان سے حاصل ہوئیں تھیں۔ لیکن اُسے وہ تمام عقائد ناپسند تھے جو چرچ کو یہودیوں سے ملے بلکہ وہ اُن عقائد کو بھی ناپسند کرتا تھا جو خود چرچ کو اس کے بانیوں سے عطا ہوئے۔ اُس کی غالباً یہ خواہش تھی کہ لیوکریٹس کسی طرح ایک ایسے چرچ کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جائے جو ڈیموکریٹس کے عقائد سے مطابقت رکھتا ہو کیونکہ مادیت پسندی اُس کی فہم سے ہم آہنگ تھی۔ اپنی آغاز کی تصانیف میں تو وہ مادیت کو پوجا کی حد تک پسند کیا کرتا تھا اور شاید اُسے کسی اور چیز سے لگاؤ ہی نہ تھا۔ لیکن ایک طویل عرصے کے بعد اُس کو احساس ہونے لگا تھا کہ وہی چرچ بہتر ہے جو حقیقت میں موجود ہو تب اس نے تخلیاتی چرچ کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ مسٹر سانتایانا ایک ایسی استثنائی شخصیت ہے جو آج کے جدید عہد کے فلسفیوں کی کسی اصطلاح کے زمرے میں نہیں آتی۔ وہ تھا بھی تحریک احیائے عُلوم کے زمانے سے قبل کا جو بقول دانتے اپنی شوقین مزاجی سے چمٹے رہنے کی وجہ سے جہنم میں سڑ رہا ہوگا۔ بلاشبہ یہ ایک ایسا نقطہ نظر تھا جو امریکا سے طویل رابطے کی بنا پر توانا ہو کر ہسپانوی مزاج کی صورت میں نمودار ہوا!

ہر شخص کے علم میں ہے کہ جارج ایلیٹ نے ایف ڈبلیو ایچ مئرز کو کس طرح قائل کیا کہ خدا کا وجود نہیں ہے تب بھی ہم لازماً اچھے اطوار و کردار کے ہو سکتے ہیں۔ جارج ایلیٹ کو پروٹسٹنٹ آزاد خیال لوگوں میں سے ایک مخصوص نُمائندے کی حیثیت حاصل ہے۔ وسیع معنوں میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ آزاد خیال خود کو بہتر بنا کے رکھنا پسند کرتے ہیں اور اُنہوں نے ایک ایسا عقیدہ تراش لیا جس کی رُو سے وہ اچھا بننے کی کوشش میں لگے رہے۔ جبکہ کیتھولک اس کے برعکس بُرا رہنا پسند کرتے لیکن اُنہوں نے ایسے عقائد تراش لیے جن کے ذریعے وہ دوسروں کو اچھا بناتے کیتھولک نظریئے کے سماجی کردار اور پروٹسٹنٹ نظریئے کے انفرادی کردار میں اسی وجہ سے فرق پایا جاتا ہے جیریمی بینتھم پروٹسٹنٹ آزاد خیال ہونے کے حوالے

سے ایک مثال کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک اعلیٰ ترین سیرت یہی ہے کہ خود کو مثالی بناؤ، کھانے پینے میں کبھی تجاوز نہ کرو تا کہ کہیں کردار میں دراڑ نہ آ جائے نہ ہی اُسے ہمسائے کا پرس چرانے میں کوئی دلچسپی تھی کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا تو جو اُسے جیل ہارلر کے ہمراہ مسرت حاصل رہتی تھی اُس سے محروم ہو جاتا۔ اس سلسلے میں اُسے کرسمس کی مٹھائیوں کو بھی ترک کرنا پڑا۔ دوسری طرف فرانس میں اس قسم کی اخلاقیات صوفیانہ ہونے کے حوالے سے تارک الدنیا لوگوں کیساتھ جُڑی ہوئیں تھیں لیکن زوال پذیر تھیں۔ البتہ شبہات نے اُس کے بعد ہی سر اُٹھانا شروع کیا لیکن یہ فرق مذہبی ہونے سے زیادہ قومی نوعیت کا تھا۔

مذہب اور اخلاقیات کا تعلق ایک ایسا سنجیدہ مسئلہ ہے جو غیر جانبدارانہ جغرافیائی مطالعہ کا مستحق ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جاپان میں مجھے بُدھ مذہب کے ایک ایسے فرقے کے افراد سے سامنا کرنا پڑا جن کی پیشوایت موروثی تھی۔ میں نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ کے ہاں پیشواؤں میں مجرد رہنے کی پختہ روایت ہے اور یہ کیونکر ہوا کہ آپ لوگوں نے شادیاں شروع کر دیں۔ لیکن اس کا جوب کوئی بھی دینے کے لیے تیار نہ تھا۔، تاہم ایک کتاب سے مجھے پتہ چلا کہ اُنھوں نے سب سے پہلے اپنا اندازِ فکر بدلا جس کے تحت یہ سمجھا جانے لگا کہ جب تک عقیدہ خالص اور پختہ رہتا ہے گناہ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اُنھوں نے گناہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن یہ گناہ شادی تک ہی محدود تھا۔ باقی زندگی میں وہ پاکباز ہی رہتے۔ شاید اگر امریکیوں کو باور کرا دیا جائے کہ شادی کرنا گناہ کے مترادف ہے تب وہ طلاق دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کریں۔ شاید معقول اور عقل وفہم پر مبنی سماجی نظام کی یہ بھی خصوصیت ہوتی ہے کہ ایک بے ضرر عمل کو گناہ قرار دے دیا جائے اور پھر جب کوئی اِس کا مرتکب ہو تو اس کو برداشت بھی کر لیا جائے۔ اس صورت میں گناہ کرنے کی لذت سے فیضیاب بھی ہوا جا سکتا ہے اور کسی کو نقصان بھی نہیں ہوتا۔ یہ نقطہ دراصل مجھے بچوں سے نپٹتے ہوئے مجھ پر آشکارا ہوا۔ ہر بچے پر ایسا وقت آتا ہے جب وہ شرارت پر مائل ہوتا ہے۔ اگر اُسے کسی طریقے سے سمجھایا جائے کہ شرارت کرنا بری بات ہے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ اپنی شرارت کرنے کی فطری تسکین کسی ضرر رساں طریقے سے حاصل کرے۔ جبکہ اُسے یہ سجھا دیا جائے کہ اتوار کو تاش کھیلنا یا جمعہ کے دن گوشت کھانا گناہ ہے تب وہ اپنے گناہ کرنے کی فطرت کی تسکین کسی کو نقصان پہنچائے بغیر بھی کر سکتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں بھی اسی اصول پر کاربند ہوں۔ تاہم بُدھوں کی روایت عقل و دانش پر قائم ہے اور شاید ایسا ہی ہونا چاہیے۔

پروٹسٹنٹ اور کیتھولک آزاد خیال لوگوں کے درمیان فرق کو ڈھیلے ڈھالے انداز ہی میں جانچنا چاہیے لیکن اگر کوئی سختی سے کسی پیمانے پر ناپنے کی کوشش کرے تو اُسے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر 18ویں صدی کے انسائیکلوپیڈیا اور فلسفہ جات پروٹسٹنٹ قسم کے ہوا کرتے تھی۔ جبکہ سیموئل بٹلر کیتھولک تھا۔

ان دونوں کے افکار کے درمیان سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ پروٹسٹنٹوں روایت کو ترک کرنا بنیادی طور پر دانشورانہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ جبکہ کیتھولک کی طرف سے ایسا کرنا عملی نوعیت کا ہے۔ ایک مثالی پروٹسٹنٹ آزاد خیال شخص کو کبھی معمولی سی ایسی خواہش نہیں ہوتی کہ وہ کوئی ایسا عمل کرے جس سے اُسکا ہمسایہ ذرا بھی ناپسند کرے البتہ یہ ممکن ہے وہ اس کے مُلحدانہ خیالات سے خفا ہو۔ یہ بات ہربرٹ سپنسر، بینتھم، ملز اور اُن تمام برطانوی آزاد خیال لوگوں پر صادق آتی ہے جن کا یہ کہنا ہے کہ مسرت ہی زندگی کا آخری مقصد ہوتا ہے لیکن وہ خود زندگی سے مسرت حاصل نہیں کرتے تھے جبکہ کیتھولک آزاد خیال لوگوں کو ان کے مطابق زندگی گذارنے کے لیے خاصی تگ و دو کرنا پڑتی تھی۔ اس حوالے سے اب دنیا تبدیل ہو رہی ہے۔ آج کا پروٹسٹنٹ آزاد خیال اپنے عمل اور خیال دونوں صورتوں میں آزادی کی طرف مائل ہے لیکن یہ خود پروٹسٹنٹ عقیدے کے عمومی زوال کی علامت ہے۔ پرانے وقتوں میں پروٹسٹنٹ آزاد خیال آزاد جنسی رویے کی بھرپور حمایت کرتا تھا۔ لیکن خود سختی سے مجرد زندگی بسر کرتا تھا۔ میرے خیال میں یہ تبدیلی افسوسناک ہے۔ عظیم دور اور عظیم افراد کسی سخت گیر نظام کی ٹوٹ پھوٹ ہی سے نُمو دار ہوتے ہیں۔ ایک سخت گیر نظام مطلوبہ ڈسپلن اور واضح اسباب و دلائل فراہم کرتا ہے جبکہ اُس کی شکست و ریخت سے بے پناہ قوت اور مربوط دلائل کا اخراج ہوتا ہے اور پھر اس مرحلہ پر یہ فرض کر لینا فاش غلطی ہوگی کہ پرانے نظام کے خاتمے کے فوراً بعد جو قابل تحسین فوائد حاصل ہوتے ہیں ان کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے قائم رہے گا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اُس مرحلے پر سخت گیر اقدامات اور خیالات کی ملائمت کی شدید ضرورت ہوتی ہے اس کے باوجود وہ فوائد محض مختصر عرصہ کے لیے قائم رہیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر گذشتہ قدامت پسندی کو زوال ہوتا ہے تو اس کی جگہ متصادم مفادات کی ضرورتیں نئے اور سخت گیر عقائد کو جنم دینا شروع کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر رُوس میں بالشویک ملحدین لینن کی عظمت سے جُڑے ہوئے تقدس پر اُنگلیاں اُٹھاتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اپنے بچوں سے محبت کرنا کوئی بدی نہیں۔ اسی طرح چینی ملحدین سن یات سن کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا کریں گے اور کنفیوشس کا شاید کبھی احترام نہ کریں مجھے خدشہ ہے کہ آزاد خیالی کے زوال سے اکثر لوگوں کے لیے یہ مشکل بڑھتی جائے کہ وہ کسی متشدد عقیدے کی گود میں پناہ لینے سے گریز کریں شاید اس کا بھی کبھی امکان ہو سکتا ہے کہ دنیا بھر میں ہر طرح کے ملحدین مل کر ایک ایسی خفیہ سوسائٹی تشکیل دیں اور اپنے ان سابقہ کامیابیوں اور فوائد کو استعمال میں لائیں جو بیل Byle نے اپنی ڈکشنری میں دریافت اور درج کیے تاہم اس ساری صورت حال میں اطمینان کی بات یہ ہے کہ آراء کو دبانے کی ہر کوشش نے ہمیشہ قلم کی روانی پر نہایت خوشگوار اثرات مرتب کیے ہیں۔

باب ۔ ۷

قرونِ وسطیٰ کی زندگی کے بارے میں

ویسے تو تقریباً ماضی میں گذرے تمام واقعات کو تلخ بنا کر یا قدرے خوشگوار کر کے پیش کرنا ایک عام سا دستور ہے لیکن قرونِ وسطیٰ کے بارے میں توڑ مروڑ کر ہمارے تعصّبات اور مزاج کے مطابق واقعات کو بیان کرنے کا رواج کچھ زیادہ ہی عام ہے۔ بعض دفعہ ماضی کا نقشہ اس پیرائے میں کھینچا جاتا ہے جو طبعیت پر بڑا ناگوار گذرتا ہے۔ بعض دفعہ اتنی خوشگوار نقشہ کشی کی جاتی ہے کہ دِل باغ باغ ہو جائے۔ 18 ویں صدی کو بلا شبہ قرونِ وسطیٰ کا وحشیانہ دور جانا اور مانا جاتا ہے۔ گبن کے مطابق اُن وقتوں کے ہمارے آباؤ اجداد بڑے اکھڑ مزاج ہوا کرتے تھے۔ انقلاب فرانس کے رَدِ عمل میں بے معنویت نے رومانوی پسندیدگی کو جنم دیا جس کی بنیاد یہ تھی کہ عقل و فہم کا استعمال موت (گلوئین) کی طرف گامزن کرتا ہے جس سے ایک ایسے فرضی زمانے کیساتھ بہادری، جرأت، منصف مزاجی اور کمزور کی پشت پناہی کے لیے آمادگی جیسی خصوصیات منسلک کر کے بڑی شان و شوکت کا اظہار کیا جانے لگا۔ اس خیال کے خالق سر والٹر سکاٹ تھے۔ یہ خیال انگریزوں میں بہت زیادہ مقبول رہا ہے عام لڑکا ہو یا لڑکی شاید اب بھی مل پائیں جو قرونِ وسطیٰ کے زمانے کیساتھ رومانوی تصور کو وابستہ کیے ہوئے بڑی حد تک ذہنی طور پر متاثر ہوں۔ ایک ایسے زمانے کا تصور کرنے لگتے ہیں جس میں نواب زرہ بکتر پہنا کرتے ہاتھوں میں نیزے لیے ہوئے یا تو خوش خلقی کا مظاہرہ کر رہے ہوتے یا پھر طیش کے عالم میں ہوتے جب تمام نازک اندام اور خوبصورت خواتین کسی مصیبت میں گھری ہوتیں تو کسی قصے یا کہانی کے اختتام کی طرح بالآخر یقینی طور پر بچا لی جاتیں ایک تیسرا بھی اندازِ فکر ہے۔ اگرچہ ہے تو وہ بالکل مختلف لیکن دوسرے کی طرح وہ بھی قرونِ وسطیٰ کے بارے میں بڑا مداح ہے۔ یہ اندازِ فکر کلیسا سے منسوب ہے جو کہ تحریک اصلاح کلیسا کی ناپسندیدگی کی پیداوار ہے۔ یہاں قدامت، زُہد اور درس و تدریس پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ مزید برأں چرچ کی طرف سے عالمِ مسیحیت کے اتحاد اور یگانگت کے لیے کاوشیں کی جاتی ہیں۔ رومانوی اندازِ فکر کی طرح یہ بھی دلیل و فہم کے خلاف ردِ عمل کی ایک قدرے عقل و فہم پر مبنی ایسی شکل ہے جس پر مبہم دلائل کے خوشنما چغے پہناتے

ہوئے ایک ایسے عظیم نظام کے تصورات کا تانا بانا بُنا گیا ہے جس نے ماضی میں دنیا کے ایک بڑے حصے کو ایک طویل عرصے تک اپنی گرفت میں لیے رکھا اب ایک دفعہ پھر نئے سرے سے اُسی عظمت رفتہ کے لیے ہاتھ پاؤں مارے جا رہے ہیں۔

اِن سب نقطہ ہائے نظر میں کچھ نہ کچھ سچائی موجود ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اکھڑ بھی تھے نواب بھی ہوا کرتے تھے اور پرہیز گار لوگ بھی لیکن اگر ہم اس دور کو سچے اور کھرے انداز میں دیکھنا اور پرکھنا چاہتے ہیں تو ہم پر لازم ہے کہ اُس دور کا اپنے موجودہ زمانے کے حق میں یا مخالفت میں تجزیہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہمیں غیر جانبدار ہو کر اس طرح جانچنا ہوگا کہ اُس زمانے کے رہنے والے لوگ خود اپنے زمانے کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے اور سب سے بڑھ کر ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ ہر زمانے میں لوگوں کی اکثریت عام سے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جنہیں اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنے روزگار سے ہی تعلق ہوتا ہے نہ کہ جس طرح تاریخ دان اپنے ''عظیم'' نظریات کے تحت اُن کی تصویر کشی کرتے ہیں ایسے فانی لوگوں کی تصویر کشی میں ایلین پاورز نے اپنی دلچسپ اور خوش کن کتاب ''قرونِ وسطیٰ کے لوگ'' میں کی ہے جو ساتویں صدی کے اٹلی اور فرانس کے بادشاہ چارلی میگنے سے ہنری ہفتم تک کے دور کے کرداروں سے متعلق ہے۔ اُن میں صرف ایک ہی ممتاز قابلِ ذکر کردار مارکو پولو تھا باقی پانچ کردار کسی نہ کسی حد تک غیر معروف افراد ہیں جنہیں دستاویزات کی مدد سے تعمیر کر کے اُجاگر کیا گیا اور وہی تاریخ میں بچ رہے۔ جہاں تک بہادری و جرأت کا تعلق ہے یہ آج کے جمہوری دور میں تقریباً معدوم ہو چکے ہیں پرہیزگاری کسانوں اور برطانوی سوداگروں میں اب بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن کلیسا کے حلقوں میں یہ بہت کم ملتی ہے۔ 18 ویں صدی کے مقابلے میں وحشت اور بربریت بھی بہت کم ہوگئی ہے تاہم وحشت کے نقطہ نظر کے حق میں مذکورہ کتاب میں زبردست موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ تحریک احیائے علوم سے کچھ عرصہ قبل وینس کے آرٹ اور 14 ویں صدی کے چینی آرٹ کا موازنہ بڑا قابلِ ستائش ہے۔ دونوں تصاویر کو نئے سرے سے تخلیق کیا گیا جن میں سے ایک میں مارکو پولو کو جہاز میں سوار ہوتے دکھایا گیا جس کا وینس کے آرٹ میں اظہار ہوتا ہے جبکہ دوسری تصویر میں چودھویں صدی کے چینی آرٹ میں چاؤ سنگ فُو کے وسیع المنظر نظارے کی تصویر کشی کی گئی ہے جن کے بارے میں مس باورز کا کہنا ہے کہ ''صاف پتہ چلتا ہے کہ چاؤ منگ فُو کی تصویر بہت ترقی یافتہ تہذیب کی عکاسی کرتی ہے جبکہ دوسری تصویر نہایت سادگی، بھولپن اور بچگانہ تہذیب کی مظہر ہے۔'' جو شخص بھی اِن کا تقابلی جائزہ لے گا وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر پائے گا۔

حال ہی میں پروفیسر ہائزنگا آف لیڈن کی ایک کتاب ''رُوبہ زوال قرونِ وسطیٰ'' شائع ہوئی ہے جس میں 18 ویں صدی کے فرانس اور فیلنڈر کی غیر معمولی اور دلچسپ تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کتاب میں

نائٹوں کے خصائل پر نہایت مناسب اور بجا طور پر توجہ دی گئی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس پر رومانوی نقطہ نظر کی پرچھائیں نہیں آنے دی گئیں۔ بلکہ اعلیٰ طبقات کی اُکتا دینے والی زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے ایسے کھیلوں کا ذکر ہے جن کی تفصیل بڑی احتیاط سے جزیات کیساتھ بیان کی گئی ہے۔ مہذب انداز میں شائستگی سے محبت کا اظہار نائٹوں کے سماج کا عجیب وغریب اور لازمی حصہ تھا جس میں محبت کو تشنگی کی حالت میں چھوڑ دینا ہی لُطف انگیز معلوم ہوتا تھا'' جب بارھویں صدی میں اُس دور کے نغمہ نگاروں اور گلوکاروں نے اپنی تشنہ خواہشات کو شاعرانہ محبت کا مرکز بنانا شروع کیا تو گویا یہ تہذیب کی ترقی کے حوالے سے تاریخ کا ایک اہم موڑ ثابت ہوا اور ادبی اور فنی تخلیق میں محبت کا تصور اس پیرائے میں نمودار ہونا شروع ہوا جس سے منفی پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔''

مزید یہ کہ اُس اعلیٰ طبقے کا وجود جس کی دانش اور اخلاقی میلانات نے محبت کے فن میں جذب ہوکر اعلیٰ مقام حاصل کیا یہ تاریخ میں ایک ایسی حقیقت ہے جسے اِستثناء حاصل ہے۔ تاریخ کے کسی بھی دور میں تہذیب اور محبت کے آئیڈیل اس سطح تک باہم مدغم نہیں ہوئے جس طرح فلسفے اور مسیحیت کے امتزاج نے قرون وسطیٰ کے تمام فلسفیانہ خیالات کو ایک اکائی میں پرو دیا۔

قرون وسطیٰ کے سماجی مسائل کے بڑے حصے کی رومن اور جرمن روایات کے درمیان تصادم کے پس منظر میں تشریح ہو سکتی ہے ایک طرف چرچ تو دوسری طرف ریاست، ایک طرف مذہب اور فلسفہ تو دوسری طرف شجاعت اور شاعری، ایک طرف قانون تو دوسری طرف تفریح طبع جوان جذبے اور وہ تمام بے لگام محرکات جو اکھڑ قسم کے اشخاص کی خصوصیات میں داخل ہوتے ہیں۔ رومن روایت اتنی مضبوط نہ تھی جتنی کہ عظیم روم کا خاصا ہوتی بلکہ کونٹنسٹائن اور جسٹینین کے زمانے میں اس نے جڑ پکڑی۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ایسا کچھ ضرور تھا جو پُرآشوب اور متلاطم اقوام کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بغیر تہذیب سیاہ ادوار میں سے نمودار ہو ہی نہ سکتی تھی۔ کیونکہ ان دِنوں کے لوگ انتہائی اکھڑ مزاج ہوا کرتے تھے لہٰذا اُنھیں کنٹرول میں رکھنے کے لیے سختی سے کام لینا ضروری تھا۔ چنانچہ تشدد کا اتنا زیادہ استعمال ہوا کہ آخر لوگوں میں اس کا خوف ہی جاتا رہا۔ قرون وسطیٰ کے آخری حصے میں موت کے ناچ کے متعلق فن مصوری بڑا مقبول موضوع رہا ہے۔ اس میں کھوپڑیوں کا زندہ انسانوں کیساتھ ڈانس کی کیفیت بیان ہوتی تھی۔ ڈاکٹر ہائزنگا کے بیان کے مطابق پیرس کے چرچ سے ملحقہ قبرستان میں بنے ہوئے راستے میں وِلن کے ہمعصر تفریح طبع کے لیے چہل قدمی میں مصروف تھے کہ'' راہبوں کی سہ طرفہ قیام گاہوں کے درمیان میدان میں ہڈیوں اور کھوپڑیوں کا ایک انبار لگا تھا جن پر ہزاروں آنکھیں مرکوز تھیں اور ادھر انسانی مساوات کے اسباق جاری تھے......... راہبوں کی قیام گاہوں کے نچلے حصوں میں موت کے ناچ اور ہیولوں کی نمائش کے علاوہ

منظوم شاعری کا الاپ بھی ہو رہا تھا۔ انسانوں سے ملتے جلتے ہیولوں کے قہقہے لگاتے ہوئے پوپ، شہنشاہ، راہب احمقوں کے ہمراہ گھستے ہوئے مناظر کے لیے اس سے بہتر اور کوئی مقام ہو ہی نہ سکتا تھا۔ ڈیوک آف بیری کے پاس تین مرد ہا اور تین ہی زندہ لوگوں کی پوری تاریخ موجود تھی۔ جن کی تصویریں چرچ کے شاندار بڑے دروازے پر کنندہ تھیں۔ اس کی خواہش تھی کہ اُسے اُسی قبرستان میں دفن کیا جائے۔ ایک صدی گذرنے کے بعد اس کے جنازے کی علامتوں کو موت کے اُس مجسمے کو مکمل کیا گیا جو تب کی باقیات میں سے صرف یہی رہ گئی ہے جو لُوور میں اب بھی موجود ہے۔ یہی وہ ایسی جگہ تھی جہاں 15 ویں صدی میں پیرس کے باشندے اکثر و بیشتر آیا کرتے تھے۔ یہاں آنے جانے والے لوگوں کا ہجوم لگا رہتا تھا جو ہیولوں کی طرف تکتے ہوئے وہاں کنندہ شعر پڑھا کرتے جو اُنہیں ہر لمحے آنے والے خاتمے کی یاد دلایا کرتے تھے باوجود اس کے کہ وہاں آئے روز مُردے دفنائے جاتے اور کھود کر نکالے بھی جاتے وہ مقام عام لوگوں کے لیے نہ صرف تفریح گاہ کی صورت اختیار کر چکا تھا بلکہ اُس نے چاروں اطراف سے آنے والوں کے لیے وقت مقررہ پر جائے ملاقات کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ مردہ خانوں کے سامنے طرح طرح کی دُکانیں قائم ہو چکی تھیں اور وہاں مقیم راہبوں کی رہائش گاہوں کے عین نیچے پیشہ ور عورتیں بھی مٹر گشت میں مصروف رہتیں چرچ کے ایک طرف عورت قید میں پڑی سڑ رہی تھی۔ وہاں جلوس بھی ہوا کرتے جن کی تبلیغ کے لیے پادری آیا کرتے اور پھر اُنکا اختتام بھی وہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ وہاں اس قدر میلے اور دعوتیں ہوتیں کہ وہ خوفناک اور سنسان مقام بے حد شناسا معلوم ہونے لگا۔''

توقع کے عین مطابق موت کے ناچ سے لگن کے پیش نظر ظلم کی نمائش وہاں کی آبادی کے لیے اعلیٰ تفریح کا سامان مہیا کرتی ہے۔ چنانچہ ایک مخصوص علاقے کے لوگ کسی پہاڑی ڈاکو کو اذیت میں مبتلا ہوتے ہوئے ملاحظہ کرنے کے لیے ٹکٹ خریدتے اس نظارے سے لوگ اتنا لُطف اندوز ہوتے کہ اگر کوئی مقدس شخص قبر سے بھی اُٹھ کر ظاہر ہو جاتا تو اُس پر بھی وہ اتنی توجہ نہ دے پاتے۔ 1488ء میں برجز کے کچھ مجسٹریٹ حضرات بغاوت کے شُبہ میں اُس بازار میں لا اُن پر کر بار بار تشدد کیا گیا۔ ایک طرف تو لوگوں کی خوشی اور انبساط کی کوئی انتہا نہ تھی تو دوسری طرف وہ اپنی موت کی بھیک مانگ رہے تھے ڈاکٹر حاندلگا کے مطابق اُنہیں موت کی گھاٹ محض اسلئے نہیں اُتارا گیا تا کہ لوگ کسی اور موقع پر اُن کی آہ و بکا سے لُطف اندوز ہو سکیں۔

شاید 18 ویں صدی کے بارے میں تھوڑا بہت کچھ کہنا باقی ہے ڈاکٹر ہائزنگا قرون وسطیٰ کے آخری مرحلے کے فن کے بارے میں بڑی دلچسپ معلومات رکھتے ہیں۔ فن تعمیر اور فن مصوری کے مقابلے میں مجسمہ سازی حسن اور نفاست کے اعتبار سے کہیں زیادہ بہتر نوعیت کی تھی جو جاگیر دارانہ محبت کی شان و

شوکت سے منسلک ہو کر مزید نکھر چکی تھی۔ مثال کے طور پر جب ڈیوک آف برگنڈی نے سلٹر (15 ویں صدی کا عظیم ولندیزی پینٹر اور مجسمہ ساز) کو مسیح کے سُولی چڑھانے کے منظر کے لیے چیمول میں مجسمہ سازی کے ذریعے تصویر کشی کے لیے کام سُپرد کیا جس میں جہاں برگنڈی اور فلینڈر کی تلواروں کی جھنکار گونجی وہیں اُن سے صلیب کا نشان بھی بنتا تھا۔ اس سے بھی حیران کُن بات یہ تھی کہ یشوع (جو اس تصویر کشی میں گروپ کا حصہ تھا) کی آنکھوں پر عینک تھی۔ تو یہاں مصنف اس عظیم فنکار کی نہایت اُداس اور غمگین قسم کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایسا عظیم فنکار ایک نہایت پسماندہ تہذیب کے ہاتھوں مغلوب ہو گیا۔ تب اُس فنکار نے اپنے ہی مجسموں کو توڑ پھوڑ دیا شاید اس لیے کہ والٹر نے سوچا ہوگا کہ یشوع کی عینک اس وقت کی بہترین دریافت ہے۔ مِس پاورز بھی بڑے حیران کُن حقائق کا ذکر کرتی ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ 13 ویں صدی میں اٹلی کا مصنف ہاوڈلر وِکٹوریہ کے زمانے کے حسن ذوق اور نزاکت میں ٹینی سن سے بھی سبقت لے گیا۔ اُس نے آرتھر کے روایتی قصوں کو قدرے بدلے ہوئے متن میں شائع کیا جس میں لانسلٹ اور گونیور کے معاشقوں کو نظر انداز کر دیا۔ قصہ مختصر تاریخ انتہائی عجیب و غریب واقعات سے بھری پڑی ہے مثال کے طور پر 16 ویں صدی میں جاپان میں رہنے والا ایک شخص جورومن کیتھولک چرچ کا رُکن تھا ماسکو میں شہید کر دیا گیا۔ میری خواہش ہے کہ کوئی عالم فاضل تاریخ دان ایک ایسی کتاب تحریر کرے جس کا نام ''حقائق جنھوں نے مجھے حیران کر دیا'' ہو ایسی تصنیف میں یشوع کی عینک اور اطالوی باوڈلر یقیناً کوئی مقام پا سکتے ہیں۔

باب ـــ ۸

تھامس پائین کا انجام

تھامس پائین Thomas Paine کو دو انقلابات کے دوران بے حد امتیازی حیثیت حاصل رہی اور تیسرے اِنقلاب کی کوشش کے الزام میں پھانسی سے بال بال بچ نکلے۔ تاہم اب اُن کی شہرت پر دُھندسی چھاتی جارہی ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کے نزدیک وہ اس دُنیا کا سب سے بڑا شیطان تصور ہوتا تھا۔ اُنکو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شخص ایک ایسا کافر ہے جو اُنکے مروجہ، روایتی اخلاقیات کے نظام کو جڑ سے اُکھاڑ باہر کرنا چاہتا ہے اور یوں وہ بیک وقت خدا اور بادشاہ کا باغی ہے۔ اس نے اپنے زمانے میں ایسے تین افراد کی دُشمنی مول لے رکھی تھی جو آپس میں کبھی بھی کسی بھی نقطے پر متفق نہیں رہے تھے وہ تین افراد مندرجہ ذیل تھے:

پٹ Pit

روبس پیئر Robespierre

واشنگٹن Washington

اِن تینوں میں سے پہلے دو تو اُس کی موت کے شدت سے طلبگار تھے جبکہ تیسرا ہر اُس اقدام سے ہمیشہ باز رہا جو اُس کی موت کی راہ میں حائل ہوسکتا تھا۔ پٹ اور واشنگٹن اس لیے مخالف تھے کہ وہ ایک ڈیموکریٹ تھا۔ روبس پیئر اُسکا جانی دُشمن اسلئے تھا کہ وہ جہاں بادشاہ کی پھانسی کا مخالف تھا وہیں دہشت کی حکمرانی کا بھی خاتمہ چاہتا تھا۔ اپوزیشن کی طرف سے اُس کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جانا اور حکومتوں کی جانب سے سخت مخالفت کا سامنا کرنا اُس کا ہمیشہ سے مقدر رہا۔ واشنگٹن جب تک انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھے رہا وہ اس کی بڑی تعریف کرتا رہا۔ جب تک جیکو بن برسرِ اقتدار نہ آ گیا پوری فرانسیسی قوم اُس کو نہ صرف عزت و احترام سے دیکھتی رہی بلکہ اس کے سامنے اپنے قومی اعزازات کے ڈھیر لگاتی رہی۔ حتیٰ کہ انگلینڈ میں بھی بڑے بڑے سیاستدان اُس کے سامنے بچھے جاتے تھے بلکہ وِگ Whig پارٹی نے اُسے اپنا منشور تک بنانے کی ذمہ داری سونپ دی تاہم عام لوگوں کی طرح چونکہ وہ بھی گوشت پوست کا بنا ہوا تھا لہٰذا اُس میں بھی خامیاں موجود تھیں جن کی کوئی اہمیت نہیں ہونی

چاہیے البتہ یہ اُس کی خوبیاں ہی تھیں جن کی وجہ سے اُسے نہ صرف انتہائی نفرت کا سامنا کرنا پڑا بلکہ انتہائی کامیابی سے بہتان طرازیوں کا نشانہ بننا پڑا۔

تاریخ میں تھامس پائین کی اہمیت اس حقیقت پر مشتمل ہے کہ اُس نے جمہوریت کی تبلیغ کو بھی جمہوری بنا دیا۔ حالانکہ اٹھارویں صدی میں فرانسیسی اور انگلش اشرافیہ میں ڈیموکریٹ، فلسفی اور غیر روایتی قسم کے پادری بھی موجود تھے لیکن وہ اپنے سیاسی خیالات کو اپیل کی صورت میں پیش کرتے ہوئے محض تعلیم یافتہ افراد سے مخاطب ہوتے۔ تھامس پائین کے انداز، فکر میں الگ سے تو کوئی نئی بات نہ تھی البتہ اُس کی تحریر میں تنوع اور اختراع کا پہلو اتنا نمایاں صاف ستھرا اور سادہ تھا کہ وہ عام سے ذہین محنت کش کو بھی بے حد پُرکشش اور قابل ستائش معلوم ہونے لگا۔ اس کی اس خوبی نے اُسے خطرناک بنا دیا اور جب اس نے اپنی تحریروں میں مذہب سے متعلق غیر روایتی اندازِ فکر بھی شامل کرنا شروع کر دیا تو مراعات یافتہ طبقات نے بھی اس کی رسوائی اور بدنامی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس کی زندگی کے پہلے 36 سالوں میں اس کی اہلیت اور قابلیت کی کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جو اس کے بعد کے عرصے میں اس کی سرگرمیوں سے ظاہر ہوتی ہو۔ وہ 1739 میں تھیٹ فورڈ میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین غربت کے مارے کوایکر فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ تیرہ سال کی عمر تک اس نے مقامی گرائمر سکول میں تعلیم حاصل کی تب وہ Stay Maker بن گیا۔ شاید ایک پرسکون زندگی اس کے مزاج کے ہی خلاف تھی۔ سترہ سال کی عمر میں اس نے اپنا نام ایک ایسے پرائیویٹ بحری جہاز کے عملے میں درج کروالیا جس کا نام ہی ''خوفناک'' The Terrible اور کپتان کا نام ''موت'' تھا۔ چنانچہ اس کے والدین اُسے اپنے پاس واپس لے گئے اور شاید وہ کسی متوقع موت سے بچ گیا کیونکہ 200 میں سے 175 افراد اس جہاز کے واپس جانے کے فوراً بعد کسی کارروائی میں مارے گئے تاہم تھوڑے سے عرصے کے بعد وہ دوبارہ ایک پرائیویٹ بحری جہاز میں سفر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اس کی اس مختصر سے عرصے کی سمندری مہم کے دوران اس کے ساتھ کیا واقعات پیش آئے۔ ان کے بارے میں کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں۔ کیونکہ اُن دِنوں سات سالہ جنگ چھڑی ہوئی تھی 1758 میں اُسے بطور Stay maker لندن میں ملازمت مل گئی اس کے اگلے سال اس نے شادی کر لی لیکن چند ماہ بعد ہی اُس کی بیوی کا انتقال ہو گیا 1763 میں ایکسائز انسپکٹر مقرر ہو گیا لیکن دو سال بعد اُسے نوکری سے برخواست کر دیا گیا کیونکہ اس نے اپنی انسپکشن کے بارے میں ایک رپورٹ بھیجی جو اس لیے غلط ثابت ہوئی کیونکہ انسپکشن کے وقت وہ اپنی ڈیوٹی کی بجائے اپنے گھر کے اندر مطالعے میں مصروف تھا۔ چنانچہ انتہائی غربت کے عالم میں محض دس شلنگ فی ہفتہ اُجرت پر ایک سکول ماسٹر کی ملازمت اختیار کر لی اور پھر اس نے انگلیکن فرقہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اِن نامساعد حالات سے اُسے اس وقت چھٹکارا مل گیا۔ جب لیوس Lewes کے مقام پر اُسے

بطور ایکسائز مین کے دوبارہ بحال کر دیا گیا جہاں اس نے کسی کو ایکر عورت سے شادی کر لی جس سے اُس نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر 1774 میں علیحدگی اختیار کر لی۔ اسی سال اسے دوبارہ اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے جس کی بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے ایک درخواست داخل کی جس میں ایکسائز مینوں کی تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کیا گیا تھا لہٰذا اس نے تنگدستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ سب کچھ فروخت کر دیا جو اس کے پاس تھا جس سے وہ بمشکل اپنا قرض چکانے میں کامیاب ہونے کے بعد جو کچھ بچ گیا اس نے اپنی بیوی کے حوالے کر دیا یوں اس نے خود کو بیچارگی کے عالم میں حالات کے سپرد کر دیا۔

لندن میں جہاں وہ پارلیمنٹ کو ایکسائز مینوں کے بارے میں درخواست پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ بینجمن فرینکلن سے شناسائی ہوگئی جو اس کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ فرینکلن سے ایک سفارشی خط کے ہمراہ 1774ء ہی میں امریکا روانہ ہو گیا اس خط میں فرینکلن نے اسے بے حد ذہین قرار دیا تھا۔ چنانچہ جونہی وہ فلاڈلفیا پہنچا اس نے اپنی تحریروں کے ذریعے اپنی ہنر مندی کی دھوم مچا دی اور فوراً ہی ایک جریدے کا ایڈیٹر مقرر ہو گیا۔

1775ء میں اس کی پہلی اشاعت میں غلامی اور غلاموں کی خرید و فرخت کے خلاف ایک زبردست مضمون شائع ہوا جس کے بارے میں خود اس کے اپنے امریکی دوستوں کی کیا رائے تھی اس سے قطع نظر غلامی کے خلاف اس نے ایسے پیرائے میں جدوجہد جاری رکھی جس میں کسی قسم کے سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکن سوسائٹی پر یہ اس کے بڑی حد تک مرتب کردہ اثرات تھے جن کی بدولت جیفرسن نے آزادی کے اعلان کی دستاویز میں اس موضوع کا ذکر کیا جسے بعد میں خارج کر دیا گیا۔ 1775ء تک پنسلوانیا میں غلامی کا وجود برقرار تھا جسے 1780ء کے قانون کے تحت منسوخ کر دیا گیا جس کا پیش لفظ عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ تھامس پائین کا ہی تحریر کردہ ہے۔

تھامس پائین کو سب سے پہلا امریکا کی مکمل آزادی کا مطالبہ کرنے والا شخص نہ بھی تسلیم کیا جائے تب بھی اس کا شمار اُن لوگوں میں ضرور ہوتا ہے جنھوں نے سب سے پہلے امریکا کی مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ اکتوبر 1775 میں جب کچھ لوگ تب بھی برطانوی حکومت کی امریکا میں کسی نہ کسی طرح کی شمولیت کی اُمید رکھتے تھے گو بعد میں اُنہوں نے بھی قدرے ہچکچاتے ہوئے آزادی کے اعلان پر دستخط کر دیئے جس کے بارے میں اس نے لکھا ''میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ قدرت کاملہ بالآخر امریکا کو برطانیہ سے مکمل چھٹکارا دلائے گی۔ اسے آپ خود مختاری کہہ لیں یا کچھ اور۔ چاہے یہ انسانیت کے حق میں ایک عظیم مقصد ہے۔ یا خدائی منشاء اس کی سمت بہر حال متعین ہو چکی ہے اور جب قادر مطلق ہمیں مکمل طور پر آزاد اور خود مختار قوم بننے کی توفیق عطا فرمائے گا تو اس کا شکریہ ادا کرنے کے اظہار کے طور پر ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہوگا

کہ ہمیں بین البراعظمی قانون سازی کرنا ہوگی جس کے تحت نیگروز کی فروخت کے لیے درآمد پر مکمل پابندی عائد کرنا ہوگی مزید براں جو بدنصیب نیگرو پہلے سے یہاں موجود شدید مصائب میں مبتلاء ہیں ان کی مصیبتوں کو نہ صرف کم سے کم کرنا ہوگا بلکہ اُنہیں بھی مکمل آزادی سے ہمکنار کروانا ہوگا۔"

تھامس پائین بادشاہت سے آزادی، اشرافیہ سے آزادی غرض سماج میں رائج ہر قسم کے ظلم و جبر سے نجات کو امریکا کی مکمل آزادی کے ہم معنی سمجھتے تھے۔

آزدی کی جنگ کے کٹھن ترین دور میں تھامس پائین کے دن آزادی کی جدوجہد کے لیے مہم چلانے میں گذرتے جبکہ راتیں کامن سینس کے نام سے شائع ہونے والے پمفلٹوں کی ترتیب و تدوین میں گذرتیں جن کے ذریعے آزادی کی جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں بے حد مدد ملی۔ جب انگریز میانے کے فالماؤتھ اور ورجینیا کے نارفوک قصبوں کو جلا کر راکھ کر چکے تو واشنگٹن نے 31 جنوری 1776 کو اپنے ایک دوست کو خط لکھا "فالماؤتھ اور نارفوک کے سانحوں کے بارے میں کامن سینس پمفلٹ میں آزادی کے حصول کے لیے جن چند شعلہ نوا دلائل کا مزید اضافہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد امریکا کی برطانیہ سے علیحدگی کی معقولیت کے متعلق مزید کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہی۔"

یہ تصنیف محض حالات کو تفصیل سے جاننے اور اس کی تاریخی دلچسپی کے لیے ہی رہ گئی ہے تاہم اس میں ایسے جملے درج ہیں جو اب بھی چبھتے ہوئے اور مؤثر ہیں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ لڑائی محض بادشاہ سے نہیں بلکہ پارلیمنٹ سے بھی ہے اس کا کہنا تھا کہ "دُنیا میں چند لوگوں پر مُشتمل کوئی بھی ایسا ادارہ موجود نہیں جو اپنے مفادات اور مراعات کے بارے میں اتنا فکر مند نہیں جتنا کہ ہاوس آف کامن ہے کیونکہ وہ سب بکاؤ مال ہیں" اُس وقت یہ بات اتنی حسب حال اور جائز طنز تھی جس سے انکار ممکن نہ تھا۔

جمہوریہ کے حق میں ایک سے ایک بڑھ کر پختہ دلیل موجود ہے اور یہ کہ بادشاہت خانہ جنگی کی روک تھام کا باعث ہوتی ہے نہایت ہی احمقانہ تصور ہے۔ برطانوی تاریخ کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے تھامس پائین کا کہنا تھا کہ بادشاہت اور جانشینی نے دنیا کو خون سے لت پت کیے رکھا ہے۔ یہ حکومت کی ایک ایسی شکل ہے جس کے خلاف خود خدا کا کلام شاہد ہے اور یہ کہ خون ہی سے اس کا کام تمام ہوگا۔ دسمبر 1771ء میں جب جنگ آزادی اپنے نازک موڑ پر آن پہنچی تھی تو تھامس پائین نے "بحران" نامی ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں کہا گیا کہ "تاریخ میں ایسے لمحات آتے ہیں جب لوگوں کی روح تک کی آزمائش ہوتی ہے۔ چاہے وہ موقع پرست سپاہی ہوں یا روز روشن کی طرح عیاں محب وطن جو اپنے وطن کی خدمت سے منہ موڑ لیں لیکن جو شخص بھی ان لمحوں میں ڈٹا رہے گا وہی یہاں کے ہر مرد اور عورت کی طرف سے شکریے کا مستحق ٹھہرے گا۔"

یہ مضمون فوجیوں کو پڑھ کر سنایا گیا اور پھر واشنگٹن نے تھامس پائین کی خدمات کو سراہتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا کہ آپ کی علمی و ادبی تخلیقات کی اہمیت یہ ہے کہ وہ بذات خود زندہ احساس ہیں'' پورے امریکا میں اتنی کثیر تعداد میں پڑھا جاتا تھا کہ اگر وہ چاہتا تو اپنے قلم سے بے انداز دولت بنا سکتا تھا لیکن اس نے جو بھی لکھا اس کے بدلے میں کبھی کوئی معاوضہ وصول نہیں کیا اور اگر کسی نے کوئی مالی پیشکش بھی کی تو اس نے لینے سے صاف انکار کر دیا۔ آزادی کی جنگ کے خاتمے کے بعد امریکا میں چاروں طرف اس کی شہرت کا ڈنکا بج رہا تھا لیکن وہ خود غریب کا غریب ہی رہا۔ تاہم ایک ریاست نے اس کی خدمات کے اعتراف میں کچھ اراضی اس کے نام کر دی اور ایک دوسری ریاست نے اُسے اتنی بڑی رقم بھی دی کہ جس سے وہ اپنی بقایا زندگی بڑے آرام اور سکون سے گذار سکتا تھا۔ لہٰذا اس سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ایک کامیاب انقلاب کی جدوجہد سے سرخُرو ہونے والے انقلابی کی طرح زندگی گذارتا۔ لیکن اس نے اپنی توجہ کا رُخ سیاست کی بجائے انجنیئرنگ کی طرف موڑ دیا اور بہت جلد پہلے سے موجود لوہے کے پُلوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ طویل پُلوں کی تعمیر کے امکانات کا کھوج لگانے میں کامیاب ہو گیا اور پھر اپنی تحقیق کے کامیاب تجربات کے بعد وہ انگلینڈ روانہ ہو گیا جہاں ڈیوک آف پورٹ لینڈ مسٹر برک Burke سمیت وِگ پارٹی کے بہت سے معززین نے اُس کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ وہاں مقیم لائق و فائق انجنیئرز بھی اس کی اہلیت اور قابلیت کے بہت مداح تھے اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھامس پائین بطور ایک قابل احترام مُوجد کے اپنی بقیہ زندگی بڑے اطمینان سے بسر کرنا شروع کر دے گا۔

تاہم ان دِنوں فرانس اور انگلینڈ میں لوہے کے پُلوں کی تعمیر میں گہری دلچسپی پائی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں 1788 میں لافائیٹے Lafayette سے تبادلہ خیال کے لیے پیرس چلا گیا جہاں اس نے اکاڈمی آف سائنسز کو اپنے منصوبہ جات کی جامع رپورٹ پیش کی جس نے غیر ضروری تاخیر کیے بغیر اس کے حق میں منظوری دے دی۔ جب باسٹیلے فتح ہو گیا تو لافائیٹے کی جیل کی چابیاں واشنگٹن کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا اس سلسلے میں اٹلانٹک کے اُس پار یہ ذمہ داری تھامس پائین کے سپرد کر دی تاہم تھامس پائین پُلوں کی تعمیر سے متعلق معاملات کے پیش نظر یورپ میں ہی مقیم رہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے واشنگٹن کو ایک طویل خط اُرسال کرتے ہوئے آگاہ کیا کہ ''مطلق العنانی کی لُوٹ مار کی ابتدائی ٹرافی اور امریکی اصولوں کے سب سے پہلے پکے ہوئے پھل کی یورپ میں بوائی آپ تک پہنچانے کا ذمہ میرے سپرد ہوا ہے۔ میں چاہوں گا کہ یہ ذمہ داری کسی اور کو سونپ دی جائے'' اس نے اپنے خط میں لکھتے ہوئے مزید کہا کہ مجھے فرانسیسی انقلاب کی مکمل کامیابی میں ذرا برابر بھی شبہ نہیں اور یہ کہ میرے زیرِ نگرانی ایک سو دس فٹ طویل محرابی پُل جس کا محراب آہنی رسے سے پانچ فٹ بلند ہے تیاری کے آخری مرحلے پر ہے۔

کچھ عرصے تک وہ پُل اور انقلاب اس کی توجہ کے بین بین مرکز رہے لیکن آخر کار انقلاب بتدریج فتح یاب ہوگیا۔ اس پس منظر میں یہ اُمید لیے ہوئے کہ انگلینڈ میں بھی اسی انقلاب سے متاثر ہوکر کوئی متوقع تحریک کامیاب ہونے والی ہے ''انسان کا حق'' نامی ایسی کتاب مرتب کی جو اس کے چار وانگ عالم جمہوریت پسند ہونے کی شہرت کا سبب بنی۔

اس کتاب کو اینٹی جیکو بن ردعمل کے دوران پاگل پن کی حد تک مروجہ اخلاق کے نظام اور حکومت کا تختہ اُلٹنے کے مترادف سمجھا گیا جس کو آج کا جدید قاری بڑی ملائمیت اور عام فہمی پر مبنی قرار دے گا۔ یہ کتاب بنیادی طور پر برک کے نظریات کے جواب میں تحریر ہوئی تھی جس میں اس وقت کے فرانس میں رُونما ہونے والے واقعات کا تفصیل اور تسلسل میں ذکر کیا گیا ہے۔ اِس کا پہلا حصہ 1791 میں اور دوسرا 1792 میں شائع ہوا۔ چونکہ اس وقت انقلاب کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی اس لیے تیسرے ایڈیشن کی نوبت ہی نہ آئی البتہ قدرتی حقوق کے بارے میں زورِ خطابت سے زیادہ برطانوی حکومت کے متعلق تدبر اور فہم کی ضرورت تھی۔ برک بڑی قطعیت کے ساتھ یہ وکالت کرتا رہا تھا کہ 1688 کے انقلاب کے بعد ایکٹ آف سیٹلمنٹ کے تحت مقرر شدہ کسی بھی مقتدرِ اعلیٰ کی تابعداری کا برطانیہ کو ہمیشہ کے لیے پابند کر دیا گیا ہے جس کے جواب میں تھامس پائین کا زوردار انداز میں یہ کہنا تھا کہ کہ آئندہ نسلوں کو کسی بھی بات کا پابند کرنا ناممکن ہے اور یہ کہ آئین کا ایسا ہونا لازم ہے کہ اُس میں گاہے بگاہے ضرورت کے مطابق ترمیم ہوسکے۔

اُسکا کہنا تھا کہ حکومت ''تین اقسام کی ممکن ہوسکتی ہے۔ اول یہ کہ اس کی بنیاد توہم پرستی پر ہو دوئم یہ ہے کہ اپنی قوت کے بل پر قائم ہو اور سوئم یہ کہ سماج کے مشترکہ مفاد اور انسان کے مشترکہ حقوق کی بنیاد پر تعمیر ہو۔ اُن میں پہلی ثلاثیت سے عبارت ہوتی ہے۔ دوسری قسم کی بنیاد غیر ملکی فاتحین پر مشتمل ہوتی ہے۔ تیسری اور آخری وہ جو عقل و دانش پر استوار رہوتی ہے'' جب پہلی اور دوسری قسم آپس میں مدغم ہوئیں تو ''سینٹ پیٹر اور خزانے کی چابیوں کا یوں باہم ملاپ ہوا کہ فریب زدہ انبوہ کثیر اس ایجاد کے سامنے حیرانگی کے عالم میں سربسجود ہوگیا'' اس کتاب میں اس قسم کے جائزے اور مشاہدے بہت کم پائے جاتے ہیں۔ کتاب کا بڑا حصہ فرانس کی تاریخ میں 1789ء سے 1791ء کے اختتام تک کے واقعات پر مشتمل ہے جبکہ باقی حصے میں برطانوی آئین اور فرانس میں 1791ء میں جاری ہونے والے فرمان سے تقابل پر مشتمل ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ مؤخر الاذکر کو برتری حاصل تھی۔ اس مرحلے پر یہ یاد رکھنا لازم ہے کہ فرانس میں تب بھی بادشاہت برقرار تھی اور وہ اُس کی حمائت بھی کرتا رہا تھا گو کہ تھامس پائین جمہوریت کا علمبردار تھا اس کے باوجود اس نے اس حقیقت کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لیکن اس نے ''انسان کے حقوق'' میں بہت

زیادہ زور نہیں دیا۔

تھامس پائین کی تحریریں سوائے چند ایک اقتباسات چھوڑ کر اس پیرائے میں ہوا کرتی تھیں جو عام لوگوں کی سوجھ بوجھ سے مطابقت رکھتی تھیں اُس نے پٹ کی مالی پالیسیوں (جن کو بعد میں کوبیٹ نے آگے بڑھایا اور جو خزانے کے انچارج کو لازمی طور پر اپیل کی شکل میں ہونی چاہیے تھیں) کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ ''کم ہوتے ہوئے فنڈز سے حکومت کی طرف سے قرضوں کی آمیزش کرنا ایسے ہی ہے جیسے لکڑی کی بیساکھیوں والے انسان کو ہرن کا پیچھا کرنے پر لگا دیا جائے کہ جوں جوں ریس طویل ہوتی جائے توں توں اُنکے درمیان فاصلہ طویل تر ہوتا جائے'' اُس نے کوبیٹ کی طرز پر جُملہ بازی سے کام لیتے ہوئے اُسے ''کمہار کا کاغذی کرنسی سے خوش طبعی سے کھیل میں مصروف شخص'' قرار دیا۔ یہ پُر مغز اور معنی سے بھرپور محاورہ موقع کی مناسبت سے اتنا موثر ثابت ہوا کہ کوبیٹ سے ماضی کی دُشمنی حال کی تعریف میں بدل گئی۔ تھامس پائین کا موروثیت پر اعتراض اصولی نوعیت کا تھا جس سے برک اور پٹ دونوں ہی خوف زدہ ہو گئے اور پھر آہستہ آہستہ ہٹلر اور مسولینی جیسے دُنیا بھر کے سیاستدانوں میں اس سے دُشمنی ایک مُشترکہ عنصر اختیار کر گئی اس کا طرزِ تحریر کسی طرح بھی اشتعال انگیز نہ تھا البتہ تُند اور بے باکانہ ضرور تھا اور یہ بھی کہ وہ اتنا بُرا بھی نہ تھا کہ اُسے گالیاں قرار دیا جا سکے تاہم اُس کے مخالفین کی زبان اُس کے بارے میں غلیظ گالیوں سے بھرپور رہتی تھی۔

آخر کار پٹ نے اُس کے خلاف قانونی کاروائی کا آغاز ''انسان کے حقوق'' پر پابندی سے کر دیا۔ پٹ کی اپنی بھتیجی لیڈی ہسکر سٹان ہوپ کے مطابق کہ ''وہ پٹ کہا کرتا تھا کہ تھامس پائین بجا طور پر حق پر ہے لیکن اب میں کیا کروں؟ اگر اس کے خیالات کو یوں ہی پنپنے دیا گیا تو پھر وہ وقت زیادہ دُور نہیں جب ہمیں ایک خونی انقلاب سے گذرنا پڑ جائے۔ تھامس پائین نے اپنے خلاف الزامات کا بڑی جرأت مندی اور شعلہ بیان تقریروں سے مقابلہ کیا۔''

لیکن اُسی دوران ستمبر میں قتل و غارت کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ اُدھر انگلش ٹوریوں کا اُس کے خلاف صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ اس پس منظر میں اس کے ایک دور اندیش بلیک نامی شاعر نے اُسے متنبہ کیا کہ اگر وہ یونہی انگلینڈ میں قیام پذیر رہا تو بہت جلد پھانسی کا پھندا اُس کے گلے میں ہوگا۔ چنانچہ تھامس پائین کی خوش قسمتی کہ لندن سے فرانس روانگی کے چند گھنٹے بعد اس کی رہائش گاہ پر گرفتاری کے لیے چھاپہ پڑا جبکہ ڈووَر سے روانگی کے 20 منٹ بعد پولیس وہاں پہنچی اور پھر سرحدی حکام نے اُسے اس لیے نکلنے دیا کیونکہ اس کی جیب میں واشنگٹن کے ہاتھ کا لکھا ہوا تازہ دوستانہ نوعیت کا ایک خط موجود تھا۔

اگرچہ انگلینڈ اور فرانس کے درمیان ابھی جنگ شروع نہیں ہوئی تھی پھر بھی تھامس پائین کو ڈووَر

اور کلیز Calais مختلف دُنیاؤں کا منظر پیش کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اب تھامس پائین کو فرانس میں اعزازی شہریت حاصل ہو چکی تھی۔ اُسے تین حلقہ ہائے انتخاب کے کنونشن میں واپس بھیجا جا چکا تھا اُن میں سے کلیز بھی ایک حلقہ تھا جہاں اس کا زبردست استقبال ہونے جا رہا تھا۔ کلیز میں جب اُس نے فرانس کی سرزمین پر قدم رکھا تو اُسکا سرکاری سطح پر خیر مقدم کرتے ہوئے اُسے توپوں کی سلامی دی گئی فوجی افسران اس سے بغل گیر ہوئے اور خوبصورت خواتین نے اُس کو خوش آمدید کہا۔

پیرس پہنچنے پر اس کا عمومی رویہ دانائی سے زیادہ عوامی جذبات کی عکاسی کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ستمبر کے قتل عام کے باوجود اُسے یہاں امریکی طرز کے معتدل نوعیت کے انقلاب (جس میں اس کی اپنی بے پناہ تگ و دَو شامل تھی) کی توقع کرتی تھی۔ اس سلسلے میں اس نے جیرونڈنز Girondins سے جہاں قریبی تعلقات استوار کر لیے وہیں لافائیٹے Lafayette (جواب زیر عتاب تھا) کی مذمت کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ اُلٹا امریکی ہونے کے ناطے سے لوئس XVI کی طرف سے امریکی آزادی میں گزشتہ امداد کی شکر گزاری کے حوالے سے بادشاہ کی تعریف میں جت گیا وراس کی پھانسی کی سزا کی آخری لمحے تک مخالفت کرتا رہا یوں جیکوبن اُس کی جان کے دُشمن ہو گئے۔ چنانچہ سب سے پہلے اُسے کنونشن سے خارج کر دیا گیا اور اُسے غیرملکی ہونے کے حوالے سے جیل میں ڈال دیا۔ رابسپیئر Robispiere کے پورے دور اقتدار کے علاوہ بھی مزید چند مہینوں کے لیے وہ قید کی صعوبتیں جھیلتا رہا۔ اس پر تشدد کی ذمہ داری مکمل طور پر فرانسیسیوں پر نہیں ڈالی جا سکتی بلکہ امریکی وزیر مورس بھی اس میں برابر کا حصہ دار تھا کیونکہ وہ بنیادی طور پر فیڈریشن کا حامی تھا اور اس نے انگلینڈ اور فرانس کے درمیان جنگ میں انگلینڈ کا ساتھ دیا مزید یہ کہ تھامس پائین ماضی بعید میں ایک دفعہ امریکی جنگ آزادی کے دوران متذکرہ وزیر کے ایک قریبی دوست کی کرپشن کو بے نقاب کر چکا تھا۔ لہٰذا یہ اُس کے لیے بدلہ چکانے کا سنہری موقع تھا۔ اس لیے اس نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ ''تھامس پائین چونکہ امریکی شہری ہی نہیں لہٰذا وہ اس سلسلے میں کچھ بھی کرنے سے قاصر ہے'' دوسری طرف واشنگٹن خود بھی انگلینڈ سے خفیہ طور پر ایک معاہدے کے لیے تبادلہ خیال میں مصروف تھا مزید یہ کہ وہ کسی طرح بھی نہیں چاہتا تھا کہ فرانس میں کسی قسم کا ایسا ناخوشگوار ماحول پیدا ہو جس میں امریکا کے بارے میں یہ تصور پایا جائے کہ وہاں رُجعت پسندی پنپ رہی ہے۔ تھامس پائین پھانسی کے پھندے سے تو حادثتاً بچ گیا لیکن شدید بیماری کی وجہ سے تقریباً موت کے منہ میں چلا گیا۔ ادھر امریکا میں مورس کو برطرف کر دیا گیا اور اس کی جگہ منرو Monro (جس کے بارے میں منرو ڈاکٹرائین مشہور ہے) مقرر ہوئے جنہوں نے اس کی رہائی کا فوری بندوبست کر کے اپنے ہی گھر میں مہمان ٹھہرا لیا جہاں اس کی بہترین نگہداشت ہوتی رہی آخر کار اٹھارہ ماہ بعد وہ مکمل صحتیاب ہو گیا۔

تھامس پائین کو ہرگز یہ علم نہ تھا کہ اس کی بدقسمتی میں مورس کا کتنا بڑا ہاتھ تھا۔ البتہ وہ اپنی زندگی میں واشنگٹن کو کبھی معاف نہ کر سکا۔ چنانچہ اس کی موت کے بعد جب یہ خبر گرم ہوئی کہ اب اس عظیم شخصیت کا مجسمہ بھی عنقریب بننے جا رہا ہے تو تو اس نے مجسمہ ساز کو مخاطب کرتے ہوئے یہ اشعار کہے:

میرے اندر سے نفرتوں سے ڈھلے ہوئے ٹھوس و سخت پتھر مجھ سے لو یہ واشنگٹن ہے
جس کا مجسمہ تراشنے کے لیے نفاست و نزاکت یا کسی انوکھی اختراع اور محنت کی ضرورت نہیں
لیکن اگر کہیں چھینی سے تراشنے کی ضرورت بھی پڑ جائے تو ضرب زوردار ہونی چاہیے
اور وہ بھی اُس کے عین دل پر ''احسان فراموشی'' کنندہ کر دینا

یہ اشعار تو غیر شائع شدہ ہی رہے لیکن 1796ء کے آخر میں واشنگٹن کے نام ایک طویل تلخیوں سے بھرپور خط ضرور شائع ہوا جس کا کچھ حصہ مندرجہ ذیل ہے۔

''جناب عالیٰ گذارش ہے کہ جیسے کہ آپ کی نجی زندگی میرے ساتھ ہمیشہ دوستی کے پردے میں دغا بازی سے عبارت رہی ہے اور جیسے کہ زندگی میں آپ جس طرح کے منافق پائے گئے ہیں۔ اس کے پیش نظر پوری دنیا اس تذبذب میں مبتلاء ہے کہ آپ مُرتد کے طور پر پہنچانے جائیں یا پرلے درجے کے مکار اور کیا آپ اعلیٰ اصولوں کو ترک کر چکے ہیں یا یہ کہ آپ کا کبھی کوئی اصول تھا ہی نہیں۔''

ہوسکتا ہے یہ الفاظ ان لوگوں کے لیے نہایت تکلیف دہ ہوں جن کے اذہان نے اَن گنت دیومالائی قصوں اور کہانیوں کی مدد سے واشنگٹن کا دِل آویز تصور بُن رکھا ہو۔ لیکن 1796ء وہ سال ہے جب امریکی صدارت کے لیے سب سے پہلے مقابلے میں جیفرسن اور آدم کا آمنا سامنا ہوا۔ واشنگٹن نے اپنی پوری سیاسی قوت آدم کے حق میں استعمال کرنا شروع کر دی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ آدم بادشاہت اور اشرافیہ کا بہت بڑا علمبردار ہے۔ مزید یہ کہ واشنگٹن فرانس اور انگلینڈ کی جنگ میں انگلینڈ کی طرف داری کرتا رہا۔ قصہ مختصر یہ کہ اس نے اپنی اس تمام مہم کے دوران ان تمام جمہوری قدروں کو تہس نہس کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جن کی بدولت وہ خود اتنی بلندی پر فائز ہوا۔ اس کی ذاتی پسند و ناپسند اور انا پرستی اور دوسرے ایسے پبلک حقائق موجود ہیں جن کی بنیاد پر بجا طور پر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ تھامس پائین کے مذکورہ بالا تلخ الفاظ بلا جواز نہیں تھے۔

واشنگٹن کے لیے تھامس پائین کو اس کی بگڑتی ہوئی صحت کے پیش نظر جیل میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ اگر اس جلد باز قسم کے شخص نے اپنی آزادی کے دنوں میں اپنی ادبی سرگرمیوں کے دوران ان مذہبی

آراء کا اظہار نہ کیا ہوتا جن کا ذکر وہ پہلے ہی واشنگٹن، جیفرسن اور آدم سے کر چکا تھا۔ جبکہ یہ سب لوگ کسی بھی غیر روایتی پن کو بڑی احتیاط سے چھپائے رکھنے کے فن میں ماہر تھے۔ تھامس پائین مستقبل قریب میں اپنی جیل یاترا کو بھانپ چکا تھا۔ چنانچہ اس کا انتظار کرنے کی بجائے دلیل کا دور "The Age of Reason" نامی کتاب لکھنے میں مصروف ہو گیا جس کا پہلا حصہ اس کی گرفتاری سے صرف 6 گھنٹے قبل مکمل ہو سکا تھا۔ اس کتاب کے مندرجات سے اس کے نہ صرف ہم عصر لوگوں کو بہت صدمہ پہنچا بلکہ ان کو بھی جو اس کی سیاست سے اتفاق کرتے تھے۔ اگر آج ہم اس کا مطالعہ کریں تو سوائے چند ایک تلخ اقتباسات کے اس میں ایسا کچھ بھی نہیں پایا جاتا جس سے کوئی پادری بھی اتفاق نہ کرے۔ پہلے باب میں اس کا کہنا ہے "میں ایک خدا پر یقین رکھتا ہوں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس دنیا کے بعد آخر میں مجھے خوشی کے حصول کی پوری اُمید ہے۔"

"میں انسانی مساوات پر یقین رکھتا ہوں۔ انصاف، محبت، رحم اور کرہ اَرض پر تمام انسانوں کی خوشیوں کے حصول کے لیے جدوجہد میرے مذہبی فرائض میں شامل ہے۔"

یہ اُس کی طرف سے محض خالی خولی لفاظی نہیں تھی۔ اجتماعی معاملات میں پہلی دفعہ حصہ لیتے ہوئے اس نے 1775ء میں غلامی کے خلاف آواز بلند کی تب سے اپنی مرگ تک ظلم و جبر کی ہر شکل کے خلاف جدوجہد میں مصروف رہا چاہے وہ ظلم اس کی اپنی پارٹی ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو جبکہ مخالفین کی طرف سے کی گئی کسی ناانصافی کی مخالفت کرنا اس کی فطرت میں شامل تھا۔ انگلستان کی حکومت اور اقتدار پر اس وقت گنتی کے چند لوگ اس ظالمانہ طریقے سے چھائے ہوئے تھے کہ وہ ذِلتوں کے مارے پست ترین طبقات کے معیار زندگی کو مزید کم کرنے کے لیے پوری پارلیمنٹ کو ایک ذریعے کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ تھامس پائین نے اس بیہودگی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے سیاسی اصلاحات کا اِس شدت سے مطالبہ کیا کہ حکومت اِس کے ایسے پیچھے پڑی کہ اُسے اپنی جان بچا کر فرانس فرار ہونا پڑا۔ وہاں فرانس میں بِلا جواز خونریزی کی مخالفت کی وجہ سے اُسے جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں سے وہ ایک دفعہ پھر موت کی سزا سے بال بال بچا۔ اِدھر امریکا میں غلامی کی شدید مخالفت اور امریکی آزادی پر اعلان کردہ اصولوں کی شدت سے حمایت کی وجہ سے حکومت نے تھامس پائین سے اس وقت لاتعلقی اختیار کر لی جب تھامس پائین کو اس کی حمایت اور مدد کی سخت ضرورت تھی۔ جس طرح تھامس پائین مذہب کے بارے میں بہت اچھے وچار رکھتا تھا اور بے شمار لوگ اس وقت بھی موجود تھے جو اس کے ہم خیال پائے جاتے تھے۔ لیکن میرے خیال میں اگر مذہبی تعلیمات، اِنصاف کرنا، احساس رحم سے لگاؤ رکھنا اور ساتھی لوگوں کی خوشیوں کا باعث بننے کا درس دیتی ہیں تو اِس کے مخالفین میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو مذہبی ہوتا۔

"دلیل کا دور، Age of Reason" نامی کتاب کا بڑا حصہ اِخلاقی نقطہ نظر سے عہد نامہ قدیم کی

تنقید پر مشتمل ہے۔ آج کل تورات اور جوشوع کی کتاب کے مندرجات کے مطابق مردوں، عورتوں اور بچوں کے قتل عام کو پاکبازی کا نمونہ قرار دینے والوں کی تعداد تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن تھامس پائین کے دنوں میں عہد نامہ پر کسی قسم کے تنقید عظیم گناہ کے زمرے میں آتی تھی چنانچہ اس کی تنقید کے جواب میں لاتعداد مقدس حوالے لکھے گئے اس کے نقادوں میں ایک قدرے آزاد خیال بشپ لانڈوف بھی شامل تھا۔ وہ عہد نامہ قدیم کی صفائی دینے میں اس حد تک چلا گیا جہاں اُسے یہ اعتراف بھی کرنا پڑا کہ تورات کے کچھ حصے موسیٰ کے تحریر کردہ ہی نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ زبور میں کچھ مناجات ایسی بھی موجود ہیں جنہیں پیغمبر داؤد سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ یہ معمولی سی رعایت بھی بشپ کے لیے جارج سوئم کی خفگی کا باعث بن گئی اور یوں وہ زیرِ عتاب آ گیا۔ بشپ حضرات بڑے عجیب وغریب انداز سے اُسے تنقید کا نشانہ بناتے رہے مثال کے طور پر ''دلیل کا دور'' میں خدا پر شک کرنے کی گستاخی کی گئی ہے کہ خدا نے ایک ابراہیمی قبیلے میں سے اُن سب مردوں اور عورتوں کو قتل کرنے کا حکم جاری نہیں کیا تھا جو شادی شدہ تھے۔ جبکہ کنواریوں کو محفوظ رکھنے کا حکم کسی بدی کے پیش نظر نہیں ہوا تھا۔ جیسا کہ تھامس پائین اپنی مکاری کی بنا پر باور کراتا ہے بلکہ انہیں باندی بنا کر رکھنا مقصود تھا جو کسی طرح بھی اخلاقی اعتبار سے قابل اعتراض نہیں۔''

آجکل کے روایت پسند بھول چکے ہیں کہ آج سے ایک سو چالیس سال قبل روایت پرستی کس قسم کے کٹر پن سے عبارت تھی اور وہ اِس حقیقت کو تو مکمل طور پر فراموش کر چکے ہیں کہ یہ تھامس پائین جیسے بہادر لوگ ہی تھے جو خود پر بے پناہ تشدد کا سامنا کرنے کے باوجود حق کی آواز بن کر ڈٹے رہتے ہوئے مذہبی کٹر پن میں نرمی کا باعث ہوئے اور جن کی بدولت آج ہم فیضیاب ہو رہے ہیں۔ لیکن تھامس پائین کا اپنا کیا حال کیا گیا اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی اپنی وصیت کے مطابق کوایکروں کے قبرستان میں کسی کوایکر (مسیحی فرقے کا نام) نے بھی اِس کی تدفین سے انکار کر دیا۔ بالآخر اس کی تدفین تو ہو گئی اگرچہ اس کے جنازے میں فقط ایک کوایکر کسان ان چند لوگوں میں شامل تھا جو قبرستان تک گئے۔

''دلیل کا دور'' کے بعد تھامس پائین کی کسی قابلِ ذکر تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ طویل عرصے تک علیل رہا اور جب صحتیاب ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ اب فرانس میں اس کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہی۔ نپولین نے اس سے کوئی برا سلوک نہیں کیا۔ لیکن فطری طور پر اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے کسی کام کا نہیں سوائے اس کے کہ وہ انگلینڈ میں جمہوریت پسند ہونے کے ناطے کسی ممکنہ بغاوت میں اس کے ایجنٹ کے طور پر کام آ سکے۔ اس صورت حال میں اسے امریکا کی شدت سے یاد ستانے لگی جہاں اُسے ماضی میں بہت بڑی کامیابی اور بے پناہ مقبولیت نصیب ہوئی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہاں جا کر فیڈرلسٹوں کے خلاف جیفرسن کی مدد کرے لیکن انگریزوں کے ہاتھوں گرفتاری کے خوف سے (اگر وہ اُن کے ہاتھ آ جاتا تو

یقینی طور پر پھانسی پر چڑھا دیا جاتا) امینز معاہدے تک فرانس ہی میں مقیم رہا۔ آخر کار 1802 میں بالٹی مور پہنچ کر اس وقت کے صدر جیفرسن کو ایک خط لکھا:

''میں ہیور سے ساٹھ دنوں کے سفر کے بعد ہفتے کو یہاں پہنچا ہوں۔ میرے سامان میں بڑی تعداد میں ماڈلز اور پہیے وغیرہ موجود ہیں جونہی جہاز سے اپنے سامان کو اُتروانے میں کامیاب ہو کر اُسے جارج ٹاؤن کے لیے روانہ کرنے سے فارغ ہوتا ہوں میں آپ کی خدمت میں فوراً حاضر ہوں گا آپ کا احسان مند شہری۔''

تھامس پائین

اُسے پختہ یقین تھا کہ سوائے فیڈرلسٹیوں کے اس کے تمام پرانے دوست اس کا پُرتپاک خیر مقدم کریں گے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ جیفرسن کو کانٹے دار صدارتی مہم کے دوران ہر فرقے اور ہر رنگ کے پادریوں کی طرف سے انتہائی بددیانتی سے لگائے گئے کُفر کے فتوؤں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے مخالفین تھامس پائین سے اس کے قریبی تعلقات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے میں اس حد تک چلے گئے کہ جیفرسن اور تھامس پائین کی دوستی کو دوعدد ٹام کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ (تھامس پائین ٹام کے نام سے زیادہ مشہور تھا) اور یوں وہ جیفرسن کی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچانے پر تُلے ہوئے تھے۔ اُدھر گو کے بیس سال کا طویل عرصہ گذر چکا تھا۔ لیکن جیفرسن بذات خود تب بھی اپنے ہم وطنوں کے عقیدے سے اس قدر متاثر تھا کہ اس نے ایک توحید پرست پادری کو جواب دیتے ہوئے (وہ پادری اس خط کو شائع کرنا چاہتا تھا) لکھا کہ ''ناچ گانے اور اداکاری کے رسیا پاگل ایتھنز کے باشندے کی کھوپڑی میں جب تک دلیل اور معقولیت داخل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا اس وقت تک مجھے آگ اور کالون Calvin کی لکڑیوں کے گٹھے اور اس کے شکار سرویٹس (Servetus سرویٹس سپین کا باشندہ تھا جسے مذہبی انحراف کی بنا پر زندہ جلا دیا گیا تھا) کے انجام سے بہت دور رکھے گا۔ لیکن جب سرویٹس جیسے انجام کا خطرہ جیفرسن اور اس کے پیروکاروں کے سر پر منڈلانے لگا تو بجائے اس کے کہ وہ اِس کا بہادری سے مقابلہ کرتے انہوں نے تھامس پائین سے ہی لاتعلقی کا اظہار کر دیا۔ اگرچہ تھامس پائین سے ان کا مجموعی رویہ کافی حد تک نرم رہا اور تھامس پائین کو بھی اُس کے خلاف کوئی شکوہ نہ تھا البتہ دوستی وہیں دفن ہو کر رہ گئی۔

چنانچہ ان دنوں اس سماج کے دوسرے حلقوں میں بھی اسے اس سے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مثال کے طور پر فلاڈلفیا کا ڈاکٹر رُش امریکا میں اس کا سب سے پہلا دوست ہوا کرتا تھا اس نے اس سے

ہر قسم کا ناطہ توڑنے پر ہی اِکتفا نہیں کیا بلکہ اُلٹا اس کے خلاف یہ لکھا ''تھامس پائین نے اپنی دلیل کا دور'' نامی کتاب میں ایسی توہین آمیز تحریریں درج کر رکھی ہیں کہ جن کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں نے تہیہ کرلیا ہے کہ آئندہ کبھی اس سے بات تک نہیں کروں گا'' اس کے اپنے ہمسائیوں نے اس کے خلاف محاذ کھڑا کرلیا۔ بلکہ ایک سٹیج ڈرامے کے دوران کسی جگہ بھی آرام سے بیٹھنے سے منع کر دیا اس کی موت سے تین سال قبل اُسے غیر ملکی قرار دیتے ہوئے ووٹ کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ شراب کا عادی ہونے کے علاوہ اس پر اخلاقی جرائم سے متعلق طرح طرح کے جھوٹے الزامات لگائے گئے۔ قصہ مختصر اُس کے آخری ایام تنہائی، افلاس اور بیچارگی کی حالت میں گزرے۔ آخر کار 1809ء میں وفات پا گیا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جب وہ زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا تو دو عدد پادری اس کے کمرے میں داخل ہو کر اس کو اس کا فرقہ بدلنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ جس کے جواب میں وہ صرف یہ کہہ سکا ''گڈ مورننگ، مجھے آپ اکیلا چھوڑ دیں''، لیکن اُن پادریوں نے باہر آکر یہ مشہور کر دیا کہ بالآخر اس نے اصل مسیحیت قبول کر لی، اور عام لوگوں نے بھی اس بات پر من و عن یقین کر لیا۔

اُس کی وفات کے بعد اس کی شُہرت امریکا سے زیادہ انگلینڈ میں ہوئی۔ اگرچہ اس کی تصانیف کی اشاعت ممنوع تھیں لیکن اس جرم کی خلاف ورزی بار بار اور وقتاً فوقتاً ہوتی رہی۔ جس کے لیے بہت سے لوگوں کو جیل کی ہوا کھانی پڑی اور آخری بار اس خلاف ورزی کے مرتکب 1819ء میں رچرڈ کارلائل اور اس کی بیوی پائے گئے میاں کو تین سال قید اور 1500 پونڈ کا جرمانہ جبکہ بیوی کو ایک سال قید اور 500 پونڈ جرمانے کی سزا ہوئی۔ اسی سال کے دوران کوبیٹ اس کی ہڈیاں امریکا سے انگلینڈ لے آیا اور اُسے جمہوریت کی خاطر بہادری سے لڑنے والا ہیرو قرار دیا۔ لیکن کوبیٹ نے اس کی ہڈیوں کو کبھی ایک جگہ پڑا نہیں رہنے دیا اور جیسے کہ اُس نے سوچ رکھا تھا کہ اُس کی ایک شاندار یادگار تعمیر کی جائے گی لیکن وہ یادگار کبھی تعمیر نہ ہو سکی پارلیمنٹ کے علاوہ کئی دوسرے شہروں میں بھی اُس کی باقیات کی آمد کے بارے میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ بولٹن میں ایک مقامی منادی والے کو اُن کی آمد کا اعلان کرنے کے جرم میں نو ہفتے قید کی سزا ہوئی۔ 1836ء میں کوبیٹ سے یہ ہڈیاں چانسلر تک پہنچیں تو اس نے اِنکو قومی ورثہ ماننے سے انکار کر دیا۔ 1854ء میں محترم آر اینسلائی Rev R Ainslie (جو ایک توحید پرست تھے) نے ای ٹرکلو E. Truclove کو بتایا کہ ''میں نے تھامس پائین کی کھوپڑی اور دایاں ہاتھ خرید لیا تھا''، لیکن اس کے بعد کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔ اب نہ تو اس کی کسی ہڈی کا اَتہ پتہ ہے اور نہ ہی اس کی کھوپڑی اور دائیں ہاتھ کا کہیں نشان ملتا ہے۔

تھامس پائین نے اپنے پیچھے دو طرح کے اثرات چھوڑے امریکی انقلاب کے دوران عوام کے جوش و جذبے میں اضافے کے حوالے سے اُس کی تحریریں بہت کام آئیں اور لوگوں کے اندر اعتماد پیدا کیا

یوں وہاں انقلاب برپا ہونے کے لیے آسانیاں فراہم کیں۔

فرانس میں اس کی مقبولیت بہت عارضی اور سطحی قسم کی تھی لیکن انگلینڈ میں اس نے پٹ اور لیورپول کے مظالم کے خلاف پلبیین ریڈیکلز (Plebeian Radicals) جیسی زبردست تحریک کی بنیاد رکھی۔ اس کی بائبل کے متعلق آراء ایسی تھیں جن سے اس کی توحید پرستی سے بھی زیادہ اس کے ہم عصروں کو ذہنی دھچکا محسوس ہوا لیکن وہ ایسی نوعیت کی تھیں جن سے آج کا آرچ بشپ بھی متفق پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے پیروکار وہی تھے جنھوں نے اسی سے وہ تحریک پائی جو اس کے اندر سے پھوٹی تھی اور اسی کے تحت وہ تمام لوگ جنھوں نے انسانی آزادی کے لیے بے جگری سے جدوجہد کی اور سختیاں جھیلیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں قصہ مختصر چارٹسٹوں، ٹریڈ یونینسٹوں اور سوشلسٹوں کے لیے جرأت و ہمت کی مثال قائم کی۔

جب عوامی فلاح و بہبود کا مسئلہ سر اُٹھاتا تب وہ ہر قسم کی مصلحت اور دُور اندیشی سے بے نیاز ہو جاتا لیکن دنیا اسے سزا دینے پر تُل جاتی کیونکہ یہ دنیا کی روایت رہی ہے کہ جو ذاتی مفاد قربان کردے اُسے ضرور اس کی سزا ملتی ہے۔ چنانچہ اگر وہ ذرا سا بھی مصلحت سے کام لیتا تو اس کا بڑا نام ہوتا کیونکہ بے پناہ تعریف کے حصول کے لیے دنیاوی عقل و فہم اور سمجھوتا بازی بہت ضروری ہوتی ہے یہی وہ عنصر تھا جس سے وہ محروم رہا۔

باب ۔۔۔ ۹

نفیس لوگ

اس سے پہلے کہ میں نفیس لوگوں کی تعریف میں کچھ لکھوں میں اپنے قارئین کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ نفیس لوگوں سے میری کیا مراد ہے؟ اور مجھے یقین ہے میرا ہر قاری بھی سب سے پہلے یہی جاننا چاہے گا۔ اُن نفیس لوگوں میں کس قسم کی خصوصیات کا پایا جانا لازم ہے شاید یہ طے کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا میں ایسے لوگوں کی اقسام گنوانے کی کوشش سے اس کی شروعات کرنا چاہوں گا جو اس عنوان پر پورا اُترتے ہیں۔

کنواری آنٹیاں ہمیشہ نفیس ہوتی ہیں خاص طور پر وہ جو مالدار بھی ہوں۔ کلیسا کے پادری بھی بڑے نفیس ہوتے ہیں البتہ اُن میں وہ شامل نہیں جو کسی طائفہ کی رُکن کیساتھ بہلاوے، پھسلاوے، قسمیں وعدے سے کام لیتے ہوئے جنوبی افریقہ فرار ہو جاتے ہیں لیکن ایسا شاز و نادر ہی ہوتا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آجکل کی نوجوان لڑکیاں شاید اس زمرے میں آتی ہی نہیں جب میں خود نوجوان تھا اُن دِنوں وہ بہت نفیس ہوا کرتی تھیں۔ وہ اپنی والدہ کیساتھ مختلف موضوعات کے بارے میں تبادلہ خیال کرتیں جس میں غیر معمولی بات یہ تھی کہ مختلف افراد زیرِ بحث آتے حتیٰ کہ نوجوان مردوں کا ذکر بھی آتا رہتا تھا اور جب مناسب ہوتا تو ''نو ماما'' یا ''یَس ماما'' کہتے ہوئے بڑے ادب سے جواب دیا کرتیں۔ اپنے والد سے بھی بہت پیار کرتیں کیونکہ ایسا کرنا اُنکا فرض تھا اور والدہ سے بھی بہت محبت کرتیں کیونکہ وہ ہمیشہ اُن کا اس پیرائے میں خیال رکھتیں کہ اُن کی بیٹی پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے پائے مزید یہ کہ وہ کسی معمولی سی بُرائی میں ملوث نہ ہو پائیں۔ جب اُن کی منگنی ہو جاتی تو بڑی ملائمیت سے گنگنانے لگتیں۔ جب شادی ہو جاتی تو اپنا فرض جان کر اپنے اپنے خاوند سے محبت کرنے کیساتھ دوسری عورتوں کو بھی یہ باور کراتیں کہ یہ فرض ادا کرتے ہوئے اُنہیں دُشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اپنے سُسرال والوں سے نہایت عمدگی سے پیش آتے ہوئے بلواسطہ طور پر یہ بھی واضع کر دیتیں کہ اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ ایسے پیش نہ آتا۔ وہ دوسری عورتوں کے بارے میں کینہ پرور گفتگو سے پرہیز کرتیں البتہ اپنی گفتگو کے دوران اپنے ہونٹوں کو جان بوجھ کر یوں سُکیڑ کر رکھتیں کہ اُن کے مخالف کو اُن کی چھپی ہوئی نفرت نظر آ جائے جس کے اظہار سے وہ اپنی فرشتہ صفت سیرت کی وجہ سے

قاصر ہیں۔ یہ وہ ایسی قسم ہے جس کو ہم خالص اور معزز خاتون کہتے ہیں۔ صد افسوس یہ قسم عمر رسیدہ لوگوں کے علاوہ اب کہیں نہیں پائی جاتی۔

کمال مہربانی سے جو بچ گئیں وہ آج بھی سماجی اعتبار سے بڑی قوت ہیں۔ تعلیم پر انہیں پورا کنٹرول حاصل ہے جہاں وہ آج بھی کامیابی سے ملکہ وکٹوریہ کے دور کی منافقت کے معیار برقرار رکھنے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔ جنہیں ہم اخلاقی مسائل کہتے ہیں اُنکے بارے میں قانون سازی پر بھی انہیں کا کنٹرول ہے اور یوں اُنہیں نے نہ صرف غیر قانونی دھندے کو تخلیق کیا بلکہ اُسے انتہائی بلندیاں عطا کیں۔ وہ اس اَمر کو یقینی بناتی ہیں کہ جو نوجوان اخبارات میں لکھتے ہیں اُن پر لازم ہے کہ اپنے کالموں میں اپنی بجائے اُنہیں عمر رسیدہ خواتین کی آراء کا اظہار کیا کریں۔ اس طرح وہ نوجوانوں کے سٹائل اور اُنکے نفسیاتی تصورات میں وسعت اور تنوع کا باعث بنتی ہیں۔ وہ ایسی اَن گنت سرور انگیز روایات کو بھی زندہ رکھیں ہوئے ہیں جو اگر یہ نہ ہوتیں تو اُن پر بار بار عمل جاری رہنے سے بوریت کی بدولت اپنی موت آپ مر چکی ہوتیں۔ اس سلسلے میں سٹیج پر سے غلیظ زبان کا سننا یا عام رواج سے تھوڑا سا زیادہ وہاں جلد کو برہنہ رکھنا جیسی کئی مثالیں موجود ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شکار جیسی لُطف انگیز روایت کو بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ انگلینڈ جیسی ہم آہنگ وہم رنگ آبادی میں جہاں لومڑ کا شکار کرنے والوں کو ناپسند کیا جاتا ہے وہیں اس کا شکار بہت مہنگا اور بعض دفعہ خطرناک بھی ثابت ہوتا ہے۔ مزید براُں لومڑ تو زیادہ وضاحت سے اظہار نہیں کر سکتے کہ اُن کا اپنا شکار ہونا اُنہیں کس قدر ناپسند ہے۔ اس سارے معاملے سے قطع نظر خود انسان کا شکار سب سے عمدہ اور دلچسپ کھیل ہے۔ اگر یہ نفیس لوگ نہ ہوتے تو پھر روشن ضمیری کیساتھ انسان کا شکار بے حد مُشکل ہوتا۔ نفیس لوگوں کے نزدیک جو لوگ قابل مذمت ہوتے ہیں وہی تو عُمدہ شکار ہوتے ہیں ادھر للکار اور شکار کی آوازیں گونجتی ہیں اُدھر شکار کے گرد شکاری اکٹھے ہوجاتے ہیں۔ بالآخر شکار کی قسمت جیل ہوتی ہے یا پھانسی اور اگر شکار کھیلتے ہوئے کوئی عورت ہاتھ آجائے تو لُطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس سے جہاں اُن عورتوں کے جذبہ حسد کی تسکین ہوتی ہے وہیں مردوں کی اذیت پسندی کا سامان بھی مہیا ہوتا ہے۔ مجھے ایک غیر مُلکی خاتون یاد ہے جو یہاں انگلینڈ میں ایک شخص کیساتھ مقیم تھی اگرچہ اُس عورت کا قیام غیر قانونی تھا وہ دونوں ایک دوسرے سے بڑے پیار ومحبت سے رہ رہے تھے شومئ قسمت اُس کی سیاسی آراء اتنی رُجعت پسندانہ نہ تھیں جتنی کہ اُس سے توقع ہو سکتی اور پھر اُس نے اُنہیں "دُرست" کرنے کے لیے کُچھ نہ کیا گو وہ محض خیال ہی تو تھے لیکن اِنکو بہانہ بنا کر اُس بیچاری خاتون کے پیچھے نفیس لوگوں نے سراغ کے لیے سکاٹ لینڈ یارڈ کو لگا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کو بے یارو مددگار بھوک سے مرنے کے لیے واپس اُس کے وطن بھیج دیا گیا۔ یہاں انگلینڈ اور امریکا میں غیر مُلکیوں کو نفرت سے بھرپور جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم سب یہاں کی پولیس کے

نہایت ممنون ہیں کہ وہ اس معاملے میں بے حد احتیاط سے کام لیتے ہوئے صرف اُن غیر مُلکیوں کو ہمارے درمیان رہنے کی اجازت دیتی ہے جو غیر معمولی طور پر پرہیز گار ہوں۔

یہ فرض کر لینا لازم نہیں کہ نفیس لوگوں میں محض عورتیں ہی شامل ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اُن کی تعداد مردوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ کلیساء کے پادریوں کے علاوہ بھی بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو نفیس ہونے کے ذمرے میں آتے ہیں۔ مثلاً وہ لوگ جنہوں نے جھولیاں بھر بھر دولت کمائی اور اب ریٹائر ہو کر وہ اُس دولت کو خیراتی کاموں میں خرچ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور پھر مجسٹریٹ حضرات تو ہمیشہ ہی نفیس قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قانون کی تائید کرنے والے سب لوگ نفیس ہوتے ہیں جب میں خود نوجوان تھا تو میں نے ایک نفیس عورت کو پھانسی کی سزا کے خلاف دلیل دیتے ہوئے سُنا کہ خود جلاد کا بھی نفیس ہونا بہت مُشکل ہے۔ میری آج تک کسی جلاد سے مُلاقات نہیں ہوئی۔ اسلئے میں آج تک اُس کی اس دلیل کی آزمائش کرنے میں ناکام رہا ہوں تاہم میں ایک ایسی خاتون کو جانتا ہوں جس کی ملاقات کسی جلاد سے سفر کے دوران ٹرین میں ہوئی۔ یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہے سخت سردی ہونے کے پیش نظر اُس کو ایک موٹے اُونی کمبل کی پیشکش کر دی۔ جس کے بعد جلاد نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ مادام اگر آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ میں اصل میں کون ہوں تو آپ یہ پیشکش نہ کرتیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جلاد بھی واقعی نفیس قسم کا شخص تھا۔ تاہم یہ صورت حال لازمی طور پر استثنائی نوعیت کی تھی۔ جبکہ چارلس ڈکن کی کتاب Barnley Rudge میں پایا جانے والا کردار نفیس ہونے کی بجائے اُجڈ اور روایتی قسم کا تھا۔ تاہم میرے خیال میں یہ ضروری نہیں کہ ہمیں اُس عورت سے اتفاق ہو جس کا ذکر میں چند لمحے قبل کر چکا ہوں۔ وہ پھانسی کی سزا کی مخالف محض اسلئے تھی کہ خود پھانسی دینے والے شخص کا نفیس ہونا مشکوک تھا۔ کسی شخص کے نفیس ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اُسے حقائق سے غیر شائستہ قسم کے تعلق سے بچائے رکھا جائے اور جن کا حقائق سے براہ راست تعلق رہتا ہے اُن سے کسی طرح بھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ اُنکا اُس ''نفاست'' سے کسی طرح بھی کوئی تعلق ہو سکتا ہے جس پر گویا اُنہیں کی اجارہ داری ہے۔ بمثال کے طور پر ذرا تصور کریں ایک مسافر بردار بحری جہاز میں رنگدار مزدور سوار ہوں اور اُس کے فرسٹ کلاس میں صرف نفیس عورتیں ہی سفر کر رہی ہوں۔ جہاز کو بیچ سمندر کے کوئی حادثہ پیش آ جائے تو سب سے پہلے اُن نفیس عورتوں کو بچانا لازم ہے۔ ایسا کرنے کے لیے سب سے پہلے وہاں پہلے سے ایسے مردوں کا ہونا ضروری ہے جو رنگ دار مزدوروں کو کشتیوں میں ہجوم کرنے سے باز رکھ سکیں۔ لیکن اس کا تو شاید امکان ہی نہیں کہ وہ اُنکو کسی نفیس طریقے سے ایسا کرنے سے باز رکھ سکیں اور پھر وہ نفیس عورتیں جب اِس مصیبت سے چُھٹکارا پا چکتیں ہیں تو پھر اُن بیچارے مزدوروں کے بارے میں افسوس کا اظہار کرنا شروع کر دیتی ہیں جن کو ڈبو دیا گیا ہو۔ مگر اُنکے نرم دِل محض اُن

سخت جان مردوں کیوجہ سے ہی بچ سکے جنھوں نے اُن کی جان بچائی۔

عام طور پر نفیس لوگ دُنیا کو اپنے قابو میں رکھنے کا کام ملازموں کے سپرد کر دیتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ کوئی بھی نفیس شخص ایسی ذمہ داری نبھانے کو اپنے شان شایان نہیں سمجھتا۔ تاہم غیبت اور سکینڈلز کو ہوا دینا دو ایسے مخصوص شعبے ہیں جن کو وہ صرف اپنے پاس رکھتیں ہیں۔ نفاست کے حوالے سے بول چال میں تاثیر اور اندازِ گفتگو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لوگوں کو سماج میں حسبِ مراتب جگہ ملتی ہے۔ ''A'' اگر ''B'' کے خلاف کُچھ کہتا ہے اور ''B'' ''A'' کے خلاف ہمارے سماج میں خاص قسم کا عمومی اِتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ اُن دونوں میں سے ایک تو اپنی ڈیوٹی نبھا رہا ہے جبکہ دوسرا اپنی کینہ پرور فطرت سے مجبور ہے۔ لہٰذا اِن دونوں میں سے جو پبلک فرائض سرانجام دے وہی نفاست کے اعتبار سے اعلیٰ تصور ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی سکول کی ہیڈ مسٹریس اپنی جونیئر سے زیادہ نفیس ہوتی ہے جبکہ سکول کے بورڈ آف ڈائیریکٹرز کی رُکن اِن دونوں کے مقابلے میں زیادہ نفیس ہوتی ہے۔ اگر کسی اعلیٰ وارفع مرتبے پر فائز کسی نفیس شخص کے کانوں تک اُس کے اپنے بارے میں نچلے درجے سے کوئی یاوہ گوئی پہنچ جائے تو پھر اُس کے ''شکار'' کا اپنی روزی کے زریعے سے ہاتھ دھو بیٹھنا یقینی ہو جاتا ہے اور اگر بعض دفعہ ایسا نہ ہو پائے تو کم از کم اُسے اپنی مخصوص سوسائٹی کے دائرے میں بائیکاٹ کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے یہ اچھائی کی ایک عظیم قوت ہے اور ہمیں بے حد شکر گزار ہونا چاہیے کہ یہ قوت بھی نفیس لوگوں کے ہی قبضہ قدرت میں ہے۔

حقائق دُرست کرنا نفیس لوگوں کی قابل ستائش اہم ترین خصوصیت ہے۔ خدا نے دُنیا بنائی لیکن نفیس لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اس دُنیا کو اس سے بہتر بنا سکتے تھے۔ آسمانی صحیفوں میں بہت سی ایسی تحریریں موجود ہیں جن میں جو درج ہے اگر اُس کے برعکس ہونے کی خواہش کی جائے تو جہاں اُس کا ذکر کیا جانا بھی نفاست کے خلاف ہوگا بلکہ کُفر بھی۔ اگر آدم اور حوا نے سیب نہ کھایا ہوتا تو جیسے گبن نے کہا تھا ''انسانی نسل کی بجائے دُنیا معصوم پودوں اور سبزیوں سے پُر ہوتی'' یوں دُنیا میں کسی قسم کے گناہ کا نام ونشان نہ ہوتا۔ اس پہلو سے خدا کی اپنی منصوبہ بندی بڑی پُراسراری معلوم ہوتی ہے کیونکہ صحیفوں میں مذکورہ بالا واقعہ کے پیش نظر اگر ''گناہ کی سزا'' پر غور کیا جائے تو بظاہر سب کچھ عین معمول کے مطابق ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ اس سزا کے مستحق نفیس لوگ ہی ٹھہرتے ہیں۔ لیکن صد افسوس یہی بات دوسرے لوگوں کے نزدیک فرحت انگیز نوید ہوتی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سزا غلط جگہ نازل ہونے کے لیے بنائی گئی تھی۔ یوں نفیس لوگوں کا اہم ترین مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح اُس نادانستہ ناانصافی کا ازالہ کیا جائے۔ وہ اس بات کو یقینی بنانے کی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں کہ نباتات کے حیاتیاتی مقصد پر عمل یا تو چوری چھپے یا پھر سرد مہری سے ہو یا پھر اس پر بڑی راز داری سے عمل ہو اس کے باوجود اگر کوئی اُن میں سے

کسی کے خلاف سکینڈل سامنے آجائے تو وہ سامنے آنے پر سکینڈل کیوجہ سے کسی نقصان سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے ہی بھائی بندوں (نفیس لوگوں) کے رحم وکرم پر ہوگا۔ وہ اس بات کو بھی یقینی بنانے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ اس معاملے کے بارے میں لوگوں کو کسی بھی طریقے سے کم سے کم علم ہو سکے اور پھر وہ اُن تھیٹر ڈراموں اور کتابوں پر بھی پابندی عائد کر دیتے ہیں جن میں اُنکے بارے میں معمولی سے بھی اشارے یا کنائے پائے جائیں اس طرح کبھی کبھار واقف حال لوگوں کے لیے دبی دبی زہر سے بجھی ہوئی ہنسی کے مواقع بھی فراہم ہو جاتے ہیں۔ تاہم پولیس اور قانون پر کنٹرول ہونے کیوجہ سے مجموعی طور پر حساس معاملات کو دبانے میں کامیاب رہتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ خدا نے انسان کو ایسا کیوں بنایا۔ حالانکہ قدرتِ کاملہ انسان کو اس پیرائے میں بھی بنا سکتی تھی کہ وہ نفیس لوگوں کے لیے کسی طور بھی صدمے کا باعث نہ ہوتا تاہم شاید اس کی بھی ایک وجہ موجود ہے۔ مثلاً جب انگلینڈ میں لنکا شائر کے علاقے میں جب سے ٹیکسٹائل کی صنعت قائم ہوئی ہے کپڑے کی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے تب مِل مالکان اور مذہبی مبلغین کے درمیان اتحاد قائم ہوا جس کے تحت مذہبی مبلغین کے ذمے زیادہ سے زیادہ تن ڈھانپنے کی ضرورت پر زور دینا تھا۔ اگر انسانی جسم کو برہنہ رکھنے کو شرمناک تصور نہ کیا جاتا تو کپڑے کی تجارت منافع کے ایسے سرچشمے سے محروم رہتی۔ اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں نیکی اور پرہیزکاری کے پھیلنے سے اس کا یقین کامل ہونا چاہیے کہ منافع میں کمی کا امکان ہو ہی نہیں سکتا۔

جس نے بھی ''برہنہ سچائی'' کی اصطلاح تخلیق کی اُسے یہ بخوبی علم تھا کہ اس کا کہیں نہ کہیں کوئی تعلق موجود ہے۔ جس طرح ہر ذی ہوش شخص کے لیے برہنگی صدمے کا باعث ہوتی ہے۔ اس طرح بعض لوگوں کے لیے سچائی بھی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ آپ زندگی کے کس شعبے سے تعلق رکھتے ہیں آپ کو اپنے تجربے سے بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ سچائی ایسی تلخ شئے ہے جس کو نفیس لوگ اپنے ضمیر میں داخل ہونے کی کسی صورت اجازت نہیں دیتے۔

جب بھی مجھے عدالت میں کسی کیس کے سلسلے میں ساعت کا سامنا ہوا تو پہلی تلخ حقیقت جو مجھ پر بجلی بن کر گری وہ یہ تھی کہ انصاف کے شاندار دروازوں کے اندر کڑوی سچائیوں کی سرائیت قطعی طور پر ممنوع ہے۔ البتہ ہر اُس سچائی کو اندر داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے جس نے عدالتی لباس پہن رکھا ہو جس میں سچائی کے وہ حصے جو قدرے کم ناپسندیدہ ہوں اچھی طرح ڈھانپ رکھے ہوں۔ ایسا محض صرف قتل، چوری یا ڈکیتی کے مقدمات میں ہی نہیں ہوتا بلکہ اُن مقدمات میں تو خاص طور پر تعصبات کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے جن کا تعلق سیاست اور فحاشی سے جُڑا ہوتا ہے۔ ایسے معاملات میں تو میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ انگلینڈ میں امریکا سے بھی بُری حالت ہے۔ کیونکہ انگلینڈ میں ان معاملات پر نیم شعوری

اور نظر نہ آنے والے طریقوں سے ہر ناپسندیدہ فعل پر عمدہ احساسات کے ذریعے قابو پانے کی کامل دسترس حاصل کی جاچکی ہے۔ اگر آپ کو قانون کی عدالت کے سامنے ایسے حقائق رکھنے کی ضرورت پڑ جائے۔ جو عام طور پر آسانی سے ہضم نہیں ہوتے تو آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ایسا کرنا قانون شہادت کے خلاف ہے۔ مزید یہ کہ نہ صرف جج اور مخالف فریق کا وکیل بلکہ آپ خود اپنے وکیل کو بھی اُن حقائق کو سامنے لانے کا مخالف پائیں گے۔

ایسا غیر حقیقت پسندانہ ماحول نفیس لوگوں کے احساسات کی بدولت سیاست کے میدان میں بھی چھایا ہوا ہے۔ اگر آپ کسی نفیس شخص کو قائل کرنے کی کوشش کریں کہ آپ کی پارٹی کا فلاں سیاستدان دوسرے لوگوں کی طرح فانی قسم کا عام انسان ہے تو وہ بڑی حقارت سے آپ کی رائے کو مسترد کر دے گا۔ اس لیے سیاستدانوں کو میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ ہمیشہ پاکباز دکھائی دینے کی کوشش کیا کریں۔ لیکن شائد یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے سے ہی چپکے سے یہ احتیاط برتنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کی ہر وہ برائی یا سکینڈل پوری طرح عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے جو اُنکے پورے پیشے کی بدنامی کا باعث بن سکتی ہو یہی وجہ ہے کہ اُن کے پارٹی اختلافات اُتنی شدت سے اُن کی تقسیم کا باعث نہیں بنتے جتنی شدت سے پیشے کی شناخت کی نیک نامی کی جدوجہد اُنہیں متحد رکھتی ہے اور یوں نفیس لوگ قوم کے عظیم سپوتوں کی مصور کن تصویر کشی کرتے ہوئے بچوں کو یہ یقین دلانے میں اس حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں کہ عظمت کی بلندیوں کے حصول کے لیے صرف اعلیٰ ترین نیکیوں کا ہونا لازم ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ بعض دفعہ استثنائی حالات میں سیاست کے میدان میں حد سے زیادہ کھینچا تانی بڑھ جاتی ہے۔ کئی دفعہ اس میدان میں ایسے سیاستدان بھی اچانک ٹریڈ یونین سے کُود پڑتے ہیں جو قدرے قابل احترام نہیں سمجھے جاتے تو پھر اُن کی کیسی درگت بنائی جاتی ہے پارنل کی مثال ہمارے سامنے ہے اُس پر پہلے تو قاتلوں سے ساز باز کرنے کا الزام لگانے کی ناکام کوشش کی گئی لیکن بعد میں ایک ایسے اخلاقی جرم میں سزا دلانے کی کامیاب کوشش ہوئی جس کا اُس کے بدترین مخالفین خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتے تھے۔ کمیونسٹ، مزدور رہنماؤں اور دوسرے اصلاح پسندوں کے بارے میں آج بھی یہی رویہ پایا جاتا ہے۔ کسی بھی نفیس شخص کے نزدیک یہ لوگ پسندیدہ یا قابل تعریف نہیں البتہ اِستثناء موجود ہیں۔ اگر وہ کوئی روائتی قسم کے کسی ضابطے کی خلاف ورزی کے مرتکب پائے جائیں تو اُنہیں کسی قسم کے رحم کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طریقے سے نفیس لوگ جائیداد کی ملکیت کے مقدس حق کی حفاظت کے بارے میں اپنے ناقابلِ تسخیر عقیدے کے تحت جس جوش اور ولولے سے سامنے آتے ہیں اسی سے اُنکے وجود کی بے پناہ اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

کسی خوشی، مسرت یا لُطف کو شکوک وشبہات کی نظر سے دیکھنے میں نفیس لوگ ہمیشہ حق بجانب

ہوتے ہیں۔ اُنہیں معلوم ہے کہ جو عقل و دانش میں اضافہ کرتا ہے وہی غم والم بڑھاتا ہے۔ اس سے وہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جو غم والم بڑھاتا ہے وہی عقل و دانش میں اضافہ کرتا ہے اسی لیے اُنہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ غم والم کو پھیلاتے ہوئے گویا عقل و دانش کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ لیکن چونکہ عقل و دانش ہیرے اور موتیوں سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے لہٰذا وہ یہ محسوس کرنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ وہ ایسا کرتے ہوئے سماج کو ایک خاص نعمت سے فیضیاب کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر بڑی کمال مہربانی سے مفادِ عامہ کے لیے کھیل کے میدان تیار کرواتے ہیں تاکہ وہ یہ باور کرا سکیں کہ وہ بڑے ہی انسان دوست ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایسے قوانین و ضوابط بھی نافذ کر دیتے ہیں کہ کوئی بھی بچہ وہاں اتنا بھی لُطف حاصل نہ کر سکے جتنا وہ اس سے پہلے اپنی ہی کسی گلی میں حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنے تئیں بہترین کوشش کرتے ہیں کہ ہر اتوار کو تمام تھیئٹر اور کھیل کے میدان بند رہیں تاکہ اُن سے کوئی لُطف اندوز نہ ہو سکے کیونکہ یہی وہ دِن ہوتا ہے جس کے دوران کوئی ایسی کوشش کرتا ہے۔ اُن کی حتیٰ الامکان کوشش ہوتی ہے کہ کوئی عورت ملازمت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کسی مرد سے گفتگو نہ کرنے پائے۔ اس سلسلے میں میں ایک ایسے شخص کو بھی جانتا ہوں جس نے اِس رویئے کو اپنے خاندان کے اندر بھی اس حد تک پروان چڑھایا کہ اُس کے بچے بھی اُسی کھیل کا انتخاب کرنے پر مجبور تھے جو اُس کی منشاء کے مطابق ہو۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نفاست کی یہ انتہائی صورت دن بدن کم ہو رہی ہے۔ اب اس میں اُتنی سختی نہیں پائی جاتی جتنی وہ تب تھی۔ اُن دنوں بچوں کو یہ پڑھایا جاتا تھا کہ

> قادرِ مطلق کی ایک لاٹھی کی ضرب سے
> نوجوان گنہگاروں کو تیزی سے جہنم میں دھکیلا جا سکتا ہے

اور یہ بات طے سمجھی جاتی تھی کہ اگر کوئی بچہ اُدھم مچائے یا کسی ایسی سرگرمی میں ملوث پایا جائے جو پادری بننے کے نقطہ نظر سے نامناسب ہو اس کا بھی اُسی لاٹھی سے جہنم میں دھکیلے جانے کا قوی امکان ہے۔ اس نقطہ نظر سے تعلیم کی بنیاد رکھی جاتی ہے تاکہ نفیس لوگوں کی تعداد میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جا سکے۔ دی فیئر چائلڈ فیملی کا قیام ایک انمول خدمت قرار دی جا سکتی ہے۔ میں چند ایک والدین کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جو اب تک اس معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ بچوں کے بارے میں عام طور پر یہ خواہش دن بدن شدت پکڑ رہی ہے کہ وہ آزادی سے اپنے پسندیدہ مشاغل سے لُطف اندوز ہوتے ہیں اور ہمیشہ خوش و خرم رہیں۔ مزید برآں یہ خدشہ پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ آج جو بچے مذکورہ بالا طریقہ

تعلیم سے فیضیاب ہو رہے ہیں بڑے ہو کر مطلوبہ معیار کے مطابق لوگوں کو "لطف انگیزی" سے خائف کرنے میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر پائیں گے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ نفیس لوگوں کے دن گنے جا چکے ہیں وہ دو وجوہات کی بنا پر اپنے اختتام کو پہنچ رہے ہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ خوش رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اس کے کسی دوسرے پر ضرر رساں اثرات مرتب نہ ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فریب کاری کے متعلق ناپسندیدگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ ناپسندیدگی اُتنی ہی جمالیاتی اہمیت رکھتی ہے جتنا کہ اخلاق۔ یہ دونوں رجحانات اُس جنگ کے دوران پروان چڑھے جب دُنیا بھر کے لوگ تمام ممالک کو پوری طرح اپنے قابو میں رکھے ہوئے اعلیٰ ترین اخلاقیات کے نام پر ایک دوسرے کے شہریوں کو تھوک کے حساب سے ذبح کرنے کا درس دے رہے تھے۔ آخر کار جب جنگ کا خاتمہ ہوا تو زندہ بچ جانے والے یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کیا صرف جھوٹ کے پلندے اور نفرتوں کے انبار مل کر ہی اعلیٰ ترین اخلاقیات تشکیل دے سکتے ہیں۔ چونکہ لوگوں کی اکثریت احمقوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ لہٰذا مجھے خدشہ ہے کہ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ لوگ ماضی کو بھول کر ایک دفعہ پھر اعلیٰ اخلاقیات کے حصول کے لیے جنگوں پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

یاد رکھیے بچوں سے نفرت کرنا اُن کی اُدھم مچانے کی معصومانہ روش کو ناپسند کرنا اور جنس سے اس حد تک نفرت کرنا کہ جنس کے خیال ہی سے جنون میں مبتلاء ہو جانا اور سب سے بڑھ کر خود زندگی سے نفرت کرنا نفیس لوگوں کی زندگی کا ماحاصل ہے۔ قصہ مختصر نفیس لوگ صرف وہ لوگ ہیں جن کے دماغ غلاظت، کینہ پروری اور فحاشی سے لبالب بھرے رہتے ہیں۔

باب ــ ۱۰

نئی نسل

آنے والے صفحات میں علم کے اُن بہت سے شعبوں کے ماہرین کی آراء پیش کی گئیں ہیں جن سے بچوں کے والدین سے تعلقات اور اُن کی فلاح و بہبُود کسی نہ کسی حوالے سے متاثر ہوتی ہے۔ اِس سے پہلے کہ کُچھ آگے بڑھا جائے میں سمجھتا ہوں کہ اِس پر غور کرنا ضروری ہے کہ کِس قسم کے طریقہ ہائے کار سے علم میں روزمرہ کا اضافہ ہمارے روایتی حیاتیاتی تعلقات کی نہ صرف کایا پلٹ چُکے ہے بلکہ اِس کا قوی اِمکان ہے کہ یہ مزید تبدیلیوں کا باعث ہورہے ہیں بلکہ اُن تبدیلیوں پر میری توجہ قدرے زیادہ ہوتی ہے جب علم بطور ایک فطری قوت کے بروئے کار آکر غیر ارادی اور غیر شعوری نتائج مُرتب کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جیمز واٹ مادرسری خاندان کو قائم نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جب اُس نے مردوں کے لیے یہ ممکن بنادیا کہ وہ اُن مقامات پر سویا کریں جو اُنکے روزگار سے متعلق جگہوں سے بہت دُور واقع ہوں۔ اس سے ہماری شہری آبادی پر بڑے گہرے اثرات مُرتب ہوئے۔ آج کے جدید دور میں ہمارے شہروں کے نواحی رہائشی علاقوں میں بسنے والے خاندانوں کے اندر باپ کی حیثیت ماضی کے مقابلے میں بہت کم رہ گئی ہے خاص طور پر اگر وہ گولف کھیلتا ہے تو وہ عام طور پر کھیلتا ہی رہتا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا بڑا آسان ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے کُچھ خریدنے کے واسطے رقم خرچ کرتا ہے۔ تاہم اگر کوئی ماضی میں روایت نہ ہوتی تب تو یقین کیساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اُنکے لیے کُچھ بھی خرچ کرنے کو تیار نہ ہوتا۔ جب پدرسری نظام خاندان اپنے عروج پر تھا تو اُس وقت مرد کو بے پناہ فوائد حاصل تھے۔ اُس نظام سے اِس کو ایسے بیٹوں کا حصول ہوتا تھا جن سے توقع ہوتی کہ وہ اُس کے بڑھاپے کے دوران مالی مدد کے علاوہ اُس کے کئی ایک دُشمنوں کے خلاف اُسکا دِفاع بھی کریں گے۔ لیکن اب یہ حال ہوگیا ہے کہ مرد کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو چاہے وہ اپنی ساری آمدنی خاندان پر خرچ کردے یا ساری آمدنی بچت کرتا رہے۔ بیٹا باپ کے لیے قطعی طور پر مالی اعتبار سے سُودمند ثابت نہیں ہوتا چاہے وہ دونوں کِتنا ہی عرصہ اِکٹھے گُزار دیں۔

اِب نئے سے نیا علم ہماری ایسی معاشی اور نفسیاتی تبدیلیوں کا باعث بن رہا ہے جس نے ہمارے

دور کو فوری طور پر بیک وقت مشکل بھی بنا دیا ہے اور بہت دلچسپ بھی، پرانے وقتوں میں انسان قدرت کا محتاج تھا۔ جہاں تک بے جان قدرت کا تعلق ہے اسے فصلوں کے لیے زمین کی زرخیزی اور آسمان سے بارش کی ضرورت تھی اور جہاں تک انسان کی اپنی فطرت کا تعلق ہے یہ دو طرح کی شدید اور اندرونی خواہشات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک تو خود اپنے بچوں کو جنم دینا اور دوسرے جنگ پر آمادہ رہنا یہ دونوں عناصر باہم مل کر بے بسی کا احساس پیدا کرتے ہیں جس کو مذہب اپنے طریقے سے خوف کو فرض میں اور حالات سے سمجھوتا کر لینے کے احساس کو نیکی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ لیکن جدید انسان جو گو کہ اپنی تعداد کے اعتبار سے گنتی کے چند ایک ہی ہیں لیکن اُن کا نقطہ نظر بہت مختلف ہے۔ اُن کے نزدیک یہ مادی دُنیا کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو پاکر وہ کسی کے شکر گزار ہوں اور کسی کے آگے اِلتجائیں کریں یا سجدہ ریز ہوں۔ بلکہ یہ دُنیا اُن کے لیے خام مال کی حیثیت رکھتی ہے جس کو اِنسان اپنے سائنسی نقطہ نظر سے استعمال کرتے ہوئے اپنی موافقت میں ڈھالتا ہے مثال کے طور پر اگر صحرا ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ وہاں پانی مہیا کرنا لازم ہے اور اگر کہیں مچھروں کے جھنڈ ہوں تو وہاں سے پانی غائب کرنا اَشد ضروری ہوتا ہے۔ وہ اِس دُنیا کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اِنسان سے مُستقل عداوت برقرار رکھے۔ لہٰذا فزیکل نیچر کیساتھ اپنی جدوجہد اور کشمکش میں ہمیں کسی شیطان کے خلاف خدا کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس چیز کا ادراک اب تک بہت کم کیا گیا ہے وہ یہ کہ بالکل اسی طرح کی تبدیلی انسانی فطرت میں بھی آنا شروع ہو چکی ہے اور یہ واضح ہو چکا ہے کہ جب فرد اپنے کردار کو تبدیل کرنے میں شعوری کوشش کرتے ہوئے مُشکل محسوس کرتا ہے تب اگر سائنسی علم کے حامل نفسیات کے ماہرین کو آزادانہ طریقے سے اگر بچوں پر کام کرنے دیا جائے تو وہ انسانی فطرت کو بھی استعمال کرتے ہوئے اپنے موافق نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔ جیسے کہ کیلی فورنیا کے لوگ صحرا کو اپنے موافق تبدیل کر کے استعمال کر رہے ہیں۔ اِس لیے یہ فرض کر لینا سرے ہی سے غلط ہے کہ شیطان ہم سے گناہ سرزد کرواتا ہے۔ بلکہ خود ہمارے اندر کچھ ناقص غدود ہوتی ہیں یا پھر ہمارے اپنے رہن سہن، تربیت اور پرورش کے دوران عادات کی تشکیل ناپسندیدہ حرکات پر مجبور کرتی ہے۔

شاید قاری اِس مرحلے پر یہ جاننا چاہے کہ آخر گناہ کیا ہوتا ہے؟ اِس کو جاننے کے لیے کوئی مُشکل پیش نہیں آتی۔ سیدھی سی بات ہے کہ گناہ وہ ہوتا ہے جو تعلیم کنٹرول کرنے والے کے نزدیک ناپسندیدہ فعل ہو۔

اِس حقیقت کا اعتراف کرنا لازم ہے کہ جو لوگ سائنسی رویوں اور نقطہ ہائے نظر کے حامل ہیں اُن کے کندھوں پر آج بہت بڑی ذمہ داری آن پڑی ہے۔ آج تک انسانیت صرف اِس لیے زندہ بچتی چلی آرہی ہے کہ وحشیوں اور جنونیوں کے مقاصد ماضی میں کتنے ہی خطرناک اور احمقانہ کیوں نہ رہے ہوں اُن کے پاس وہ مطلوبہ علم ہی موجود نہ تھا جس کے ذریعے سے وہ اُن مقاصد کی تکمیل کر سکتے۔ لیکن اب اُس علم کا

حصول ممکن ہو چُکا ہے۔ لہٰذا عقل و دانش اور ذمہ داری کا تقاضہ ہے کہ زندگی کے مقاصد کا بھی نہایت احتیاط سے جائزہ لیا جائے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس افراتفری سے بھرپور دُنیا میں ایسی فہم اور دانش کہاں پائی جاتی ہے؟

اوپر بیان کیے گئے خیالات کے اظہار کا محض یہ مقصد ہے کہ ہماری تمام مُسلمہ روایات جن میں وہ بھی شامل ہیں جن کا جبلّتوں سے گہرا تعلق ہے مستقبل قریب میں اُن کا ہمارے شعور، عقل اور فہم سے ماضی یا حال کے مقابلے میں زیادہ گہرائی کیساتھ جُڑنا ناگزیر ہے۔ خاص طور پر اِس کا اطلاق خود ہمارے بچوں کی پیدائش اور اُن کی پرورش پر ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ جدید طریقہ کار پُرانے سے بہتر ہو لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ جتنا مُفید ہوسکتا ہے اُتنا ہی اُسے آسانی سے ضرر رساں بھی بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن ہمارے دور میں جدید علم ہمارے روایتی رویوں کے تانے بانے پر کچھ اس شدت سے مسلط ہو رہا ہے کہ پُرانے ڈھانچے کا اپنے خدوخال سمیت تحلیل ہونا ناگزیر ہو چُکا ہے اور اُس کی جگہ نئے نظام کا آنا اٹل ہو چُکا ہے اس سے قطع نظر وہ اچھا ثابت ہوتا ہے یا بُرا۔

خاندانی ادارہ کسی مخصوص قسم کی مہارتوں کے بغیر ہی سماج کے آغاز سے سفر کرتا ہوا ہم تک موجودہ شکل میں پہنچا ہے۔ ماضی میں ایک دور ہوا کرتا تھا جب مرد خود ہی اپنے جوتے بناتا تھا اور اپنی روئی خود تیار کیا کرتا تھا۔ اب جہاں تک مرد کی سرگرمیوں کا تعلق ہے وہ اس مرحلے سے گزر چکیں ہیں۔ لیکن راست باز لوگوں نے اس اَمر کو تقریباً یقینی بنا رکھا ہے کہ عورتوں کے شب و روز میں زمانے کی مطابقت سے کسی قسم کی تبدیلی نہ آنے پائے۔ لیکن بچوں کی پرورش کے سلسلے میں مخسوص علم بھی درکار ہوتا ہے اور مخصوص سرگرمیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ایک مناسب ماحول بھی چاہیے ہوتا ہے۔ مزید براُں بچوں کی گھر میں پرورش بہت مہنگی ہوتی جارہی ہے۔ علم میں اضافے کیساتھ بچوں کی نگہداشت اور پرورش کے بہت سے شعبہ جات گھر سے باہر مُنتقل ہو چکے ہیں۔ بچوں کی گھر کے اندر پیدائش کی روایت تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ اگر اب بچہ بیمار پڑ جائے تو اُسکا علاج روایتی ٹونے ٹوٹکے سے نہیں کیا جاتا۔ جبکہ ماضی قریب تک ایسا ہوتا رہا ہے جس کی وجہ سے لاتعداد بچوں کی موت ہو جایا کرتی تھی۔ اب ماں اپنے بچوں کو گود میں لیے دُعائیں زبانی نہیں پڑھا کرتی۔ ہاں البتہ سنڈے سکول میں ایسا ضرور کیا جاتا ہے۔ اب بچپن میں دھاگا باندھ کر جھٹکا دیتے ہوئے دانتوں کو نہیں نکالا جاتا۔ جیسا کہ میرے اپنے بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ صحت کی سہولتوں کی فراہمی بچے کی زندگی کا صرف ایک حصہ ہوتا ہے دوسرا ھائیجیں سے متعلقہ صاف سُتھرا ماحول اور بچے کے نفسیاتی مسائل بھی بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اب فہرست اتنی طویل ہوتی جارہی ہے کہ ماں خود ہی سب اُلجھنوں سے چُھٹکارا پانے کا سوچنے لگتی ہے۔ اگر بچہ نَر ہو تو جنسی میلان کی مہک بھی آنا شروع ہو جاتی ہے جس سے

احساسِ گناہ بھی سر اُٹھانے لگتا ہے۔

اِس تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ پیدائش اور موت میں کمی ہونا ہے۔خوش قسمتی سے دونوں میں بیک وقت کمی آئی ہے کیونکہ اگر کمی دونوں میں سے صرف ایک پہلو سے ہوتی تو نتیجہ تباہ کُن ہوتا۔ چرچ اور مذاہب جن کے اثر ورسُوخ کا سارا دارومدار اِنسانی دُکھوں اور بے بسی پر ہوتا ہے دُنیا کی تمام حکومتوں کے تعاون سے اُنہوں نے ایسی تباہی کا سامان کرنے کے لیے ہر وہ کام کیا جو اُن کے بس میں تھا لیکن خوش قسمتی سے فرد کی اپنی خود غرضی اجتماعی حماقت کے مقابلے میں زیادہ طاقتور ثابت ہوئی۔

خاندان کے مختصر ہونے کی وجہ سے والدین میں بچے کی قدر و قیمت کے حوالے سے ایک نئے احساس نے جنم لیا۔ جن والدین کے صرف دو ہی بچے ہوتے ہیں وہ کسی قیمت پر بھی بچے کی زندگی کو خطرے میں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ جبکہ پُرانی وضع کے خاندان میں اگر دس سے پندرہ بچے ہوں تو آدھے والدین کی اپنی غفلت کی نذر ہو جاتے ہیں۔ جبکہ والدین کے ضمیر پر معمولی سا بوجھ نہیں پڑتا بچوں کی جدید سائنٹیفک خطوط پر نگہداشت آج کے خاندان کے مختصر ہونے کی نوعیت سے گہرے طور پر جُڑی ہوئی ہے۔

اور ساتھ ہی اس تبدیلی نے خاندان کو بچے کے نفسیاتی ماحول کو قدرے نامناسب بنا دیا ہے اور عورت کی مصروفیات کو بھی کم کر دیا ہے۔ لیکن جس خاندان میں پندرہ بچے ہوں جن میں سے اکثر وفات پا جائیں تو عورت کو اپنی بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے خود کے ہونے کے احساس کی مُہلت ہی نہیں ملتی اگرچہ وہ مصروفیت کوئی خوشگوار نوعیت کی نہیں ہوتی۔ دوسری طرف دو یا تین بچے ہونے کی وجہ سے کام ہی بہت کم رہ جاتا ہے۔ تاہم جب تک پُرانی وضع کا خاندان برقرار رہتا ہے تو پھر تصادم کسی بھی پیشے سے تعلق رکھنے والے گھرانے میں ہو سکتا ہے یوں دو تین بچوں کی ذمہ داری بھی والدین کو بھاری معلوم ہونے لگتی ہے۔

کرایہ زیادہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کی اکثریت گنجان آبادی میں مُقیم ہے اور ساتھ ہی گھروں کا سائز بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بچے کے لیے سازگار ماحول نہیں ہوتا وہ شخص جو نرسری میں ننھے درختوں کی دیکھ بھال کرتا ہے وہ اُن کے لیے اچھی مٹی کا انتخاب کرتا ہے۔ مناسب روشنی کا بندوبست کرتا ہے بہتر آب و ہوا کے لیے بہتر فضا مہیا کرتا ہے اور پھر ایک دوسرے کے درمیان مناسب فاصلہ رکھتا ہے۔ اسی طرح کے انتظامات اُس بچے کے لیے بھی ہونے چاہیں جو جدید شہری گھر میں رہے۔ بچوں کی بھی ننھے درختوں کی طرح اپنی مطابقت سے اپنی ہی قسم کی مٹی، روشنی اور ہمسائیوں جیسے عناصر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُنہیں بھی ایسی کُھلی فضا کی ضرورت ہوتی ہے جہاں وہ بڑی آزادی سے اور بغیر کسی جوش وخروش کے آرام سے وقت گزاریں۔ شہروں میں چھوٹے چھوٹے گھر بچوں کی نفسیات کے لیے بُرے ہوتے ہیں تو اُن کی نشوونما کے لیے بدترین اثرات مُرتب کرتے ہیں۔ ذرا شور ہی کے متعلق غور کریں۔ اچھے خاصے لوگ بھی

اپنے اِردگرد ہر دم شور وغوغا ناپسند کرتے ہیں لیکن بچے کو شور کرنے سے منع کرنا بھی ظلم کی ایک شکل ہے۔ جس سے بچے کے اندر غصہ اور اشتعال جنم لیتا ہے جو آگے چل کر بہت بڑے اخلاقی نقائص کا باعث بھی ہوسکتا ہے اور یہی بات چیزوں کے ٹوٹنے سے منع کرنے پر بھی عائد ہوتی ہے۔ جب ایک بچہ کچن کے شیلف پر چڑھتا ہے اور یوں چینی کے برتن ٹوٹ جاتے ہیں تب والدین ڈانٹ ڈپٹ کیے بغیر نہیں رہ سکتے تاہم اس قسم کی سرگرمیاں اُس کی جسمانی نشوونما کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ ایک ایسے ماحول میں جو بچوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے اس قسم کے فطری اور صحت مندانہ محرکات میں رکاوٹ پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ سائنسی اور معاشی تبدیلیاں والدین کے نفسیاتی نقطہ نظر میں تبدیلیوں کا باعث ہونا ناگزیر ہوتا ہے یوں پورا خاندان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تحفظ کا بڑھتا ہوا احساس اِنفرادیت پسندی کو ناگزیر کردیتا ہے جو چیز ماضی میں انفرادیت پسندی کو محدود کیا کرتی تھی وہ تھا خوف کا عنصر جس سے باہمی تعاون جنم لیتا ہے ایک کالونی جہاں غیر مُلکی آباد کار ہوں اور وہ چاروں طرف سے ہندوستانی باشندوں سے گھری ہو تو گروہی تحفظ کا طاقتور احساس پیدا ہونا لازم ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر صفحہ ہستی سے مِٹنا لازم ہوتا ہے۔ موجودہ حالات میں رضا کارانہ تعاون کی بجائے ریاست تحفظ فراہم کرتی ہے اس لیے اُس کو انفرادیت پسند ہونا اپنے حق میں سازگار معلوم ہوتا ہے۔ وہ یوں اپنی زندگی کے اُس حصے پر جو اُس کے اپنے اختیار میں ہوتی ہے اُسکا مزاج انفرادیت پسندی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کا اطلاق خاص طور پر خاندانی تعلقات کے حوالے سے ہوتا ہے۔ بچوں کی نگہداشت اور پرورش کے بارے میں مرد کی ذمہ داریاں تقریباً مالی نوعیت کی ہی ہوتی ہیں۔ اِن ذمہ داریوں کو یقینی بنانے کے لیے اگر ضرورت پڑے تو نئے قوانین کو بھی تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ تاکہ اُس کے ذاتی احساس پر زیادہ اِنحصار نہ کرنا پڑے اگر ایک عورت خاصی تندرُست وتوانا ہے اور اِس کے ساتھ ذہین بھی ہے تو اِس کا اِمکان ہے کہ وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اِس کی مختصر سی مادری ذمہ داریاں اُس کے پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہورہی ہیں اور یہ کہ وہ ذمہ داریاں سائنسی طریقے سے تربیت یافتہ ماہرین زیادہ بہتر طریقے سے سرانجام دے سکتے ہیں۔ اس قسم کا احساس ہر جگہ عورتوں میں زیادہ ہوتا ہے لیکن ایسا قدرے کم اس لیے ہے کہ مرد بڑے طویل عرصے سے یہی چاہتا ہے کہ عورت ہمیشہ اُس کی محتاج رہے۔ لیکن مرد کی اِس خواہش کا اثر اب کافی حد تک کمزور پڑ چُکا ہے اور اس کو سِرے سے غائب ہوتے ہوئے طویل عرصہ درکار نہیں۔

یہ وہ عوامل ہیں جنھوں نے طلاق کے اِمکانات کو کم کر رکھا تھا۔ جُوں جُوں طلاق عام ہوتی جائے گی مزید یہ کہ اِس کے حصول میں آسانی پیدا ہوتی جائے گی خاندانی بندھن ڈھیلے پڑتے جائیں گے اور یوں خود خاندان بطور ایک ادارے کے کمزور ہوتا چلا جائے گا۔ کیونکہ طلاق کی صورت میں بچے کے لیے صرف

ماں رہ جائے گی یا باپ۔

ڈاکٹر واٹسن کی تصنیف کیمطابق مندرجہ بالا وجوہات واسباب ایسے حالات تشکیل دے رہے ہیں جن میں خاندان بطور اکائی کے تحلیل ہو رہا ہے۔ قطع نظر اس کے یہ اچھا ہو رہا ہے یا بُرا اور یہ نقطہ بھی قابلِ غور ہے کہ خاندان کی تحلیل پذیری کے عمل میں فرد اور ریاست کے درمیان کوئی بھی ایسا ثالث موجود نہیں رہتا جو اس میں امکانی طور پر رکاوٹ بن سکے۔ البتہ اعلیٰ طبقات پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ وہ پرائیویٹ نرسریوں کے ذریعے اپنا کام جاری رکھ سکتے ہیں۔ تعلیم کے لیے اعلیٰ سکول، صحت کے لیے قابل ترین ڈاکٹروں کو تصرف میں لا سکتے ہیں۔ غرض ضرورت پڑنے پر ہر وہ ذریعہ استعمال کر سکتے ہیں جس کو وہ مناسب سمجھیں چاہے وہ کتنا ہی مہنگا پڑے۔ لیکن تنخواہ دار طبقے کے لیے انفرادیت کی اتنی بڑی قیمت چکانا ناممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا جہاں تک ان کے بچوں کا تعلق ہے اگر والدین اُن کی ضرورتیں اور ذمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو پھر لازمی طور پر یہ ذمہ داری ریاست کو اُٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن اکثریت چونکہ نچلے طبقات کی ہوتی ہے لہٰذا جب اِنتخاب کا مسئلہ آتا ہے تو مسئلہ یہ نہیں ہوتا کہ بچوں کی نگہداشت آیا والدین کریں یا وہ ماہرین کریں جن کو والدین مقرر کریں بلکہ یہ مسئلہ براہ راست والدین اور ریاست کے درمیان رہ جاتا ہے۔

جن لوگوں کو اِن متوقع حالات کے وقوع پذیر ہونے اور بچوں کی طرف جدید سائنسی رویوں کے بارے میں علم ہے اُن پر پروپیگنڈہ کرنے کی زبردست ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ موجودہ حالات میں سوائے روس کے دُنیا کی تمام ریاستیں مذہبی تعصّبات میں اس قدر جکڑی ہوئی ہیں کہ اُن میں اتنی سکت ہی نہیں کہ وہ بچوں کے مسائل سائنسی انداز میں حل کر سکیں۔ لہٰذا سیاستدان جب تک مروجہ اخلاق اور اس سے جُڑے ہوئے مذہب کی دھجیاں نہیں بکھیر دیتے اُس وقت تک وہ مطلوبہ طریقہ ہائے کار کسی بھی ایسے ادارے میں بروئے کار نہیں لائے جا سکتے جو ریاست کے کنٹرول میں ہوں۔ مثال کے طور پر نیو یارک ریاست کا سرکاری طور پر ماننا یہ ہے کہ مُشت زنی پاگل پن کا باعث ہوتی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ کوئی بھی سیاستدان اپنے کیرئیر کو داؤ پر لگائے بغیر اس رائے سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اس لیے وہاں کسی بھی ریاستی ادارے میں مُشت زنی کے بارے میں سائنسی نقطہ نظر سے تحقیق ہونے کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ البتہ پاگل خانوں یا ایسے فلاحی اداروں میں اس کے بارے میں غور و فکر ہو سکتا ہے جہاں قدرے کمزور دماغ کے لوگوں کو پناہ دی جاتی ہے کیونکہ پاگلوں اور ذہنی طور پر کمزور لوگوں کے متعلق یہی خیال کیا جاتا ہے کہ اُنہیں اپنی اخلاقی ذمہ داری کا ادراک نہیں ہو سکتا اس لیے اُنہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے یہ انتہائی مضحکہ خیز صورت حال معلوم ہوتی ہے مثال کے طور پر ایک قانون میں سستی کاروں کی مرمت کو قانونی قرار دیا جائے لیکن مہنگی

یا قیمتی کاروں کو دُرست کرنے کے واسطے کوڑے لگائیں جائیں یا پھر کسی مذہبی پیشوا سے واعظ کروایا جائے۔
وہ جو اپنے تصورات میں آئندہ سٹیٹ سیکٹر میں بچوں کے لیے نئے نئے ادارے تعمیر ہوتے دیکھتے ہیں اور تصور ہی تصور میں خود کو یا کسی اپنے دوست کو اُن میں سے کسی ادارے کا سربراہ مقرر ہوا پاتے ہیں تو وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے ادارے کو کنٹرول کرنے والے کے لیے بہت بڑی تنخواہ مقرر ہوگی تو اس کا قوی امکان ہے کہ وہ کسی بڑے سیاستدان کی آنٹی ہی ہوگی جس کے مقدس انتظام و انصرام کے تحت بچوں کو دعائیں سکھائی جائیں گی یا صلیب بنانے کے لیے ہاتھ کو اُوپر تلے، دائیں اور بائیں کرنا سکھایا جائے گا یا پھر قومی جھنڈا لہرانا بتایا جائے گا اور پھر مشت زنی سے متعلق شدید پچھتاوے کا احساس دلایا جائے گا۔ مزید یہ کہ جب بچوں کو کسی کی زبانی یہ علم ہوگا کہ خود بچے کیسے جنم لیتے ہیں تو اُن کی خوف سے گھگھی بندھ جائے گی۔ آج کے مشینی دور میں معاشی نقطہ نظر سے اس قسم کے اداروں کے قیام کے بعد بھی سینکڑوں سال تک مذکورہ قسم کی ذہنی غلامی کے جاری رہنے کے بڑے روشن امکانات ہیں۔ مزید یہ کہ سائنس سے منحرف ایسے دانشور بھی دستیاب ہو جائیں گے جو خود اپنی مرضی سے اُن بچوں کے ذہنوں کو اس حد تک مدد کے نام پر ماؤف کرنے کے ماہر ہونگے کہ کوئی بھی دلیل اُنکے سامنے کوئی وزن نہ رکھے۔ شاید اس کا امکان بھی ہے کہ برتھ کنٹرول کا خاتمہ کر دیا جائے اور جب آبادی حد سے بڑھ جائے تو اِسے کم کرنے کے لیے جنگوں کا بندوبست کرنا کافی ثابت ہوسکتا ہے۔

اگر ریاست کو اپنے اداروں میں وسعت لانی ہے اور اُن کو سائنسی نقطہ نظر سے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے زیادہ با اختیار ہونا ہے تو اُنکو ساخت کے اعتبار سے روشن خیالی میں ڈھالنا ہوگا ایسا خود بخود نہیں ہوگا اور نہ ہوسکتا ہے۔ البتہ ایسا اُسی وقت ہوگا جب لوگوں کی اکثریت قدیم توہم پرستیوں کو ترک کرنے پر اصرار نہیں کرتی۔ اکثر و بیشتر روشن خیال لوگ بھی خوابوں کی دُنیا میں رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے دوست اور احباب کے درمیان رہنے کی وجہ سے تصور کرنے لگتے ہیں کہ آجکل دُنیا میں جُہلاء کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے جبکہ روشن خیال لوگ بہت زیادہ ہوگئے ہیں۔ لیکن عملی طور پر ہو یہ رہا ہے کہ اگر سیاست کا تھوڑا سا تجربہ کرلیں بلکہ انتظامیہ کے اُس شعبے میں چلے جائیں جہاں نام نہاد اخلاقی اُمور زیرِ غور آتے ہیں۔ وہاں بچے کی نشوونما سے لے کر ہر قسم کے دیگر مسائل کو جس بھونڈے طریقے سے حل کرنے کی کوشش ہوتی ہے اس سے روشن خیال لوگوں کی آنکھیں کُھل جانی چاہیں کہ وہ کس دُنیا میں رہ رہے ہیں۔ میں ذاتی طور پر اس خیال کا شدت سے حامی ہوں کہ آج روس سے باہر کی دُنیا میں معقولیت کے بارے میں اتنے وسیع پیمانے پر پروپیگنڈے کی ضرورت ہے جتنا کہ معقولیت پسند تصور بھی نہیں کرسکتے۔

اگر یہ فرض کرلیں کہ خاندان کا بطور ایک اکائی کے شیرازہ بکھر چکا ہے اور ریاست کی طرف سے

بچوں کے لیے معقول ادارے بھی قائم ہو چکے ہیں تب غالباً مزید ایک قدم بڑھانا ضروری سمجھا جائے گا تا کہ متبادل کے طور پر کسی طرح با قاعدگی سے جبلت کی بھی تسکین ہو سکے جو عورتیں برتھ کنٹرول کی عادی ہوتی ہیں بچے کی پیدائش روکے رکھتی ہیں عام طور پر دردِ زہ سے گزرنا پسند نہیں کرتیں۔ نتیجتاً آبادی کو متوازن رکھنے کے لیے بچوں کی پرورش کے پیشے کو بہت زیادہ منافع بخش بنانا ضروری ہو جائے گا۔لیکن یہ ذمہ داری نہ تو عام عورتوں کو سونپی جانی چاہیے اور نہ ہی عورتوں کی اکثریت کو بلکہ اس کام کے لیے صرف اُن عورتوں کا انتخاب کیا جائے جو جانداروں کی پرورش کے نقطہ نظر سے مناسب سمجھی جائیں اور اس کے لیے اُنہیں کچھ آزمائشوں اور امتحانات سے بھی گزارنا ضروری ہوگا۔ یہ کہ وہ ٹیسٹ اور آزمائشیں کس قسم کی ہونگی اور اُن کی پرورش کرنے والوں میں مردوں کی تعداد کس نسبت سے ہوگی اس فیصلے کا یہ وقت مناسب نہیں لیکن آبادی کی تعداد کسی مناسب سطح پر رکھنے کا سوال بہت جلد ہمارے سامنے آنے والا ہے۔ کیونکہ بڑھتی ہوئی آبادی ایک انتہائی خطرناک صورت حال پیدا کرنے والی ہے۔ چونکہ صحت کے شعبے میں نت نئی کامیاب دوائیاں دریافت ہو رہی ہیں اگر ان کی بدولت عام انسان سو سال تک زندہ رہا تو پورا سماج ایک نہایت پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہو جائے گا۔لہٰذا برتھ کنٹرول اور آبادی کی کمی ہماری سب سے بڑی ذمہ داری کا روپ دھار لے گی۔

سائنسی دریافتوں اور نفسیاتی تحقیق سے پوری انسانی نسل کو بچوں کی نگہداشت کے سلسلے میں لامحدود فوائد حاصل ہونے والے ہیں جس میں جنس کا پہلو سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔آج مخصوص رویوں، الفاظ، خیالات اور اُن کے وہ کھیل جن کی طرف وہ فطری طور پر راغب ہوتے ہیں۔حتیٰ کہ جسم کے مخصوص حصوں کے بارے میں بھی بچوں کو توہم پرستی کے تحت ہی تعلیم دی جاتی ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بچے بے لچک مزاج اور پختہ قسم کے ناگوار رویوں کیساتھ بالغ ہو کر محبت کے معاملات میں بھونڈے پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔لہٰذا پوری دنیا میں جہاں جہاں بھی انگریزی بولی اور سمجھی جاتی ہے اکثر و بیشتر لوگ نرسری کی ہی عُمر میں رہتے چلے آرہے ہیں۔ ذہانت اور بالغ نظری اُنکے قریب سے نہیں گزرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ تسلی بخش شادی شدہ زندگی گزارنے میں ناکام رہتے ہیں حقیقت یہ ہے بچوں کے لیے کوئی ایسی مدبرانہ سرگرمی رہتی ہی نہیں جس کے تسلسل میں وہ معمول کے مطابق بچپن سے بلوغت کو پہنچ پائیں جو دراصل مکمل ممنوعات سے کامل اہلیت کی طرف سفر ہوتا ہے۔

بچوں کی اکثریت گناہ کا احساس لیے جوانی کو پہنچتی ہے جو زندگی بھر لاچارگی اور بے بسی کی شکل میں اُنکے تعاقب میں رہتا ہے جس سے اُن کی شخصیت مسخ ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ سب کچھ جنس کے دائرہ میں روایتی اخلاقی تعلیمات کی بدولت ہوتا ہے۔یہ احساس کہ جنس بدی کے مترادف ہے خوشگوار زندگی کو ناممکن بنا

دیتا ہے مرد ہر اُس عورت سے نفرت کرنے لگتا ہے جس سے اُس کا سامنا ہوتا ہے۔ اسی عامل کی وجہ سے وہ عورت پر ہر دم ظلم ڈھانے پر آمادہ رہتا ہے۔ چونکہ جنس کے محرک کو ہر طرف سے سماجی دباؤ کا سامنا رہتا ہے لہٰذا اس کی بے راہ روی جذباتی دوستی یا مذہب کی طرف بے پناہ رغبت کے علاوہ دوسری بہت سی شکلیں اختیار کرتے ہوئے دانش واخلاص پر ضرب کاری لگاتی ہے۔ جو نہ صرف ذہانت اور حقیقت پسندی کے لیے زہر قاتل ثابت ہوتی ہے بلکہ اس سے جھوٹ اور منافقت کی نشوونما شدت پکڑ جاتی ہے۔ یوں بچپن کی تعلیمات کی وجہ سے ظلم، بزدلی، بیوقوفی اور غیر ہموار ذاتی تعلقات پوری زندگی پر محیط رہتے ہیں۔ صاف گوئی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ جنس کوئی بُری بات نہیں البتہ اس کی طرف روایتی رویہ ہماری مریضانہ ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ ہمارے سماج میں جنس کی طرف ہمارے امتناعی رویئے سے بڑی طاقتور برائی کوئی ہے ہی نہیں یہ انسانی بے بسی کا سرچشمہ ہے کیونکہ نہ صرف اس سے برائیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے بلکہ اس کے امتناع سے محبت اور رحم دلی ایسے جذبات گند ہو کر رہ جاتے ہیں جو شاید اُن لاتعداد برائیوں مثلاً نسلی، سیاسی اور معاشی مُشکلات دُور کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے آج پوری انسانیت اذیت میں مبتلاء ہے۔

مندرجہ بالا وجوہات کی وجہ سے آج اُن کُتب کی اشاعت کی بے حد ضرورت ہے جو علم کے بڑھاوے اور خاص طور پر بچوں کی نفسیات کے موضوعات پر معقول تعلیم کا باعث ہوں۔ ہمارا عہد ریاست کی طاقت میں بڑھتے ہوئے اضافے اور توہم پرستی کا تیزی سے زوال پذیری کی طرف سفر سے عبارت ہے۔ جہاں تک ریاست کے اختیارات کا تعلق ہے (جیسا کہ بچوں کے حوالے سے پہلے زکر کیا جا چُکا ہے) ان میں مزید اضافہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے تاہم اُنکا ایک خاص حد سے تجاوز ہونا اور اس کے ساتھ ہی توہم پرست اکثریت کا باقی رہنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ریاست کی پراپیگنڈہ مشینری کی بدولت روشن خیالی سکڑ کر رہ جائے گی جس سے کسی بھی جمہوری ملک میں احتجاج کی مزید گُنجائش ناممکن ہو جانے کا احتمال ہے۔

ہمارا سماج ایک دوسرے پر بڑھتے ہوئے انحصار کی بناء پر اس قدر پیچیدہ ہو چکا ہے کہ کسی ایک سمت میں اصلاحات دوسرے تمام شعبوں میں اصلاحات کو لازمی بنا دیتی ہیں اور کسی بھی مسئلے کو دوسرے حالات سے الگ کر کے حل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہمارے دور میں بچوں کے مسائل کو جس طرح بے پناہ ہمدردی سے سوچ بچار کیساتھ حل کرنے کی کوشش ہوتی ہے ماضی میں اس کی مثال نہیں ملتی اور اگر یہ بات پوری طرح سمجھ لی جائے کہ روایتی اخلاقی تعلیم ہمارے نوجوانوں اور بچوں کے لیے ضرر رساں ثابت ہو رہی ہے تو ہم اُمید کر سکتے ہیں کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ ہمدردی اور سائنسی نقطہ نظر سے اس کو تبدیل کر کے ایک نئی تعلیمی بنیاد کی تشکیل کے لیے راہ متعین ہونا لازم ہے۔

باب ۱۱

ہماری جنسی اِخلاقیات

پُوری اِنسانی زندگی میں جنس ہی ایک ایسا عنصر ہے جس کے بارے میں لوگوں کی اکثریت کا رویہ نہایت ہی نامناسب ہے۔ جہاں خونریزی متعدی بیماری، پاگل پن، سونا اور قیمتی پتھر وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کیساتھ ماضی میں خوف اور اُمید جیسے عناصر وابستہ رہے ہیں وہیں اِن پر جادُو اور دیومالائی قصے اور کہانیوں کی دُھند بھی چھائی رہی ہے۔ لیکن دلیل کا آفتاب اِن پر چھائی ہوئی دُھند کا تقریباً خاتمہ کر چکا ہے لیکن جنس اب بھی پُراسراریت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ایسا شاید فطری بھی ہے۔ کیونکہ جہاں اہم ترین جذبات اس سے مُنسلک ہیں وہیں خود انسان براہ راست اس میں ملوث ہے۔

لیکن آج کے جدید دور میں دُنیا تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے اور اب بدلتے ہوئے حالات کی بدولت لوگوں کا جنس کے بارے میں بھی رویہ تبدیل ہوتا ہوا واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن یہ تبدیلی کس نوعیت کی ہوگی اس کے بارے میں کسی کے لیے یقین سے کہنا مُشکل ہے۔ لیکن اُن چند قوتوں کو جو اس تبدیلی کے پس پردہ۔۔۔۔ کارفرما ہیں زیرِ بحث لانا اس لیے ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ امکانی طور پر کن نتائج پر مُنتج ہوں گی اور وہ ہمارے سماجی ڈھانچے پر کس پیرائے میں اثرات مرتب کرے گی۔

جہاں تک انسانی فطرت کا تعلق ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسی سوسائٹی کی تشکیل ناممکن ہے جس میں شادی کے بندھن سے ماوراء ہمبستری کا امکان نہ ہونے کے برابر ہو۔ ایسے نتیجے کی لازمی شرائط اس نوعیت کی ہیں جن کا حصول جدید زندگی نے تقریباً ناممکن بنا دیا ہے آیئے اُن کا جائزہ لیتے ہیں کہ وہ شرائط کیا ہیں؟

ایک میاں اور ایک بیوی کی شادی کا رواج اُن علاقوں میں انتہائی کامیاب ثابت ہوتا ہے جہاں بہت کم لوگ آباد ہوں۔ جس شخص کو اپنے گھر سے کہیں دُور سفر کرنے کا موقع نہ ملے۔ مزید برأں اُسے اپنی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت کو دیکھنے کا بھی موقع میسر نہ ہو تو وہ آسانی سے وفاداری نبھا سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ کہیں گھر سے بہت دُور اپنی بیوی کو ہمراہ لیے بغیر سفر کر کے کسی گنجان شہری آبادی میں قیام کرنے لگ جائے تو معاملہ خاصا پیچیدہ صورت حال اختیار کر لیتا ہے۔ اس رواج کو توہم پرستی سے بھی بڑی تقویت ملتی ہے اور

وہ جو سچے دل سے ایمان رکھتے ہیں کہ گناہ کا انجام ابدی سزا ہے ان سے تو شاید توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اس سے پرہیز رکھیں اور وہ کسی حد تک پرہیز بھی رکھتے ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر حالتوں میں اُن سے وہ گناہ سرزد ہو ہی جاتا ہے۔ اس رواج کو رائے عامہ کی نیکی کا تصور بھی بے حد مضبوط رکھے ہوئے ہے۔ سماج کی ساخت زراعت پر مبنی ہو تو وہاں ہمسائیوں کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص کیا کرتا ہے وہاں ریت و رواج کیا ہوتے ہیں اُن سے قطع نظر ایک اِنسان وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو وہ کرنا چاہتا ہے بشرطیکہ وہ خاصا اثر و رسوخ کا مالک ہو۔ لیکن ایسے رویوں کی اپنی وجوہات ماضی کے مقابلے میں بے حد کمزور پڑ چکی ہیں۔ تنہائی میں رہنے والوں کی تعداد اب بہت قلیل ہو چکی ہے جہنم کا خوف تحلیل ہو رہا ہے بڑے شہروں میں بیگانگی کی وجہ سے کوئی نہیں جانتا کہ کون کیا کرتا ہے۔ مزید یہ کہ اس جدید صنعتی دور کی بدولت نہ ہی مرد اور نہ ہی عورتیں مذکورہ رواج کے اُس سختی سے پابند ہیں جتنا کہ وہ ماضی میں ہوا کرتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ شاید یہ بھی کہا جائے کہ چونکہ اخلاقی قدروں کو پامال کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے لہٰذا اس کو جواز بناتے ہوئے سماجی معیار ہی بدل دیں۔ بعض دفعہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ جو گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں اُنہیں نہ صرف یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ گناہ کرتے ہیں بلکہ اُنہیں اس کو بطور گناہ کے تسلیم بھی کرنا چاہیے اور یہ کہ اخلاقی ضابطہ بھی اتنا بُرا نہیں کہ جینا دوبھر ہو جائے۔ لیکن میرا اُن کو جواب یہ ہے کہ ضابطہ اچھا ہے یا بُرا اس سوال سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہے کہ یہ انسانی خوشی میں اضافے کا باعث ہے یا نہیں۔ بہت سے بالغ حضرات اپنے من میں سوچتے ہیں کہ اُنہیں بچپن میں جو کچھ پڑھایا یا سکھایا جاتا ہے وہ روزمرہ کی زندگی سے مطابقت نہیں رکھتا یوں وہ احساس گناہ میں مبتلاء رہتے ہیں۔ تو پھر نقصان صرف یہی نہیں ہوتا کہ بالغ انسان کی نہایت معقول شخصیت اور بچپنے کی لاشعوری شخصیت میں تفاوت بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس رجحان کی تیزی سے نشوونما ہونا شروع ہو جاتی ہے جس میں وہ محض نامعقول قسم کی روایات کو ہی ترک نہیں کرتا بلکہ روایتی اخلاقیات کے جائز حصوں کو بھی مسترد کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس انداز میں سوچنے لگتا ہے کہ اگر زنا جیسا جرم سرزد ہو گیا ہے تو پھر سُست روی، ہیرا پھیری اور بد معاشی سے کام لینے میں کیا حرج ہو سکتا ہے چنانچہ اس خطرے کو اس نظام سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا جس میں بچوں کو ایسے مختلف عقائد کی تعلیم دی جاتی ہے جس کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بچے اپنے بالغ ہونے پر کسی سماجی اور معاشی اُتھل پُتھل کے دوران اُن سب کی مذمت پر اُتر آئیں گے اور جہاں بُرائی جائے گی وہیں اچھائی بھی۔

کسی قابل عمل جنسی اخلاق کا تعین کرنے میں مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب دوسری شادی کی خواہش اور حسد کے محرکات کے درمیان تصادم کی سی صورت حال پیدا ہونے لگتی ہے اس میں شک نہیں حسد

جہاں کسی حد تک جبلی نوعیت کا ہوتا ہے وہیں یہ بُری حد تک روایتی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ایسے سماجوں میں جن میں اُس مرد کو تمسخر کا نشانہ بنانا مناسب سمجھا جاتا ہے جس کی بیوی غیر وفادار ہو ایسے میں وہ مرد اُس شخص سے حسد کرنے لگتا ہے جس سے اُس کی بیوی کا تعلق ہو چاہے اُسے اپنی بیوی سے کسی بھی قسم کا لگاؤ نہ بھی ہو حسد کا احساس ملکیت سے بڑا گہرا تعلق ہے۔اس کی عدم موجودگی میں حسد بہت کم رہ جاتا ہے اگر وفاداری کو روایتی ناپسندیدگی سے الگ کرتے ہوئے زیرِ غور لایا جائے تو معلوم ہوگا کہ حسد بھی کم ہو گیا ہے تاہم اس کی بھی بہت سی حدود و قیود ہیں کیونکہ مرد کے باپ ہونے کے ناطے بہت سے حقوق و فرائض ہوتے ہیں اور جب تک یہ حقوق و فرائض موجود رہیں گے مرد کو بھی باپ ہونے کے حوالے سے اُس کی خواہش ہوگی کہ اُسے یہ مکمل یقین دہانی ہو کہ اس کے ہاں پیدا ہونے والا بچہ اُسی کا ہے۔اگر عورتیں چاہتی ہیں کہ انہیں مکمل جنسی آزادی ہو تو ولدیت کا ناپید ہونا لازم ہے۔عورتوں کو بھی لازمی طور پر اپنے خاوندوں کی طرف سے کسی بھی قسم کی توقعات ترک کرنا ہونگی ہوسکتا ہے کہ ایسا بھی کوئی وقت آجائے۔لیکن اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو اس قسم کی سماجی تبدیلی کے اچھے اور بُرے اثرات اتنے زبردست ہونگے جن کا اندازہ لگانا تصور سے باہر ہے۔

اس عرصے میں اگر ازدواجی ادارے بطور ایک سماجی اکائی کے اور ولدیت نے زندہ رہنا ہے تو آزادانہ جنسی تعلقات اور ایک میاں اور ایک بیوی کے رواج کے درمیان کسی نہ کسی قسم کا سمجھوتا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں کسی ایک خاص لمحے پر کوئی بہترین فیصلہ کرنا آسان نہیں۔اس فیصلے کا انحصار وقتاً فوقتاً آبادی کی عمومی عادات اور برتھ کنٹرول کے طریقہ ہائے کار کے مؤثر ثابت ہونے پر ہونا چاہیے۔تاہم اس سلسلے میں کچھ چیزوں کے بارے مین اب بھی بڑے یقین کیساتھ بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ عورت کا نفسیاتی اور تعلیمی اعتبار سے بیس سال کی عمر سے قبل ماں بننا ناپسندیدہ فعل تصور ہونا چاہیے۔اس حوالے سے ہماری اخلاقی اقدار اس نوعیت کی ہونی چاہیں کہ ایسے واقعات نہ ہونے کے برابر ہوں۔

دوسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ کسی عورت یا مرد کے لیے کسی سابقہ جنسی تجربہ کے بغیر یہ امتیاز کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ آیا اُن کا باہمی تعلق محض جسمانی کشش کی بنیاد پر ہے یا یہ کہ اُس کی بنیاد آپس کے مزاج کی موافقت پر ہے جو ایک کامیاب شادی کے لیے ضروری ہے۔مزید براں عام مشاہدہ یہ ہے کہ مرد اپنی شادی کو معاشی وجوہات کی بناء پر ملتوی کیے رکھتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کا 20 سے 30 سال کی عُمر تک جنسی پاکیزگی برقرار رکھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے اور نہ ہی اسے نفسیاتی اعتبار سے پسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر اُسے عارضی طور پر ایسے تعلقات کی ضرورت پڑے تو وہ پیشہ ور عورتوں سے ہرگز نہیں ہونے چاہیں۔بلکہ ایک ایسی لڑکی سے ہونے چاہیں جس کا مقصد دولت بٹورنے کی بجائے پیار و محبت ہو۔ان دونوں وجوہات کی

بناء پر غیر شادی شدہ لوگوں کو اس وقت تک جنسی آزادی میسر رہنی چاہیے جب تک وہ بچے کی پیدائش کی روک تھام کو یقینی بنائے رکھیں۔

تیسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ طلاق ایک دوسرے پر الزامات سے پاک ہونی چاہیے۔ مزید برأں ذلت کا عنصر اس میں قطعی طور پر شامل نہیں ہونا چاہیے۔ طلاق دونوں میں سے کسی ایک کی خواہش پر آسانی سے ہو جانی چاہیے۔ بشرطیکہ اُس میں کسی بچے کی پیدائش کا معاملہ ملوث نہ ہو۔ دونوں فریقین میں سے ایک سال کے نوٹس پر شادی کو موقوف کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ طلاق کی کئی اور معقول وجوہات بھی ہو سکتی ہیں جن میں پاگل پن، تشدد اور مسلسل غیر حاضری وغیرہ بھی شامل ہیں۔ لیکن باہمی رضامندی اس سلسلے میں سب سے بڑی عمومی وجہ ضرور ہونی چاہیے۔

چوتھا اور آخری عامل یہ ہے کہ دونوں فریقین مل کر ایسا ماحول بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں جس میں جنسی آزادی کے معاملات میں معاشی وجوہات کا عنصر قطعی طور پر شامل نہ ہونے پائے۔ آجکل کی بیوی کا عام پیشہ ور عورتوں کی طرح گزر بسر کا انحصار اپنی جسمانی کشش کی فروختگی پر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ نارمل تعلقات میں بھی مرد سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ تمام گھریلو اخراجات وہ اپنی جیب سے ادا کرے اور یوں عورت اور مرد کے جنسی تعلقات میں ایسے رویئے کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ چرچ نے بھی جنسی کاروبار ممنوع قرار دے رکھا ہے۔ لیکن پھر بھی عورت ایک بکاؤ مال کی سی شرمناک صورت حال سے دوچار ہو جاتی ہے۔ تاہم عورت کو گھر کے معاملات سنبھالنے، کھانا پکانے اور بچوں کی نگہداشت کے لیے رقم فراہم کرنا نہایت مناسب ہوتا ہے لیکن محض جنسی تعلقات کی روشنی میں کسی قسم کی ادائیگی کرنا کسی طرح بھی معقول تصور نہیں کیا جا سکتا نہ ہی کسی عورت کو اپنے خاوند سے حق مہر کی رقم کی توقع رکھنی چاہیے۔ جب میاں بیوی کے درمیان دونوں طرف سے محبت کا خاتمہ ہو چکا ہو اور جب وہ آپس میں علیحدگی کا فیصلہ کر لیں تو عورت کو بھی مرد کی طرح اپنے لیے روزگار کے لیے کام کرنا چاہیے تاکہ وہ خود کو آزاد و خود مختار محسوس کر سکے ورنہ ایک بیکار اور بیروزگار بیوی اُس مرد کی طرح شمار ہوگی جو کسی ''بیگم'' سے تعلقات کے عوض دولت بٹور رہا ہو۔

II

آج کے موجودہ دور کے لیے قابل قبول جنسی رویوں کے قواعد وضوابط کی تشکیل میں دو قدیم انسانی محرکات نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے اگرچہ یہ کردار زمان و مکان کے اعتبار سے کہیں کم اور کہیں زیادہ رہا ہے ان میں سے ایک شرم و حیا اور دوسرا حسد۔ جیسا کہ مذکورہ بالا میں مذکور ہے۔ جہاں تک حیا کا تعلق ہے یہ پوری انسانی نسل میں گویا آفاقی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی نوعیت قدرے بندش جیسی ہوتی ہے جس کی خلاف ورزی لازمی طور پر رائج الوقت رسم و رواج کے مطابق کسی تقریب یا کسی مخصوص عمدہ اور نفیس شکل میں ہونی

چاہیے اس سلسلے میں تمام چیزوں کو دیکھنا یا تمام حقائق کو بیان کرنا شاید ضروری نہیں۔ جیسا کہ آج کے جدید زمانے میں لوگوں نے فرض کر رکھا ہے کہ حیا ملکہ وکٹوریہ کے عہد کی ایجاد ہے بالکل غلط ہے بلکہ اس کے برعکس علم بشریات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ شرم وحیا کا عنصر قدیم وحشیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ انسانی فطرت میں فحاشی کے تصور کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ چاہے ہم بغاوت کے تحت، محبت کے طور پر یا سائنس کی رُوح کے مطابق یا مکاری کی خواہش کے تحت جیسا کہ بائرن کی تحریروں میں موجود ہے۔ اس کی جتنی چاہے مخالفت یا مذمت کریں لیکن ہم اسے اپنے اندر کے فطری محرکات سے خارج نہیں کر سکتے۔ روایت بِلاشُبہ اس بات کا تعین کرتی ہے کہ کسی خاص کمیونٹی میں کیا ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ لیکن آفاقی اعتبار سے کسی روایت کا ہر جگہ پایا جانا یہی حتمی طور پر ظاہر کرتا ہے کہ وہ محض ایک روایت نہیں بلکہ کچھ اس سے زیادہ ہے۔ تقریباً تمام انسانی سماجوں میں ہیجان خیز جنسی تصویر کشی پر مبنی خودنُمائی ایک ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم بعض جگہ کئی ایک مواقع پر مذہبی تقریبات میں اس کا پایا جانا اِستثناء کی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن جہاں تک درویشوں کی برہنگی کا تعلق ہے قطع نظر اس کے کہ یہ انسانی نفسیات سے جُڑی ہوئی ہے یا نہیں۔ یہ ایک ایسا محرک معلوم ہوتا ہے جس کا اظہار تب ہی سامنے آتا ہے جب تہذیب کسی خاص سطح پر پہنچ جائے۔ لیکن جب اس کا اظہار ہوتا ہے تو پھر یہ طاقت بھی پکڑ لیتا ہے۔ یہ عہد نامہ قدیم کی ابتدائی کتابوں میں تو نہیں پایا جاتا البتہ اس کا ذکر عہد نامہ جدید اور آپوکریفا Apocrypha میں مِلتا ہے اسی طرح قدیم زمانے میں یونانیوں کے ہاں بھی ایسا کچھ نہیں تھا تاہم وقت گزرنے کیساتھ ساتھ یہ نُمایاں ہونے لگا لیکن ہندوستان میں بڑے قدیم زمانے سے ہی اس کا اظہار ہوتا چلا آ رہا ہے اور آخر کار اس نے بہت شدت اختیار کر لی نفسیاتی تجزیہ کے حوالے سے اس کی شروعات کو بیان نہیں کرنا چاہتا لیکن مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک اَز خود نُمو پذیر ہونے والا ایسا جذبہ ہے جو نہایت ہی قلیل حد تک ہر مہذب شخص میں پایا جاتا ہے کسی معزز شخص اور اگر وہ ساتھ ہی مذہبی پیشواء بھی ہو تو برہنگی کی حالت میں کسی سے رنگ رلیاں مناتے ہوئے تصور کرنے میں جو شرم یا ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے وہ اس جذبے کے اظہار کی انتہائی دُھندلی شکل ہے۔ کیونکہ ایسا واقع ہونا کسی اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہونے کے شانِ شایان نہیں ہوتا۔ رُوح کو جسم سے آزاد کرنے کی شدید خواہش سے مغلوب ہو کر بڑے بڑے مذاہب سے تعلق رکھنے والے حتیٰ کہ جدید دانشوروں میں بھی یہ رجحان خاصا توانا ہے۔

لیکن میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جنسی اخلاقیات کو وجود میں لانے اور اس کے پھلنے پھولنے میں حسد ایک طاقتور عامل رہا ہے۔ حسد جبلی طور پر طیش کو جنم دیتا ہے اور طیش مناسب انداز میں اخلاقی ناپسندیدگی کے رُوپ میں نمودار ہوتا ہے۔ خالصتاً جبلی ترغیب کو تہذیب کی ابتدائی ترقی کے ادوار

میں مرد کی طرف سے اُسی کا بیٹا یا بیٹی کو یقینی بنانے کی خواہش نے لازمی طور پر تقویت دی ہوگی۔ کیونکہ اس یقین کی عدم موجودگی میں پدرسری خاندان کی تشکیل ناممکن تھی اور نہ ہی ولدیت اپنے تمام معاشی وسائل کیساتھ ازدواجی ادارے کی بُنیاد بن سکتی تھی۔ اسی لیے نہ صرف کسی مرد کی بیوی سے تعلقات قائم کرنا بہت بُرا سمجھا جاتا تھا بلکہ کسی غیر شادی شدہ عورت سے تعلق بھی اُسی طرح قابلِ ملامت تصور ہوتا تھا۔ خاوندوں کے حقوق کو نظر انداز کرنے کی بناء پر ہنگامے اور ٹوری پارٹی کا محاصرہ اس سلسلے میں ایک انتہائی قسم کی بہترین مثال ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن دِنوں مرد کے مقابلے میں بیویوں کے حقوق نہ ہونے کے برابر تھے۔ خاوند کا بیوی کی طرف کوئی فرض موجود ہی نہ تھا۔ اگرچہ وہ دوسرے خاوندوں کی جائیداد کے حقوق کی حفاظت کرنے کا پابند تھا۔

قدیم پدرسری نظام خاندان بمعہ اپنے مندرجہ بالا رویوں کے ایک مخصوص پہلو سے بڑا کامیاب تھا۔ مردِ حکمرانی کے اعتبار سے خاندان پر پوری طرح چھایا ہوا تھا۔ اُسے ہر طرح سے آزادی حاصل تھی جبکہ عورتیں ثانوی حیثیت میں چاکری کی اذیتیں جھیلتی رہتی تھیں اُن کی ناخوشی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ تو عورتیں ہی تھیں جن کی طرف سے برابری کے لیے شدت سے مطالبے نے آج کی جدید دُنیا کو نئے نظام کی ضرورت کا احساس دلایا۔ برابری کا حصول دو طریقوں سے ہوسکتا ہے۔ یا تو مردوں سے ایک میاں بیوی پر مشتمل سخت پابندی پر مبنی رواج (جیسا کہ وہ ماضی میں تھا) سے وہ حقوق جن سے عورتیں محروم کی گئی تھیں واپس اُنہیں لوٹا دیئے جائیں یا پھر روایتی قواعد و ضوابط میں قدرے نرمی لاکر عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر کردیئے جائیں تاہم دونوں میں سے پہلے والا طریقہ کار جہاں عورتوں کے حقوق کے بانیوں کے نزدیک قابلِ ترجیح تھا وہیں اُس کو چرچ کی حمایت بھی حاصل تھی اور اب بھی ہے۔ لیکن عملی اعتبار سے دوسرے طریقہ کار کو اکثریت کی حمایت حاصل ہے لیکن اُن میں سے اکثر لوگ خود اپنے رویے کو نظریاتی اعتبار سے قابلِ جواز قرار دینے میں شکوک و شبہات میں مبتلاء ہیں۔ لیکن جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس میدان میں ایک نئی قسم کی اخلاقیات کی ضرورت ہے اُنہیں بھی یہ جاننے میں دُشواری پیش آتی ہے کہ اس کے کیا امکانی نتائج مرتب ہونگے۔ تاہم سائنسی نقطہ نظر کی بدولت جنس کے متعلق علم کے حصول پر پابندیوں کا نرم ہونا ایک انوکھے پن کی حیثیت رکھتا ہے۔ لوگ دھیرے دھیرے اس حقیقت سے آگاہ ہو رہے ہیں کہ جنس کے بارے میں ماضی کے مقابلے میں زیادہ کُھل کر بات کرنا کئی بہت سی برائیوں کے تدارک میں بے حد مُفید ثابت ہوسکتا ہے اور خاص طور پر جب جنسی بیماری کا معاملہ درپیش ہو تو جب تک اُس کو صیغہ راز میں رکھا جائے گا اس سے چھٹکارا ناممکن ہوگا۔ یہ ثابت ہو چُکا ہے کہ بیان کرنے میں ہچکچاہٹ اور جہالت فرد کی نفسیات پر بے حد مُضر اثرات مُرتب کرتے ہیں۔ سماجی اور نفسیاتی تجزیوں کی روشنی میں جنسی معاملات کے سلسلے میں خاموشی کو عام طور پر

قابلِ مذمت قرار دیا جانے لگا ہے۔ نیز تعلیمی ماہرین نے بھی بچوں کیساتھ اپنے تجربات کے پیشِ نظر اسی قسم کے نتائج اخذ کیے ہیں اور وہ لوگ جو انسانی رویوں کو سائنسی نقطہ نظر سے پرکھتے ہیں کسی عمل پر گُناہ کا لیبل چسپاں کرنے کو ناممکن خیال کرتے ہیں اور اُنکو احساس ہو گیا ہے کہ ہم جو بھی عمل کرتے ہیں اس کی جڑیں ہمارے وِرثے، تعلیم اور ہمارے ماحول سے پیوستہ ہیں اور یہ کہ کسی عمل کی مذمت کرنے کی بجائے اُس کی وجوہات کنٹرول کرنے ہی سے اُس کی ضرر رسانی سے بچاؤ کر سکتے ہیں۔

لہٰذا جنسی رویوں کے بارے میں نئی اخلاقیات کو دریافت کرتے ہوئے اُن قدیم نامعقول جذبات سے مغلوب ہونے سے لازمی طور پر ہمیں گریز کرنا ہوگا۔ جو نئے سِرے سے پُرانی اخلاقیات کو بڑھاوا دیں۔ اگرچہ ہمیں اس کا علم بھی ہو کہ اُن میں سے کئی ایک روایات (حادثاتی طور پر ہی سہی) کی بُنیاد کسی طاقتور محاورے پر ہی قائم کیوں نہ ہو۔ لہٰذا جب تک وہ ہمارے درمیان (چاہے کتنی ہی کمزور شکل میں ہوں) جتنے عرصے تک موجود رہیں گے انسانی مسائل کی فہرست میں اُن کا اندراج بھی رہے گا۔ چُنانچہ ہمیں یقینی طور پر خود سے یہ سوال کرنا گا کہ کن اخلاقی اُصولوں کی پیروی کی جائے جو اِمکانی طور پر انسان کی مسرت کا باعث بنیں اور یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ وہ اُصول شاید اُس قسم کے بھی ہو سکتے ہیں جن کی آفاقی طور پر پیروی نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ ہمیں یہ غور کرنا ہوگا کہ اُن اُصولوں کا اطلاق درحقیقت کیا اثرات مُرتب کریں گے لیکن اس پر غور کرنا بے معنی ہوگا کہ اُن کا پوری طرح اطلاق ہو چکا ہوتا تو کیا ہوتا؟

III

آیئے اب ہم جنسی موضوعات سے متعلق علم کی دستیابی کے اُس سوال پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں جس سے ہمیں ابتدائی عُمر ہی میں واسطہ پڑتا ہے۔ میرے خیال میں کوئی ایسی دلیل موجود ہی نہیں جس کی بناء پر ہم بچوں سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے کسی بھی قسم کے حقائق کو اُن سے چُھپانے کی کوشش کریں۔ جب بچوں سے گُفتگو کے دوران جنس زیرِ بحث آئے تو اُن کے سوالات کا جواب عین اُسی معمول کے انداز میں دینے چاہئیں جس طرح ہم اُن سے دیگر موضوعات مثلاً مچھلیوں کی عادات کیسی ہوتی ہیں یا کوئی ایسا موضوع جس سے بچوں کی اپنی دلچسپی ہو۔ مزید براں اُنکے تجسس کی پوری طرح تشفی ہونی چاہیے۔ اُنہیں جواب دینے کے دوران آپ کے لہجے میں کسی قسم کے اضطراب کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ بچے اُن احساسات سے عاری ہوتے ہیں جن کے بالغ حامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اُن کی طرف سے کسی قسم کے ہیجان میں مُبتلاء ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ اگر ہم اُنکے سوالات کو ٹالنے کی کوشش میں شہد کی مکھیوں یا پُھولوں سے محبت کا ذکر شروع کر دیں تو یہ ایک سنگین غلطی ہوگی۔ حقائق بیان کرنے کے لیے کوئی پیچیدہ یا ٹیڑھا طریقہ کار اختیار کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ بچے کو لازمی طور پر وہ سب کچھ بتا دینا چاہیے جو وہ جاننا چاہتا ہے۔ مزید یہ کہ اُس

کے اپنے والدین کو برہنگی کی حالت میں دیکھنے کی اجازت ہونی چاہیے کیونکہ اُن میں اُس وقت نہ تو کسی قسم کا جنسی میلان ہوتا ہے اور نہ اُن میں کسی قسم کا ہیجان برپا ہونے کا خطرہ، وہ بچے جن کی پرورش ایسے خاندانی ماحول میں ہوتی ہے جس میں اُنہیں ہر طرح کی معلومات سے محروم رکھا جاتا ہے جنس کے بارے میں سوچتے بھی زیادہ ہیں اور باتیں بھی بہت زیادہ کرتے ہیں۔ جبکہ وہ بچے جنہیں پہلے سے جانکاری ہوتی رہی ہو نارمل انداز میں گفتگو کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ جنہیں خاندان کی جانب سے اندھیرے میں رکھا جاتا ہے اور جب اُنہیں بڑا ہو کر حقیقی علم حاصل ہو جاتا ہے تب اُن کا رویہ اپنے بڑوں کی جانب منافق اور دھوکے باز جیسا ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف حقیقی طور پر لاعلم رہنے والوں کو جب ٹھوس حقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اُن کا تشویش اور صدمے سے دوچار ہونے کا قوی احتمال ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ اُنہیں حقیقی زندگی کے مطابق خود کو ڈھالنے میں دُشواری پیش آتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر طرح کی جہالت افسوسناک ہوتی ہے۔ لیکن جنس جیسے اہم معاملے میں تشویش ناک حد تک خطرے کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔

جب میں کہتا ہوں کہ بچوں کو جنس کے بارے میں بتانا چاہیے اُس سے میرا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اُنہیں محض اعضاء کے افعال کی حد تک جانکاری ہو۔ بلکہ اُنہیں وہ سب کچھ بتا دینا چاہیے جس کا وہ تقاضا کریں اور بالغان کو چاہیے کہ بچوں کے سامنے خود کی نُمائش کی کوشش اس پیرائے میں نہ کریں جس سے ثابت ہو کہ وہ اتنے پرہیزگار رہیں جتنا کہ وہ حقیقتاً نہیں ہوتے۔ مزید یہ کہ اُن کے علم میں یہ بھی ہونا چاہیے کہ جنسی فعل کا اِنعقاد محض شادی سے مشروط نہیں ہوتا۔ بچوں سے دھوکہ دہی کا کوئی جواز ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ اکثر و بیشتر روایتی قسم کے خاندانوں میں ایسے واقعات لازمی طور پر وقوع پذیر ہو جاتے ہیں تب پھر جب بچوں کے علم میں آتا ہے تو سمجھ جاتے ہیں کہ اُن کے والدین اُن سے جھوٹ بولتے رہے ہیں یوں اُنکے اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے اور وہ بھی جواب میں جھوٹ بولنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ بہت سے حقائق ایسے بھی ہوتے ہیں جو بچوں کے ذہنوں میں زبردستی نہیں ٹھونسے جا سکتے ہیں اور نہ ہی ایسی کوئی کوشش ہونی چاہیے۔ البتہ یہ کہنا کہ ''یہ سچ نہیں ہے'' بہتر ہے کہ اُنہیں جلد از جلد حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے۔ جس نیکی کی بنیاد حقائق کو جُھٹلانے پر رکھی جائے وہ حقیقی نیکی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں محض نظریاتی طور پر ہی نہیں بلکہ عملی تجربات کی بُنیاد پر اس کا قائل ہوں کہ جنسی موضوعات پر مُکمل طور پر کُھلے پن کا ماحول جہاں بچوں کو پریشان کُن خیالات پراگندگی سے آلودہ تصورات اور شدت ہیجان سے دُور رکھنے میں ایک نہایت کامیاب عامل ثابت ہوتا ہے وہیں یہ بذات خود روشن خیالی پر مبنی جنسی اخلاقیات کی ابتداء کے لیے ناگزیر بھی ہے۔

جہاں تک بالغ افراد کا تعلق ہے اُن کے جنسی رویئے بہت سے پہلوؤں کے اعتبار سے کچھ اِس قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ باہم ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ خاصا وزن بھی رکھتا

ہے۔ لہٰذا اس پسِ منظر میں کسی خاص سمجھوتے پر پہنچنا کسی طرح بھی آسان نہیں اِس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل حسد کا محرک اور جنسی ورائٹی کے درمیان تصادم کی سی صورت حال میں پیش آتی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ نہ حسد آفاقی حیثیت رکھتا ہے اور نہ ہی جنسی ورائٹی اگرچہ حسد نہ کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے مزید یہ کہ ایسی عورتیں اور مرد بھی موجود ہیں جن کے پیار اور محبت کے جذبات اپنے مُنتخب کردہ ساتھی کیساتھ زندگی بھر نہیں ڈگمگاتے اگر اِن دونوں اقسام کے لوگوں کی تعداد آفاقی صورت اختیار کر جائے تو کسی تسلی بخش ضابطے کی تشکیل بڑے آرام سے ہوسکتی ہے تاہم یہ اعتراف کرنا لازم ہے کہ اِس قسم کے لوگوں کی تعداد اُسی حالت میں بہت زیادہ عام ہوسکتی ہے جب ہم اس مقصد کے حصول سے ہم آہنگ روایات قائم کریں۔

مکمل جنسی اِخلاقیات کے اطلاق کی راہ میں بے پناہ مسائل موجود ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک ہم مزید تجربات سے نہ گزر جائیں اُس وقت تک کسی چیز کو حتمی طور پر مثبت قرار نہیں دے سکتے اِس سلسلے میں بہت سے دِیگر نظاموں کے اثرات کا باریک بینی سے جائزہ لینا ہوگا اور اُن تبدیلیوں پر بھی غور و فکر کرنا ہوگا جو ایک معقول جنسی تعلیم کے تحت رُونما ہوتی یا ہوسکتی ہیں یہ بھی واضع رہے جب تک شادی کا بندھن بچوں کے بغیر جاری رہے ریاست کو اس سے دُور کا بھی واسطہ نہ ہونا چاہیے۔ تاہم ریاست محض اُس وقت اس سلسلے میں حرکت میں آسکتی ہے جب اُسے والد کے اُن فرائض کو ادا کرنا ہوں جو اکثر و بیشتر مالی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جہاں اُجرت پر کام کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جیسے کہ سکینڈے نیویا کے مما لک میں ہو رہا ہے۔ وہاں طلاق نہایت آسان ہے۔ طلاق کی صورت میں عام طور پر بچے والدہ کیساتھ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یوں وہاں پدرسری نظام کے معدوم کے ہونے کے رجحانات تیزی سے پرورش پا رہے ہیں۔ لہٰذا اس کا امکان موجود ہے کہ ایک ایسا وقت آجائے کہ شادی کا رواج محض اُمراء اور مذہبی لوگوں تک ہی محدود ہو کر رہ جائے۔

اسی اثناء میں کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر تمام مرد اور عورتیں شادی کے معاملات میں بلکہ اپنے طلاق کے معاملات میں بھی تحمّل، بُردباری، ہمدردی، سچائی اور اِنصاف جیسی خوبیوں کو بروئے کار لاتے رہیں وہ جو روایتی معیار کے مطابق جنسی لحاظ سے پرہیز گار ہوتے ہیں اکثر و بیشتر اُنکے دوسرے اِنسانوں سے تعلقات کی نوعیت نفیس رویوں سے گریز ہوتا ہے اور وہ خود کو آسمانی مخلوق سمجھنے لگتے ہیں۔ اِخلاقیات کے علمبرداروں کی اکثریت جنس کا نام سُنتے ہی نفرت اور جنون میں مُبتلاء ہو کر اِسقدر اس کی مذمت میں مصروف رہتے ہیں کہ وہ سماج میں کسی اور پہلو سے مُفید ہونے والے رویوں پر توجہ ہی نہیں دے پاتے۔

باب ۔۔۔ ۱۲

آزادی اور کالج

''یہ مضمون دراصل 1940ء میں اُس وقت شائع ہوا جب اس کی شاعت سے چند عرصہ قبل ایک جج مگی ہان اپنے ایک فیصلے میں رَسل کو سٹی کالج نیویارک میں بطور پروفیسر تقرری کے نااہل قرار دے چکا تھا۔''

I

اس سے قبل کہ ہم علمی آزادی کے سماجی مرتبہ کو زیرِ بحث لائیں شائد یہ غور کرنا ضروری ہے کہ اس اصطلاح سے ہمارے نزدیک کیا مراد ہے۔ علمی آزادی کا نچوڑ یہ ہے کہ اُستاد کا چُناؤ اُس مہارت کے پیش نظر ہونا چاہیے جس شعبے میں اس نے تعلیم دینی ہو۔ لیکن اس مہارت کا تعین کرنے کے لیے کہ آیا وہ واقعی ماہر ہے یا نہیں دیگر ماہرین کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ آیا کوئی شخص اچھا ریاضی دان، علم طبعیات کا اچھا ماہر یا اچھا کیمیا دان ہے یا نہیں اس کا فیصلہ انتہائی قابل ریاضی دان، علم طبعیات کے ماہرین اور اعلیٰ کیمیا دان ہی کر سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ یہ فیصلہ اُن کے درمیان اتفاق رائے سے ہونا چاہیے۔

علمی آزادی کے مخالفین کا خیال ہے کہ اُستاد کا اپنے شعبے میں ماہر ہونے کے علاوہ اس کی تقرری کے لیے دوسرے معاملات کو بھی زیرِ غور لانا بے حد ضروری ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اُستاد کو اُن خیالات کا اظہار کبھی نہیں کرنا چاہیے جن سے صاحب اقتدار حضرات اتفاق نہ کرتے ہوں۔ یہ انتہائی ٹیڑھا مسئلہ رہا ہے۔ اس کے بارے میں مطلق العنان ریاستوں نے انتہائی سخت مؤقف اختیار کر رکھا ہے۔ روس میں کرنسکی کے مختصر سے اقتدار کے عرصے کے سوا علمی اور نظریاتی آزادی کبھی نہیں رہی۔ میرا خیال ہے اب وہاں زار کے دور سے بھی کم آزادی پائی جاتی ہے۔ جرمنی میں جنگ سے قبل اگرچہ بہت سی پابندیاں عائد تھیں تاہم یونیورسٹیوں میں تعلیم کے دوران اصولی طور پر ہر قسم کی آزادی اظہار کی آزادی موجود تھی۔ لیکن اب سب کُچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جرمنی کے تمام قابل ترین افراد چند استثناء چھوڑ کر جلاءِ وطنی کی

زندگی بسر کر رہے ہیں اور تقریباً یہی حال اٹلی کا ہے جہاں قدرے نرمی ہونے کے باوجود یونیورسٹیوں پر جبر واِستبداد کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ ہماری مغربی جمہوریتوں میں بھی جہاں ابھی تک تو اس صورتِ حال کو افسوسناک ہی قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں بھی ایسے رجحانات کو تقویت مل رہی ہے جن کی شدت سے ہم بھی اس قسم کی برائی کی لپیٹ میں آجائیں۔

یہ خطرہ اتنا بڑا ہے کہ اس کی روک تھام کے لیے محض بے لگام جمہوریت نا کافی ہے کیونکہ ایک ایسی جمہوریت جس میں اکثریت کو بِلا روک ٹوک لامحدود اختیارات حاصل ہوں۔ قریب قریب مطلق العنانیت جیسی ہی جابرانہ ثابت ہوتی ہے اقلیتوں کو برداشت کرنا کسی بھی معقولیت پر مبنی جمہوریت کی خصوصیت ہوتی ہے لیکن عام طور پر یہ خصوصیت نظر انداز کر دی جاتی ہے۔

یونیورسٹی کے اساتذہ کی تقرری کرتے وقت متعلقہ حکام کے پیش نظر بہت سی ترجیحات ہوتی ہیں۔ عام طور پر یونیورسٹیوں کے اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ نہ صرف انتہائی عالم فاضل ہوں بلکہ تربیت کے اعتبار سے اتنے اہل ہوں کہ کسی بھی متنازعہ مسئلے پر مدلل انداز میں غیر جانبداری سے روشنی ڈال سکیں انہیں کسی مخصوص متنازعہ مسئلہ کے بارے میں خاموشی اختیار کیے رکھنے کا فرمان جاری کرنا کسی کمیونٹی کو ان فوائد سے محروم رکھنے کے مترادف ہے جو شائد وہ غیر جانبدارانہ تربیت اور ماحول میں حاصل کر سکتی۔ صدیوں قبل چینی شہنشائیت نے لائسنس یافتہ تنقید کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے سنسر بورڈ کا قیام عمل میں لایا اور اس بورڈ کی رُکنیت اُن لوگوں کو دی گئی جو عقل وفہم کے اعتبار سے سارے مُلک میں مشہور تھے اور ساتھ ہی اُنہیں حکومت اور خود شہنشاہ پر تنقید کرنے کا حق عطا کر دیا۔ بدقسمتی سے اُس روائتی چین کے اندر اور بہت سی روایات کی طرح اس ادارے کو بھی ایک روائت کی شکل دے دی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت کئی ایسے معاملات چل رہے تھے جن کے بارے میں اُن ارکان کو تنقید کرنے کی اجازت حاصل تھی۔ یہاں تک تو سب اچھا تھا لیکن جب ان کی تنقید کسی غیر روائتی میدان میں داخل ہوتی تو شہنشاہ اپنی جارحانہ کاروائی کے دوران اُن ارکان کے استثنائی حق کو نظر انداز کر دیتا۔ اب خود ہمارے درمیان بھی وہی کچھ ہو رہا ہے۔ بلاشبہ ہمارے ہاں بہت سے ایسے شعبے موجود ہیں جن میں تنقید کو بجا طور پر برداشت کیا جاتا ہے لیکن جہاں تنقید کو درحقیقت خطرناک سمجھا جاتا ہے تب پھر متعلقہ مصنف کی شامت آجاتی ہے۔

ہمارے ملک میں علمی آزادی کو لاحق خطرات کے دوسرے سرچشمے بھی ہیں۔ ایک تو طبقہ اُمراء ہے اور دوسرا چرچ ہے۔ ایک تو پابندیوں کا باعث ہوتا ہے تو دوسرا مذہبی پابندیاں عائد کرتا ہے اور جب بھی کسی شخص کی رائے ان کے مزاج کے خلاف پائی جائے تو فوراً یہ دونوں قسم کی قوتیں کمیونزم کے مشترکہ الزام کی بنیاد پر ایک متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال میں خود ہوں۔ اگرچہ میں

1920ء سے سوویت یونین پر مسلسل تنقید کرتا چلا آرہا ہوں اور ابھی حال ہی میں اس رائے کا اظہار کر چکا ہوں کہ سوویت حکومت کم از کم اُتنی ہی بُری ہے جتنی کہ جرمنی میں نازیوں کی حکومت لیکن میرے نقادوں نے اُن تمام تنقیدوں اور تبصروں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میری ہی تحریروں سے اُن ایک یا دو جملوں کو کامیابی سے چُن لیا جن میں میری طرف سے اس اُمید کا اظہار کیا گیا تھا کہ بالآخر روس میں کوئی نہ کوئی اچھائی ضرور نمودار ہوگی۔

صاحب اقتدار لوگوں کے نزدیک ایسے لوگوں سے نمٹنے کا طریقہ کار ایسے عُمدہ پیرائے میں ترتیب دیا جاتا ہے کہ جن کی آراء مقتدر حضرات کے نزدیک غیر پسندیدہ ہیں جو آنے والے وقتوں میں بہت خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں اگر متعلقہ شخص نوجوان ہے نیا نیا ہے اور کسی حد تک گُمنامی کی حالت میں ہے تو اس کے افسرانِ بالا کو خاموشی سے ترغیب دی جاتی ہے کہ اس پر پیشہ وارانہ نااہلی کا اِلزام لگا کر اُسے ملازمت سے فارغ کر دیں لیکن جو عمر رسیدہ ہوں، پُختہ کار ہوں اور عوام میں جانے پہچانے ہوں اور جن کے خلاف مذکورہ طریقہ کار سودمند ثابت نہ ہوسکتا ہو تو اُن کی تحریروں کو توڑ مروڑ کر اس پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے کہ عام پبلک میں اُنکے خلاف نفرت پھیلائی جائے۔ لہٰذا اساتذہ کی اکثریت کسی بھی قسم کے غیر روائتی خیالات چاہے وہ کتنے ہی معمولی نوعیت ہی کیوں نہ ہوں کا اظہار کرنے سے گریز کرنے لگتے ہیں یہ صورت حال اتنی خطرناک ہوتی ہے کہ جہاں ذہانت لاتعلق ہو کر زبان بندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے وہیں رجعت پسندی اور قدامت پسندی کے عناصر کامیاب و کامران ہو کر مزید نُمایاں ہوجاتے ہیں۔

II

لبرل جمہوریت کے اُن اصولوں کے مطابق جن سے امریکی آئین کے بانی بے حد متاثر تھے۔ متنازعہ مسائل کے حل کی بنیاد طاقت کی بجائے بات چیت اور دلائل کے قائل تھے۔ روشن خیال لوگوں کی ہمیشہ سے یہی رائے رہی ہے کہ ہر طرح کی رائے کو بِلا کسی روک ٹوک ہر طرح کے بحث و مباحثہ کے ذریعے تشکیل پذیر ہونا چاہیے ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ یک طرفہ شنوائی ہو اور پھر معاملات کو حتمی طور پر طے کر لیا جائے۔ ظالم و جابر حکومتوں (چاہیے وہ قدیم ہوں یا جدید) نے ہمیشہ اس کے برعکس رویہ اپنائے رکھا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے تو کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی جس کی بنیاد پر روشن خیالی پر قائم روایت کو ترک کر دیا جائے۔ اگر اِقتدار میرے پاس ہوتا تو میں اپنے مخالفین کو ہر طرح سے اظہار رائے کی آزادی فراہم کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتا۔ اس سلسلے میں ان کی کسی طرح بھی حوصلہ شکنی نہ کرتا۔ اُن کی ہر بات کو غور سے سُنتا اور میں تمام آراء کو منظرِ عام پر آنے کے لیے مساوی سہولتیں فراہم کرتا اور نتائج کو دلائل اور بحث و مباحثہ کے سپُرد کر دیتا۔ میرے علم میں ہے کہ پولینڈ میں کُچھ ایسے مشہور اور قابل کیتھولک فلسفی ہیں جو اِن دِنوں جرمن تشدد کا

نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ اُن کے علمی رُتبے کو نئے سرے سے بحال کروانے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتا جو بھی میرے بس میں ہوتا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اُن کے اپنے کیتھولک شریک میری اُن خدمات کو کبھی نہ سراہتے۔ روشن خیال اور رجعتی لوگوں میں فرق صرف اتنا ہی ہے کہ اول الاذکر کے نزدیک ہر قسم کے سوالات اور مسائل کو زیرِ بحث لانا ضروری ہوتا ہے اور ہر قسم کا نقطہ نظر کم یا زیادہ شکوک وشبہات کا حامل ہوتا ہے جبکہ آخر الذکر سے متعلق افراد پہلے سے ہی یہ طے کر لیتے ہیں کہ فلاں فلاں معاملات ہر قسم کے شکوک و شبہات سے مبرا ہیں اور وہ اس قدر طے شدہ ہیں کہ اُن پر کسی بھی قسم کا اعتراض نہیں اُٹھایا جا سکتا لہٰذا اُن کے بارے میں کسی بھی دلیل دینے کی اِجازت نہیں ہونی چاہیے۔ ایسا مؤقف بڑا ہی عجیب وغریب خصوصیات کا حامل ہوتا ہے کیونکہ اُن کے نزدیک درست ہونے کے اعتبار سے ثابت شدہ عقیدے پر تحقیق کی جائے تو اُس کے غلط ہونے کا احتمال ہر وقت موجود رہتا ہے لہٰذا اُس غلطی کو چھپائے رکھنے میں جہالت کو بہترین محافظ قرار دیا جا سکتا ہے یُوں یہ ایک ایسا نقطہ نظر ہے جو اُس شخص کے لیے نا قابلِ قبول ہوتا ہے جس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ انسانی اعمال پر تعصّبات کی بجائے عقل وفہم، دانش ودلیل کی حکمرانی ہو۔

روشن خیالی پر مبنی نقطہ نظر انگلینڈ اور ہالینڈ میں 17 ویں صدی میں مذہبی جنگوں کے ردعمل کے طور پر نمودار ہوا۔ یہ جنگیں تقریباً ایک سو تیس سال تک بڑی شد و مد سے جاری رہیں لیکن ان کے نتیجے میں کوئی بھی فریق کامیاب نہ ٹھہر سکا۔ اس میں نہایت دلچسپ بات یہ تھی کہ اِن جنگوں میں شریک ہر فریق کو نہ صرف یہ یقین تھا کہ صرف وہی حق پر ہے بلکہ اس کی فتح پوری انسانیت کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ آخر کار اُن غیر فیصلہ کُن طویل جنگوں سے اُکتائے ہوئے عاقل لوگ بھی سامنے آنا شروع ہو گئے جو نہ صرف دونوں متعلقہ فریقین کی کشمکش کو غلط سمجھتے تھے بلکہ اُن کے فتح کے نام ونہاد یقین کو بھی باطل قرار دیتے تھے۔ اس سلسلے میں تحمل اور برداشت کے بڑھتے ہوئے نئے دور کے آغاز میں جان لاک نے سیاست اور فلسفہ پر بہت کچھ لکھا۔ اس نے انسان کی اجتماعی طور پر سوچنے سمجھنے میں غلطیوں کی شدت سے نشاندہی کی اور تب مسلسل ترقی کا ایک ایسا دور شروع ہوا جو 1914ء تک برقرار رہا۔ لاک اور اس کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے اثر کی بدولت ہی یہ ممکن ہو سکا کہ اتنے طویل عرصے تک کیتھولک ممالک میں پروٹسنٹ لوگ پُرامن طریقے سے مقیم رہے اور پروٹسنٹ ممالک میں کیتھولک عقیدہ رکھنے والے لوگ پُرامن طریقے سے رہتے رہے۔ جہاں تک متنازعہ امور پر بحث ومباحثے کا تعلق ہے انسانوں نے ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا سبق کم وبیش حاصل کر لیا ہے۔ لیکن جنگ عظیم اول کے خاتمے کے فوراً بعد اُٹھ کھڑے ہونے والے متنازعہ امور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب کے سب لوگ روشن خیال فلسفیوں کے عاقلانہ فرمان اور مقولہ جات مکمل طور پر فراموش کر چکے ہیں۔

اب ہم کوایکرز (مذہبی فرقہ) سے اُس طرح خوفزدہ نہیں رہتے جس طرح کہ سنجیدگی اور ایمانداری سے مسیحیت کو ماننے والے چارلس II کے دربار سے ڈرے رہتے تھے۔ بلکہ اب ہم اُن لوگوں سے سہمے ہوئے رہتے ہیں جو آج کے مسائل پر 17 صدی کے کوایکرز کے نقطہ نظر اور اُن کے اصولوں کا اپنے زمانے کے مسائل پر اطلاق کیا کرتے ہیں۔ عام طور پر وہ آراء جن سے ہم اختلاف کرتے ہیں قدامت کے اعتبار سے کسی قدر قابل احترام سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن ایک ایسی نئی رائے یا اچھوتا خیال جو ذرا روایت سے ہٹ کر ہو کا سامنا کرتے ہوئے صدمے سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

جمہوری نظام کے دُرست انداز میں چلنے کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک زاویہ نگاہ تو یہ ہے کہ اکثریت کی رائے کو ہر میدان میں حتمی سمجھا جائے اور دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ جہاں مشترکہ فیصلے کی ضرورت نہ ہو تو مختلف ملتی جلتی آراء کو اُن کے بار بار اعادے کی نسبت سے ایک دوسرے کے قریب ترتیب سے رکھا جائے۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر کا عملی طور پر نتیجہ ایک دوسرے سے بہت ہی مختلف ہوگا۔ پہلے نقطہ نظر کے مطابق اگر اکثریت کسی رائے کے حق میں فیصلہ دے دیتی ہے تو پھر کسی دوسری رائے کا اظہار قطعی طور پر نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اگر ہو بھی تو نہایت مبہم انداز میں اور غیر مؤثر ذریعے سے ہونا چاہیے اور دوسرے نقطہ نظر کے مطابق اقلیتی آراء کو بھی اظہار کے اُتنے ہی مواقع میسر آنے چاہیں جتنے کے اکثریت کی آراء کو لیکن قدرے کم شدت کیساتھ۔

دوسرے نقطہ نظر کا اطلاق خاص طور پر اُستاد کی طرف سے تعلیم دیتے ہوئے ہوتا ہے اُس مرد یا عورت جسے ریاست کی طرف سے اُستاد مقرر کیا گیا ہو سے ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ بھی اکثریتی رائے کا اظہار کرے اگرچہ اساتذہ کی اکثریت اکثریتی رائے کا ہی اظہار کرتی ہے نہ صرف یہ کہ اساتذہ کی طرف سے آراء کی مکمل ہم آہنگی مطلوب نہیں ہونا چاہیے بلکہ اگر ممکن ہو تو ایسی صورت حال سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ تعلیم کے دوران مختلف الانوع خیالات اور آراء کا پایا جانا ایک مناسب تعلیم کی نشونما کے لیے نہایت صحت مند ہوتا ہے۔ کوئی بھی ایسا شخص خود کو تعلیم یافتہ نہیں کہلوا سکتا جس نے ایسے سوالات کے بارے میں محض یک طرفہ طور پر کچھ سُن رکھا ہو اور جن کے بارے میں عام پبلک کی رائے منقسم ہو۔ جمہوری نظام کے تحت چلنے والے اداروں میں دلائل کو جانچنے اور ذہن کو کُھلا رکھنے کی تعلیم دینا بے حد اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ تاکہ جس فریق کی رائے مناسب معلوم ہوتی دکھائی دے اُسے کُھلے دل سے تسلیم کر لینے میں کوئی دِقت محسوس نہ ہو۔ کیونکہ جونہی ایسی آراء جن کو اساتذہ درست تسلیم کرتے ہیں پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں تو تعلیم مذکورہ مقصد کے حصول میں مُفید ہونا ترک کر دیتی ہے تب کسی قوم میں وہ رجحانات تقویت پکڑنا شروع کر دیتے ہیں جن کی بناء پر لوگ انسانوں کی قوم بننے کے بجائے اندھی تقلید اور دقیانوسی خیالات کے حامل

جنونیوں کے ریوڑ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد سے جنون پر قائم بڑی مہارت سے تراش کردہ نظریات اور عقائد از سرِ نو تیزی سے پھیلتے ہوئے دُنیا کے ایک بہت حصے کو اس حد تک اپنی گرفت میں لے چکے ہیں کہ اور بین الاقوامی ماحول اس قدر کشیدہ ہو چکا ہے۔ جس کو 17 ویں صدی کی مذہبی جنگوں کے دورانیہ کیفیت سے تشبیہ دے سکتے ہیں اور وہ جو آزادانہ تبادلہ خیال کے مخالف ہیں اور وہ جن کی آرزو ہے کہ ایسی آراء کے اظہار پر پابندی لگائی جائے جو ہمارے نوجوانوں کے علم میں ہونا چاہیں اپنے پسندیدہ خیالات و نظریات کو زبردستی ٹھونستے ہوئے دُنیا کو تیزی سے اُس قسم کی بے مثال طویل تصادم کی طرف دھکیل رہے ہیں جس قسم کی عدم برداشت اور عدم رواداری سے پیدا شدہ کیفیت سے جان لاک اور اُس کے رُفقاء نے اپنی سر توڑ کوششوں سے دُنیا کو باہر نکالا۔

میرے نزدیک دو ایسے سوالات ہیں جن کے درمیان بہت کم امتیاز کیا جاتا ہے پہلا سوال یہ ہے کہ خود حکومت کی وضع قطع کیسی ہونی چاہیے اور دوسرا یہ کہ حکومت کے فرائض کیا ہونے چاہیں۔ اس میں شُبے کی گنجائش ہی نہیں کہ بہترین حکومت جمہوری حکومت ہی ہوتی ہے لیکن حکومت کے فرائض اور کارکردگی کے حوالے سے اس کا ہر وقت احتمال رہتا ہے کہ یہ کب پٹڑی سے اُتر جائے۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے معاملات ہوتے ہیں جن میں مشترکہ کاروائی کا تعلق ہے اس کا فیصلہ اکثریت کے بل پر ہونا چاہیے۔ لیکن کچھ اور دیگر معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا فیصلہ نہ تو مشترکہ کاوشوں سے ہونا ضروری ہوتا ہے اور نہ ہی ایسا کرنا پسندیدہ فعل سمجھا جا سکتا ہے۔ ان معاملات میں اظہار رائے کی آزادی بھی شامل ہے چونکہ صاحب اقتدار لوگوں کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ ہر دم اس کوشش میں ہوتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح آزادانہ پھلنے پھولنے والی آراء پر قدغن لگاتے رہیں چنانچہ ان کے اس رجحان کی روک تھام کے لیے ایسے اداروں اور کمیٹیوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو عملاً یا پھر نظریاتی اعتبار سے کسی حد تک دباؤ سے آزاد ہوں۔ اس قسم کی آزادی ان ملکوں میں موجود ہے جن کی تہذیب کا ماخذ یورپی تاریخ میں چرچ اور ریاست کے درمیان قرون وسطیٰ کے دور میں تصادم کی صورت حال میں ملتا ہے۔ جبکہ بازنطینی سلطنت میں چرچ ریاست کے پوری طرح زیرِ نگیں رہا اور اس حقیقت کے پیش نظر تاریخ میں روس کے اندر کسی قسم کی آزادی کی روایت نہیں ملتی۔ جبکہ روس کی تہذیب کا ماخذ استنبول ہے۔ مغرب میں پہلے تو کیتھولک چرچ اور بعد میں پروٹسٹنٹ کے بہت سے فرقوں نے بتدریج ریاست سے مخصوص قسم کی آزادیاں حاصل کر لیں۔ چنانچہ خاص طور پر علمی آزادی دراصل کیتھولک چرچ سے آزادی کا ایک حصہ تھی چنانچہ چرچ کی طرف سے ایسی پابندیوں کا ہنری ہشتم کے ہاتھوں خاتمہ ہوا۔ میں دوبارہ زور دے کر کہتا ہوں کہ قطع نظر کسی طرزِ حکومت

کے آزادی اظہار کی بقاء کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے افراد پر مشتمل ادارے موجود ہوں جو ریاست کے اثر و رسوخ سے کسی حد تک آزاد و خود مختار ہوں اور اُن اداروں میں یونیورسٹیاں بھی شامل ہوں۔ امریکا میں پرائیوٹ یونیورسٹیوں کے اندر جمہوری حکام کے تحت چلنے والے تعلیمی اداروں میں مقابلتاً کہیں زیادہ آزادانہ ماحول پایا جاتا ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ حکومت کے فرائض اور کارکردگی کے بارے میں ضرورت سے زیادہ غلط فہمیاں نہیں پائی جاتیں ہیں۔

III

ٹیکس ادا کرنے والوں کا خیال ہے کہ چونکہ یونیورسٹی کے اساتذہ کی تنخواہیں وہ اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں لہٰذا یہ اُن ہی کا حق ہے کہ وہ طے کریں کہ اساتذہ بچوں کو کیا تعلیم دیں۔ اگر اس اُصول کو تسلیم کرلیا جائے تو منطقی اعتبار سے اس کا یہی مطلب ہوگا کہ اعلیٰ تعلیم کے اعتبار سے جو رُتبہ یونیورسٹی پروفیسروں کو حاصل ہے سرے ہی سے مسترد کردیا جائے اور یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ کسی بھی قسم کی مخصوص اہمیت کے حامل نہیں۔ کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح اُنہیں ہنرمندی سے کنٹرول کرنا ایک نہایت ہی احمقانہ فعل ہے شیکسپیئر نے ایک دفعہ ایسی ہی یا اس سے ملتی جلتی صورت حال کو موت کے مترادف قرار دیا تھا۔ تاہم بہت سے اُن امریکیوں کا خیال ہے جنہوں نے جمہوریت کو اچھی طرح سمجھا اور جانچا ہے کہ تمام یونیورسٹیوں پر ایسا ہی کنٹرول ہونا چاہیے۔ اُن کے نزدیک اختیاررات کا استعمال بھی کسی حد تک جائز ہے کیونکہ یہ اُس صورت حال سے کہیں بہتر ہے جہاں ایک عام شخص کو ممتاز شخصیتوں کے بارے میں فیصلہ کرنے کے اختیارات حاصل ہوں۔ وہ رومن سپاہی جس نے ارشمیدس کو ہلاک کیا تھا نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ البتہ اگر اُسے اپنی جوانی میں اپنے میلان کے خلاف مجبور کیا جاتا کہ وہ جیومیٹری میں بطور ایک لازمی مضمون کے تعلیم حاصل کرے تب وہ اَرشمیدس جیسے ممتاز ''خطاکار'' کو ہلاک کرتے ہوئے ایک ہیجان خیز لطف ضرور محسوس کرتا۔ اسی طرح ایک جاہل امریکن جو اپنے نظریات پر جنون کی حد تک بے لچک رویے کا حامل ہو بھی اپنے جمہوری اختیارات کو ایسے لوگوں کے خلاف استعمال کرتے ہوئے جن کے نظریات دیگر جاہلوں کے علاوہ خود اس کے اپنے نزدیک ''شرانگیز'' ہوں اتنی خوشی محسوس کرے گا جس کی شدت سے وہ خود بھی ہیجان میں مبتلاء ہوسکتا ہے۔ جمہوریت میں بے شمار خوبیاں ہونے کے باوجود اس میں اختیارات کے ناجائز استعمال کا ہر وقت خطرہ موجود رہتا ہے کیونکہ اس میں اجتماعیت ہونے کی وجہ سے اکثر و بیشتر حکام میں ہجوم کی جذباتیت سے مغلوب ہوکر بہہ جانے کے رجحانات خاصے طاقتور ہوتے ہیں۔ وہ شخص جو ہجوم کے جذبات بھڑکانے کا فن جانتا ہے اُس کے پاس ایک ایسی جمہوریت میں بدی پھیلانے کی قوت ہاتھ آجاتی ہے جہاں اکثریت کے اختیارات کے استعمال کی عادت کا ایسا نشہ اور محرک تخلیق ہوتا ہے

جو حکام کو جبر اور تشدد کی طرف آسانی سے مائل کر دیتا ہے اور اس قسم کی صورت حال کا جلد بدیر پیدا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ اس خطرے کا مقابلہ صرف ٹھوس بنیادوں پر مناسب تعلیم سے ہی کیا جا سکتا ہے جس کی تشکیل ایسے غیر مناسب رجحانات سے نبرد آزما ہونے کے لیے مفید ثابت ہو جو اجتماعی نفرت کا باعث ہوتے ہیں یونیورسٹی کے اساتذہ کی اکثریت ایسی ہی تعلیم دینے کی خواہشمند ہوتی ہے لیکن اوپری سطح پر بیٹھے مالکان، افسران، طبقہ اشرافیہ اور صاحب اقتدار لوگ اُنکے لیے اتنی مشکلات کھڑی کر دیتے ہیں کہ وہ اس کام کو مؤثر انداز میں کرنے سے قاصر رہتے ہیں چونکہ اُنکے اپنے اقتدار کی بنیاد ہجوم کی سطحی جذباتیت پر ہوتی ہے لہٰذا اُنہیں بخوبی علم ہوتا ہے کہ اگر مناسب اور معقول خیالات سماج کے اندر جڑیں مضبوط کر لیں تو اُنکا اقتدار سے محروم ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نچلی سطح پر حماقت اور جہالت کی قوت اور بالائی سطح پر اقتدار سے محبت باہم مل کر ایسے شیر و شکر ہوتے ہیں کہ معقول لوگوں کی کوششیں مفلوج ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اس ملک کے تعلیمی اداروں میں جتنی اب تعلیمی آزادی موجود ہے۔ اس بُرائی کو دُور کرنے کے لیے کہیں زیادہ علمی آزادی درکار ہے کیونکہ اس کے ذریعے ہی برائی کی روک تھام ہو سکتی ہے لہٰذا علمی آزادی کے لیے ماضی کے مقابلے میں زیادہ سازگار ماحول بنانے کے لیے زبردست کاوشوں اور اقدامات اُٹھانے کی ضرورت ہے اختلاف رائے کی بنیاد پر ذہین و فطین لوگوں کی ایذا رسانی کا غیر مقبول طریقہ کار کسی بھی ملک کے لیے اکثر تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ سپین اِس سلسلے کی بہترین مثال ہے جہاں سے وسیع پیمانے پر مُوروں اور یہودیوں کو جلاوطن کر دیا گیا جس کے نتیجے میں زراعت مسلسل زوال پذیر ہوتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی انتہائی ناقص مالی پالیسی اختیار کی گئی۔ ان دونوں وجوہات کے اثرات شروع میں چارلس پنجم کے لیے بے پناہ اختیارات کی وجہ سے کچھ عرصے تک چھپے رہے۔ لیکن جب اُن کا اظہار شروع ہوا تو سپین جو یورپ میں بہت اہم مقام رکھتا تھا اپنی اہمیت کھوتا چلا گیا۔ اس لیے یہ بڑی آسانی سے فرض کیا جا سکتا ہے کہ اُنہیں مذکورہ وجوہات کی بناء پر بالآخر جرمنی کا بھی یہی حال ہونے والا ہے۔ کیونکہ ایک ہی طرح کی وجوہات ایک ہی طرح کے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ لیکن ایسا ہونے میں قدرے دیر بھی ہو سکتی ہے۔ روس میں جہاں قدرے زیادہ طویل عرصے سے اِن برائیوں پر عمل ہو رہا وہاں اُنکے اثرات بھی زیادہ نُمایاں ہو کر سامنے آ رہے ہیں حتیٰ کہ وہ اثرات وہاں کے فوجی اُمور میں نظر آنے لگے ہیں۔

روس اس وقت ایسا مُلک ہے جو ان برائیوں کے نتائج کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ جہاں کے شدت پسند نظریاتی جُہلاء ملک بھر کے اقتدار پر اس درجے کا کنٹرول حاصل کر چکے ہیں کہ اُن کے بھائی بند جُہلاء خود نیویارک پر بھی ویسے ہی درجے کا اقتدار حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ پروفیسر اے وی ہِل نے دسمبر 1938ء میں شائع ہونے والے آسٹرونومیکل جرنل آف سوویت یونین نامی

رسالے کا حوالہ دیتے ہوئے مندرجہ ذیل اقتباسات نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں جو مندرجہ ذیل میں بیان کیے گئے ہیں:

(i) 'جدید بورژوازی ابتدائے کائنات کے علم سے متعلق شدید نظریاتی اُلجھن میں مبتلا ہے اور یہ اُلجھن محض اس لیے ہے کہ وہ جدلی مادیت کے نظریئے کی سچائی کو تسلیم کرنے سے مسلسل انکار کر رہی ہے اور وہ سچائی دراصل زمان و مکان کے اعتبار سے کائنات کی بے پناہ وسعت کا ہونا ہے۔'

(ii) فاشزم کے ایجنٹوں کی کاروائی میں اِس وقت اِتنا اضافہ ہو چکا ہے کہ اُنہوں نے نہ صرف اجرام فلکی سے متعلق اداروں میں اہم عہدوں پر فائز ہونے کا بندوبست کر لیا ہے بلکہ پریس اور دوسرے اداروں میں بھی داخل ہونے لگے ہیں اور ادب میں بھی انقلاب کے خلاف ردِانقلاب کے لیے بورژوازی رُجعت پسندانہ پراپیگنڈے میں مصروف ہو گئے ہیں۔

(iii) سوویت مادیت کی چند ایک تصانیف جو ابتداء کائنات کی بابت تحریر کی گئیں تھیں دُشمنوں کی سازشوں کی وجہ سے ماضی قریب تک غیر شائع شدہ پڑی رہیں۔

(iv) طلبا کی اُس وسیع تعداد کو ابتداء کائنات کے علم سے متعلق تعلیم سے آراستہ کیا گیا۔ جو سائنسی علوم میں دلچسپی رکھتے تھی۔ اس سلسلے میں پڑھاتے وقت اس پہلو کو بھی نظر انداز کر دیا گیا کہ اج کل بورژوازی کائنات کے علم کے بارے میں کن نظریاتی اُلجھنوں میں گھری ہوئی ہے۔

(v) سوویت عوام دُشمنوں کے عزائم کو بے نقاب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نئی سوویت مادیت پر مبنی کائناتی علم کو ترقی دی جائے۔

(vi) اس حقیقت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ بین الاقوامی سائنسی میدان میں سوویت سائنس کائناتی علم کے بارے میں اُن نظریاتی کامیابیوں سے لیس ہو کر داخل ہو جن کی بنیاد ہمارے فلسفیانہ طرزِ فکر اور طریقہ کار پر ہو۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ حقیقت نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ سوویت فاشزم اور جدلی مادیت کو بالترتیب امریکیوں کمیونزم اور کیتھولک سچائی کے متبادل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یوں ایک طرح کی دستاویزی تصویر واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سوویت یونین میں علمی آزادی کے دُشمنوں کا آپس میں پابندیوں کے بارے میں کس قدر اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔

IV

اس ساری صورت حال میں ایک حوصلہ افزاء پہلو یہ ہے کہ گو امریکا میں اب تک اکثریت کا ظلم و تشدد کوئی نئی بات نہ تھی لیکن آج سے سو سال قبل کے مقابلے میں اس کی شدت میں کافی حد تک کمی آچکی

ہے۔ اس حقیقت کا دراک ڈیٹوکوِل کی کتاب ''امریکا میں جمہوریت'' کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص کرسکتا ہے۔ لیکن اُس کے بیان کردہ کچھ مشاہدے اور تبصرے سچ پر مبنی نہیں ہیں۔ تاہم اس کے بڑے حصے سے اب بھی اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر میں اُس کے اس بیان سے قطعی طور پر اتفاق نہیں کرسکتا کہ مہذب دُنیا کے تمام مملک سے فلسفے پر سب سے کم توجہ امریکا میں دی گئی۔ لیکن میرا خیال ہے اُس نے حقائق کا ذکر کرتے ہوئے کافی حد تک انصاف سے کام لیا ہے لیکن قدرے کم بیان کیا ہے جو کہ مندرجہ ذیل پیراگراف سے عیاں ہے۔

''امریکا میں اکثریت آزادانہ اظہار رائے کی راہ میں خوفناک رکاوٹیں کھڑی کرتی رہتی ہے ان رکاوٹوں اور پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے مصنف جو چاہے لکھے اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص مقرر کردہ حدود کو ایک بار پار کرلے تو اُسے زندگی بھر پچھتانا پڑتا ہے۔ یہ نہیں کہ اُسے پھانسی پر چڑھنے یا زندہ جلائے جانے کا خوف ہوتا ہے بلکہ اُسے قدم قدم پر ذِلت ورُسوائی اور ملامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُس کا سیاسی مُستقبل ہمیشہ کے لیے محض اس لیے تاریک ہوجاتا ہے کیونکہ وہ اپنے فعل سے اُن حکام کی ناراضگی مُول لیتا ہے جو اس کی کامیابی کی راہ ہموار کرسکتے ہیں۔ اُس کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا نہ اُس کی معافی تلافی ہوسکتی ہے اُس کی شہرت کو ہر طرح سے نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے تائیں یہ سمجھتا ہے کہ بعض مخصوص خیالات سے اُس کے بہت سے قریبی دوست واحباب اُس سے متفق ہیں پھر جب وہ اُن کا آزادانہ اظہار اور اشاعت شروع کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اُسے اپنے طاقتور حریفوں کی طرف سے کڑی تنقید اور دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ وہ لوگ بھی خاموشی سے اُس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں جو اس کے خیالات سے اتفاق تو رکھتے ہیں لیکن اُن میں اس کے ساتھ کھڑا رہنے کی ہمت و جرأت نہیں ہوتی تب وہ اپنی روزمرہ کی ناکام کوششوں کے پیشِ نظر ٹھنڈا ہوکر خاموشی سے بیٹھ رہتا ہے جیسے گویا وہ اپنے سچ بولنے پر ہمیشہ کے لیے پچھتاوے میں مبتلاء ہو۔''

جب ڈیٹوکوِل جمہوریت میں فرد پر سماج کے دباؤ کا ذکر کرتا ہے تو میرا خیال کہ اُس سے لازمی طور پر اتفاق کرلینا چاہیئے کیونکہ اُس نے ایک ایسی حقیقت بیان کی ہے جو مندرجہ ذیل پیراگراف سے ظاہر ہوتی ہے۔

''جب کسی جمہوری ملک میں رہنے والا شخص خود کو اپنے اِردگرد رہنے والوں سے تقابلی جائزہ لیتا ہے تو سب کو اپنے ہم پلہ پاتے ہوئے اپنا سر فخر سے بلند کرلیتا ہے۔ لیکن وہ جب اُن سب افراد کو ایک اکائی کی حیثیت سے سماج کی صورت میں اپنے سے تقابل کرتا ہے تو اُسے اپنی کم مائیگی اور کمزوری کا شدت سے اِحساس ہوتا ہے سماج کی صورت میں افراد کی اکثریتی تعداد اور اُن کے اثر ورُسوخ کے پیشِ نظر وہ خود کو یکہ د

تنہا اور غیر محفوظ تصور کرنے لگتا ہے۔ لہٰذا پبلک مجموعی طور پر ایک اکائی کی صورت میں بذاتِ خود ایک ایسی واحد بڑی قوت کے طور پر نمودار ہوتی ہے جس کا ماضی میں اشرافیہ کے تحت اقوام نے کبھی باور نہیں کیا ہوگا۔ کیونکہ یہ (قوت) مخصوص آراء کی محض ترغیب نہیں دیتی بلکہ زبردستی ٹھونستی ہے اور اپنی تعداد کے غلبے کے بل بُوتے پر علم کے انتہائی اہم شعبوں میں دخل انداز ہوتی ہے۔''

یہ عفریت اپنے عظیم حجم کی وجہ سے ڈیٹوکوِل کے نزدیک محض جمہوری ملکوں میں ہی نہیں بلکہ ہر جگہ انسانی مرتبے میں بتدریج کمی کا باعث ہوتے ہوئے اب یہ بے حد خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے اور اگر یہ یونہی بلا روک ٹوک چلتا رہا تو مغربی تہذیب عقل وفہم اور دانش کی ترقی سے بہت جلد محروم ہو جائے گی۔ کیونکہ سنجیدہ معاملات میں تمام شعبوں سے متعلق علم ودانش کی ترقی کا انحصار بیرونی دباؤ سے آزاد ماحول پر ہی ہوتا ہے۔ لیکن اس قسم کا ماحول وہاں تو دستیاب ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ جہاں اکثریتی منشاء کو ایسا مذہبی قسم کا تقدس دے دیا جائے جیسا کہ روایتی قسم کے مذہبی لوگ خدا کی منشاء کو دیتے ہیں۔ مزید براُں اکثریتی رائے کا تقدس خدا کی منشاء کے تقدس سے زیادہ ضرررساں ثابت ہوتا ہے کیونکہ اکثریتی منشاء کے نفاذ کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آج سے 40 سال قبل ڈربن کے قصبے میں ایک فلیٹ اَرتھ نامی سوسائٹی کے رُکن کا ایمان تھا کہ زمین چپٹی ہے۔ نہ جانے اُس کے دِماغ میں کیا سمایا کہ اُس نے اعلان کر دیا کہ ''ہے کوئی اِس دُنیا میں کوئی مائی کا لال جو میرے اس دعوے کو غلط ثابت کر دے کہ زمین چپٹی ہے۔'' اُس کے اس چیلنج کو ایک بحری جہاز کے کپتان نے منظور کر لیا۔ چنانچہ مقررہ تاریخ کو مقررہ مقام پر بحث میں حصہ لینے والوں کے گرد مجمع اکٹھا ہو گیا۔ قصہ مختصر کپتان کے پاس زمین کے گول ہونے کی صرف ایک ہی دلیل تھی کیونکہ وہ خود اس سے قبل زمین کا چکر لگا کر واپس آ چکا تھا۔ چنانچہ رائے شُماری کے نتیجے میں کپتان کی دلیل آسانی سے رَد کر دی گئی اور چپٹی زمین کے حق میں پراپیگنڈے باز دوتہائی اکثریت سے جیت گئے یوں عوام کی فتح ہو گئی اور جمہوریت پسندوں کا اس نام ونہاد حقیقت پر ایمان رکھنا لازم ہو گیا کہ ڈربن میں زمین چپٹی ہوتی ہے (میرا اندازہ ہے کہ ڈربن میں ابھی تک کوئی یونیورسٹی قائم نہیں ہو سکی) لہٰذا میں بڑے وسوخ سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس وقت سے آج تک ڈربن کے پبلک سکول میں کسی اُستاد کو تعلیم دینے کی اجازت نہیں ہوتی جب تک کہ وہ متعلقہ حکام کے سامنے یہ حلفیہ بیان نہ دے کہ زمین کو گول قرار دینا کُفر کے مترادف ہے اور یہ کہ یہ عقیدہ نہ صرف کمیونزم کی طرف مائل کرتا ہے بلکہ خاندان کی تباہی کا باعث بھی ہوتا ہے۔ ایسا کیونکر ہو جاتا ہے اس بارے میں میری معلومات اِنتہائی ناقص ہیں۔

صد افسوس اجتماعی عقل افراد کی ذہانت کا کسی طرح بھی متبادل نہیں ہو سکتی۔ وہی افراد جنھوں نے موصولہ آراء کو پرکھا، جانچا اور اُن کا تنقیدی جائزہ لیا اخلاق اور دانش کی ترقی کا باعث ہوئے۔ سقراط، گلیلیو

اور کرائسٹ ایسے تقریباً تمام لوگ ہی فطری طور پر اپنے اپنے زمانے میں ناپسندیدہ خیال کیے جاتے رہے اور سب ہی قدامت پسندوں کی جانب سے دھمکیوں اور تشدد کا نشانہ بنتے رہے۔ لیکن پہلے وقتوں میں کسی قسم کی معلومات کو خفیہ رکھنے کے طریقے آج کے مقابلے میں بہت پسماندہ تھے۔ اگر کسی کافر قرار دیئے گئے شخص کو پھانسی چڑھایا جاتا تھا تو اس کو خاصی شہرت مل پاتی۔ شُہداء کا خون چرچ کے پھلنے پُھولنے میں کھاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن آج کے جدید جرمنی جیسے مُلک میں ایسا ہونا ممکن نہیں رہا۔ وہاں اب شہادت اتنی خفیہ رہتی ہے نہ تو شہید کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی اُس کے اندازِ فکر کا۔

جہاں تک ایسے اندازِ فکر کا تعلق ہے علمی آزادی کے مخالفین کا اگر بس چلتا تو وہ اس ملک کی حالت جرمنی جیسی کر دیتے جس رائے کا اِظہار اُنہیں ناپسند ہوتا اُسے دبانے کے لیے وہی طریقہ کار اختیار کرتے جو جرمنی میں اختیار کیا جا رہا ہے۔ وہ انفرادی نظریات کے خاتمے کے لیے باقاعدہ منظم ظلم و تشدد کا بے محابہ استعمال کرتے وہ ہر نئے سے نئے خیال کی ممانعت کر دیتے وہ پورے سماج کو ساکت و جامد کر دیتے الغرض اگر وہ آنے والی سات پشتوں کو اُن کی زندگی سے موت تک خاموشی سے یوں رُخصت کر سکتے جیسے کہ تاریخ میں وہ کبھی تھے ہی نہیں تو وہ ایسا بھی کر گزرتے۔ کچھ لوگوں کو شاید محسوس ہو کہ وہ اسوقت جس علمی آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں بہت معمولی نوعیت کا ہے اور شاید یہ بھی کہا جائے کہ ایک ایسی دُنیا میں جہاں جنگ اپنے پورے زور و شور سے چل رہی ہو علمی آزادی ان لوگوں کے لیے کیا حقیقت رکھتی ہے جو اس مستقل جاری رہنے والی ناانصافی کا حصہ ہی نہیں؟ مجھے اعتراف ہے کہ علمی آزادی کا مسئلہ بذاتِ خود سب سے پہلی ترجیح ہونے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ اسی جنگ کا ناگزیر حصہ ضرور ہے یاد رکھیے اس وقت بہت سے مسائل اور اُمور داؤ پر لگے ہوئے ہیں جو بہت بڑے بھی ہیں اور ایسے بھی جو بظاہر معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن میں اہم ترین فرد کی اپنی رُوح کی وہ آزادی ہے جو انسانیت کے لیے اُمیدوں اور عقائد کی صورت میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ جن سے چاہے بہت سے اِتفاق رکھتے ہوں یا چند ایک یا پھر کوئی بھی اتفاق نہ کرے لیکن انسانیت کو ہمیشہ نئی اُمیدوں، نئے عقائد اور نئے خیالات کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے لیکن یہ اُکتا دینے والی یکسانیت سے قطعی طور پر توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہاں سے ایسا کچھ پُھوٹے۔

باب__۱۳

خدا کا وجود

(برٹرینڈرسل اور فادر کوپلیسٹن کے درمیان مکالمہ)

فادر کوپلیسٹن : چونکہ ہم خدا کے وجود کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے والے ہیں۔ اس لیے بحث شروع کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ہم کسی ایسی بات پر عارضی طور پر ہی سہی متفق ہوں جہاں سے ہم گفتگو کا آغاز کر سکیں۔ مثلاً یہ اصطلاح کہ ''خُدا'' سے ہماری کیا مراد ہے؟ میں فرض کر لیتا ہوں کہ خدا سے ہماری مراد ایک اعلیٰ و اَرفع ذات ہے جو دُنیا سے الگ بھی ہے اور اِس دُنیا کی خالق بھی تو کیا خدا کی اس اصطلاح کا جو مطلب میں نے بیان کیا ہے آپ اس سے اِتفاق کریں گے؟

رَسل: ہاں میرے لیے یہ مطلب قابل قبول ہے۔

کوپلیسٹن : تب میری پوزیشن مُثبت ہونے کے حوالے سے یہ ہے کہ حقیقت میں خدا کا وجود ہے اور یہ کہ اُس کے وجود کو فلسفے سے ثابت کیا جا سکتا ہے اور ہاں آپ بھی اپنی پوزیشن واضع کریں کہ آیا تذبذب میں مبتلاء ہیں یا بالکل ہی مُنکر ہیں؟ اس ساری بات سے میرا مطلب یہ ہے کہ کیا آپ خدا کے عدم وجود کو ثابت کر سکتے ہیں؟

رَسل: میں کسی بھی قسم کے تذبذب میں مُبتلاء نہیں ہوں۔

کوپلیسٹن : کیا آپ میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ خدا کے ہونے کا مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مثال کے طور پر اگر خدا موجود نہیں ہے تو پھر انسان اور انسانی تاریخ کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد ہو ہی نہیں سکتا سوائے اس مقصد کے جو اُنہوں نے اپنے لیے چن رکھا ہو۔ جس کا عملی طور پر امکانی مطلب اُس مقصد کو مسلط کرنا ہوتا ہے جس کو اُنہیں مسلط کرنے کا اختیار حاصل ہو؟

رَسل: سرسری طور پر کہہ سکتا ہوں کہ ہاں۔ اگرچہ آپ کے آخری جملے پر مجھے تھوڑا سا اعتراض ہے۔

کوپلیسٹن : کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے کہ اگر خدا نہیں ہے اگر کوئی حتمی وجود ہی نہیں ہے تو پھر حتمی قدریں بھی نہیں ہو سکتیں؟ کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے کہ اگر کوئی حتمی اچھائی نہیں ہوتی تو پھر قدروں کی

اضافیت کا کیا مطلب؟

رَسل: نہیں! میرا خیال ہے یہ سوالات منطق کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر جی ای مُور جب اپنی کتاب میں یہ کہتے ہیں کہ اچھائی اور برائی میں فرق ہوتا ہے۔ ان دونوں الفاظ کا اپنا اپنا مطلب ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایسا کہتے ہوئے اپنی دلیل کو مضبوط بنانے کے لیے خدا کا خیال بیچ میں نہیں لاتے۔

کوپلیسٹن: اچھا تو پھر ہم اچھائی کے سوال کو اخلاقی دلائل کے آنے تک مؤخر کر دیتے ہیں۔ میں اب سب سے پہلے مابعد الطبعیاتی دلیل پیش کرتا ہوں۔ میرا سب سے زیادہ زور ایک ایسی دلیل پر ہے جو لائبنز کی کی دلیل (امکان) کی بنیاد پر ہے اس کے بعد ہی اخلاقی دلیل پر بحث کریں گے۔ فرض کریں کہ میں ایک تصور پر مبنی دلیل کی بنیاد پر مختصر سا بیان دیتا ہوں۔ تب ہم بحث جاری رکھیں گے۔

رَسل: میرے نزدیک یہ ایک اچھی تجویز ہے۔

امکان سے ماخذ دلیل

کوپلیسٹن: وضاحت کی خاطر میں اپنی دلیل کو دو مرحلوں پر پیش کروں گا۔ سب سے پہلے میرا کہنا یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ دنیا میں کچھ ایسے وجود ہیں جن کے اندر اپنے ہی وجود کا خود مختار جواز نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر میرا اپنا انحصار اپنے والدین پر تھا اور اب ہوا اور خوراک وغیرہ پر ہے۔ دوسرا یہ کہ دنیا ایک حقیقت ہے یا ایک تصوراتی اکائی یا پھر لگ بھگ فرضی اشیا کا مجموعہ۔ الغرض جو کچھ بھی ہے کسی شئے میں بھی تنہا اپنے ہونے کا کوئی جواز موجود نہیں۔ قصہ مختصر کوئی ایسی دنیا موجود ہی نہیں جو اُن اشیا سے الگ ہو یا کی جا سکے جن سے یہ خود تشکیل پاتی ہے۔ البتہ انسانی نسل کا مسئلہ اس سے مختلف ہے وہ اُن اشیا کی طرح اس کا حصہ نہیں ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ چونکہ اشیا بھی ہیں اور ان کے ساتھ جڑے ہوئے واقعات کا وجود بھی اور چونکہ کسی بھی تجربے اور شئے کا خود اپنے اندر اپنے وجود کا جواز نہیں ہوتا تب پھر یہ جواز مجموعی طور پر تمام اشیا کی اکائی یعنی دنیا سے لازمی طور پر باہر ہی ہوسکتا ہے اور وہ جواز ناگزیر طور پر بذات خود کوئی ایسا وجود ہے جو خود اپنا جواز آپ ہے۔ اگر ایسا ہے تب تو ٹھیک ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تب پھر ہمیں مزید بہت آگے تک جانا ہوگا۔ لیکن اگر اسی احساس کی حالت میں آخری اِنتہا تک بھی چلتے جائیں تو کوئی وضاحت نہ کر پائیں گے اسی لیے وجود کی وضاحت کی خاطر میں کہتا ہوں کہ ہمیں

ناگزیر طور پر ایسے وجود کی طرف رجوع کرنا ہوگا جو خود اپنے وجود کا اپنا ہی جواز رکھتا ہو اور جو موجود تو ہے لیکن وجود نہیں رکھتا۔

رسل: آپ کے بیان میں بہت سے نقاط اُٹھائے گئے ہیں لہٰذا یہ طے کرنا آسان نہیں کہ کہاں سے آغاز کیا جائے۔ بہتر یہی ہوگا کہ ناگزیر وجود کے سوال سے شروعات کی جائیں۔ لفظ ناگزیر کا اطلاق خاص طور پر ایسے دعوؤں پر مبنی بیانات پر ہوتا ہے جو نوعیت کے اعتبار سے تجزیاتی ہوں اور جن کے اندر تضاد بھی ہوتا کہ اُن کی نفی بھی ہو سکے۔ میں تو صرف ناگزیر وجود کو تب ہی تسلیم کر پاؤں گا جس کا وجود خود کی نفی کرتا ہوتا کہ اُس کی اپنی نفی ہو سکے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہوں گا کہ آیا آپ لائبنز (leibniz) کے دعوؤں کی تقسیم یعنی جواز کی سچائیاں اور حقیقت کی سچائیاں کو تسلیم کرتے ہیں جبکہ جواز کی سچائی ہونا ضروری ہے۔

کوپلیسٹن: میں کسی طرح بھی لائبنز کے جواز کی سچائی اور حقیقت کی سچائیوں جیسے نظریہ سے اتفاق نہیں کر سکتا کیونکہ یہ نقطہ نظر بالآخر تجزیاتی دعوؤں کی طرف لے جاتا ہے۔ لائبنز کے حقیقت کی سچائیوں پر غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ جیسے یہ مختصر ہوتے ہوئے جواز کی سچائیوں میں بدل جائے۔ تب پھر ایسے دعوے وجود میں آئیں گے جن کا تجزیہ ہو سکے گا۔ جو کم از کم عقل کل کے لیے نامناسب ہے۔ جس سے میں اتفاق نہیں کر سکتا کیونکہ یہ ایسے تقاضے پورے کرنے میں ناکام رہتا ہے جو آزادی کے تجربے کا خاصا ہیں۔ میں لائبنز کے پورے فلسفے کی حمایت نہیں کرتا۔ میں نے تو اس کی دلیل کو امکان کے حوالے سے ناگزیر وجود کے لیے استعمال کیا تھا تا کہ دلیل کو جواز کے کافی ہونے کے اصول پر استوار کیا جا سکے۔ میں سمجھتا ہوں اس سے نہ صرف کلیے کی صورت میں اختصار کیساتھ ضبط تحریر میں لانا آسان ہو جاتا ہے بلکہ اس سے بنیادی طور پر خدا کے وجود کے بارے میں مابعد الطبعیاتی دلیل کی پوری طرح وضاحت بھی ہو جاتی ہے۔

رسل: لیکن میرے خیال میں ایک ''ضروری دعوے یا بیان'' کو تجزیاتی نوعیت کا ہونا لازم ہے ورنہ اس کا کچھ بھی مطلب نہیں ہو سکتا۔ تجزیاتی دعوے ہمیشہ پیچیدہ ہوتے ہیں اور بعد میں ہی ہوئے ہیں۔ مثلاً نامعقول جانور، جانور ہوتے ہیں۔ یہ ایک تجزیاتی دعویٰ ہے۔ لیکن وہ ایک جانور ہے، کسی طرح بھی تجزیاتی دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام دعوے جن کا تجزیہ ہو سکتا ہے ترتیب پانے کے اعتبار سے بعد ہی میں ہوتے ہیں۔

کوپلیسٹن: اس دعوے کو ہی لیجئے کہ ''اگر کوئی امکانی وجود ہے تب تو کوئی ضروری وجود بھی ہے۔'' میں سمجھتا ہوں کہ یہ قیاس کیا گیا دعویٰ ایک ضروری دعویٰ ہے۔ اگر آپ کے نزدیک ہر ضروری دعویٰ تجزیاتی

نوعیت کا ہوتا ہے تب میں اصطلاحوں کے تنازعہ سے گریز کرتے ہوئے یہ تسلیم کیے لیتا ہوں کہ یہ ایک تجزیاتی دعویٰ ہے۔ اگر چہ میرا خیال ہے کہ یہ محض لفظوں کا ہیر پھیر ہے۔ لیکن دعویٰ اپنی جگہ ایک ضروری دعویٰ ہے جس کی بنیاد صرف اس مفروضے پر ہے کہ کوئی ایسا امکانی وجود ہے جو حقیقت میں موجود ہے۔ جیسے تجربے سے دریافت کرنا پڑتا ہے۔ یہ دعویٰ کہ کوئی امکانی وجود ہے بذاتِ خود یقینی طور پر تجزیاتی نہیں ہے۔ اگر چہ آپ ایک دفعہ جان جائیں کہ کوئی امکانی وجود ہے تب ہی لازمی طور پر آپ کو اس ضرورت کا سامنا کرنا پڑے گا کہ کوئی ناگزیر وجود ضرور ہے۔

رَسل: اس دلیل میں مشکل یہ پیش آ رہی ہے کہ میں اس خیال ہی سے متفق نہیں کہ کوئی ضرور ہے اور اس کو بھی تسلیم نہیں کرتا کہ کسی امکانی وجود کا کوئی خاص مطلب ہوتا ہے۔ اِن جملوں کی میرے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں سوائے اس کے کہ جب یہ منطق کے دائرہ میں آئیں تو میں انہیں رَد کیے دیتا ہوں۔

کوپلیسٹن: اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ ان اصطلاحات کو محض اس لیے رَد کر دیتے ہیں کیونکہ یہ جدید منطق سے مطابقت نہیں رکھتیں؟

رَسل: میرا تو خیال ہے کہ ان کا کچھ بھی مطلب نہیں اور یہ بھی کہ ''ضروری'' بیکار سا لفظ ہے اس کا اطلاق چیزوں پر تو نہیں ہوتا البتہ جب یہ تجزیاتی دعوؤں میں استعمال ہو تو اس کا جواز ہو سکتا ہے۔

کوپلیسٹن: سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جدید منطق سے آپ کی کیا مراد ہے؟ جہاں تک مجھے علم ہے بہت سے مختلف نظام ہیں۔ تمام جدید منطقی لوگ مابعد الطبعیات کو بے معنی قرار دینے پر متفق نہیں ہیں۔ بہر حال ہم دونوں جانتے ہیں کہ ایک بہت ممتاز مفکر ہے جس کو جدید منطق پر عبور حاصل تھا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ مابعد الطبعیات بے معنی نہیں ہوتے۔ اس میں خاص بات یہ تھی کہ وہ خدا کے مسئلے کو بے معنی قرار نہیں دیتا تھا۔ تاہم اگر تمام جدید مفکرین کے نزدیک مابعد الطبعیات بے معنی بھی ہوتیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ درست کہتے ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مابعد الطبعیاتی اصطلاحات بے معنی ہوتی ہیں بلا ثبوت تسلیم کی گئی حقیقت کے مترادف ہے۔ دراصل اس کے پس منظر میں وہ فلسفہ اور لگی بندھی ذہنیت ہے جس کے تحت ''جو کچھ میری سمجھ سے باہر ہے وہ سرے سے وجود ہی نہیں رکھتی یا یہ کہ وہ بے معنی ہوتی ہے'' اصل میں اس قسم کی صورت حال محض جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ میں تو محض اس حقیقت کی نشاندہی کر رہا ہوں کہ جب جدید منطق کا کوئی خاص نظام معنوں کے حوالے سے واحد کسوٹی قرار دے دیا جائے تو پھر یہ لگی بندھی ذہنیت سے بھی کچھ زیادہ مہلک بیماری ثابت ہوتی ہے تب اسی ذہنیت کے تحت فلسفے کے محض ایک حصے

کو ہی پورا فلسفہ قرار دیا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ بہر حال میرا تو صرف یہ کہنا ہے کہ ایک امکانی وجود ایک ایسا وجود ہے جو بذات خود اپنے وجود کا مکمل جواز نہیں ہے۔ یہ بھی طے ہے کہ ہم میں سے کسی کے وجود کی بغیر کسی دوسرے کے حوالے سے جو ہم سے باہر واقع ہو وضاحت نہیں ہو سکتی۔ ہمارے والدین اس کی بہترین مثال ہیں دوسری طرف یہ بھی ہے ایک ''ضروری'' وجود کا مطلب یہ ہے کہ جو لازمی طور پر وجود نہ رکھتا ہو اور موجود بھی ہو۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا وجود تو ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن آپ کو مجھے یہ باور کرانا مشکل ہوگا کہ جو اصطلاح میں استعمال کر رہا ہوں وہ خود آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر اس اصطلاح کو آپ واقعی سمجھنے سے قاصر ہیں تب پھر آپ کس طرح یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایسا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ تو کیا آپ واقعی میری طرف سے استعمال کی گئی اصطلاح کو سمجھنے سے قاصر ہیں؟

رَسل: آپ نے بہت سے ایسے نقاط اُٹھائیں ہیں میں نہیں چاہتا کہ اُن کا تفصیل سے ذکر کروں۔ میں مابعد الطبعیات کو مسترد نہیں کرتا بلکہ میں تو صرف اُن مخصوص اصطلاحات کو بے معنی قرار دیتا ہوں جن کی میری نظر میں توجیہہ ممکن نہیں۔ میری طرف سے ایسا کہنا لگی بندھی ذہنیت کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ آپ جو کہہ رہے تھے وہ ہماری توجہ وجودیت کی طرف مبذول کراتا ہے جس کی رُو سے کوئی ایسی ہستی ہے جس کا جوہر اس کو ملوث کرتا ہے۔ اس حوالے سے میرا خیال ہے کہ فاعل کی صفات تو بیان کی جاتی ہیں لیکن فاعل غائب ہوتا ہے یوں وجود بذات خود نہ تو فعل ہوتا ہے اور نہ فعل کی خبر جبکہ حقیقی وجود کو ثابت کرنے کے لیے صرف اس کی صفات بیان کرنا ناکافی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی منطق کے مطابق یہ سوال بھی کھڑا ہو جاتا کہ خود وجود کیا ہوتا ہے؟

کوپلیسٹن: نہ تو یہ اچھی گرامر ہے نہ یہ جملے کی اچھی ترکیب مثلاً ٹی ایس ایلیٹ موجود ہے تو پھر کوئی یہ ضرور کہہ سکتا ہے کہ ''وہ جو کیتھڈرل میں قتل کا مصنف ہے موجود ہے'' تو پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ''دنیا کو بنانے والا کوئی ہے'' بے معنی بات ہے شاید آپ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کو کوئی بنانے والا نہیں ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ دعویٰ کہ ''دُنیا کا کوئی بانی ہے'' بے معنی بات ہے۔ اسی کو ایک سوال کی صورت میں پیش کرتا ہوں کہ کیا دنیا کا کوئی بانی ہے؟ اکثر و بیشتر لوگوں کو میرے اس سوال کی سمجھ آجائے گی اگرچہ وہ اس کے جواب سے متفق نہ بھی ہوں۔

رَسل: یہ سوال ''کیا بانی ہے اس دنیا کا کوئی موجود'' واقعی ایسا سوال ہے جس کا کوئی مطلب ہے لیکن آپ کا یہ کہنا کہ خدا اس دنیا کا بانی ہے تو آپ خدا کے نام کو اسمِ معرفہ کے طور پر استعمال کر رہے ہوتے

ہیں لیکن جب آپ کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ "خدا موجود ہے یہ ایسا بیان ہے جس کے کوئی معنی نہیں ہوتے کیونکہ یہ تجزیاتی بیان نہیں ہوتا جیسے کہ "یہ" یا "وہ" موجود ہے۔ پہلی نظر میں تو یہی معلوم ہوگا کہ یہ ایک تجزیاتی بیان ہے جیسا کہ گولائی یا مربع کا کوئی وجود ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔

کوپلسٹن: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ واقع ایسا نہیں تب پھر جب تک آپ کو وجود کے تصور سے آگاہی نہیں ہوگی آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ "اس کا وجود نہیں ہے" جہاں تک اس جملے کا تعلق ہے کہ کوئی "گول مربع موجود ہے" اس کا کچھ بھی مطلب نہیں؟

رسل: مجھے آپ سے اتفاق ہے میں اب اسی بات کو دوسرے حوالے سے ایک دوسری صورت حال میں ضروری وجود کا ذکر کروں گا۔

کوپلسٹن: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم ایک طرح سے بند گلی میں آپہنچے ہیں۔ میرے نزدیک ضروری وجود ایک ایسا وجود ہے جو لازمی طور پر موجود ہے جبکہ اس کا وجود ہو ہی نہیں سکتا اور نہ وہ وجود رکھتا ہے میرے لیے تو یہ بہت بامعنی بات ہے۔ جبکہ آپ کے نزدیک اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

رسل: میرے خیال میں ہم اس نقطے کو مزید آگے بڑھاتے ہیں کہ ایک ہستی جو لازمی طور پر موجود ہے جبکہ اس کا وجود ہو ہی نہیں سکتا اور نہ ہوتا ہے اس کا یقینی طور پر یہ مطلب لیں گے ایک ہستی موجود ہے جس کا جوہر اس میں ملوث ہے۔

کوپلسٹن: ہاں! ایک ایسی ہستی جس کے جوہر کا ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن میں خدا کے وجود کو اس کے جوہر کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ کیونکہ میرے خیال میں اس کے جوہر کے بارے میں ہمیں ابھی تک بصیرت حاصل نہیں ہو سکی لہٰذا ہمیں اُسے ثابت کرنے کے لیے اسی دنیا کے تجربے سے ہی دلائل فراہم کرنا ہونگے۔

رسل: ہاں میں بھی اس فرق کو سمجھتا ہوں۔ لیکن ایک ایسی ہستی کے بارے میں جسے مکمل علم حاصل ہے یہی کہا جا سکتا ہے کہ جناب یہ ہے وہ "ہستی جس کا جوہر اس کے وجود میں ملوث ہے۔"

کوپلسٹن: ہاں! اگر کسی نے خدا دیکھا ہوتا تو وہی بڑے اعتماد سے کہہ سکتا ہے کہ خدا لازمی طور پر موجود ہے۔

رسل: اس کا مطلب ہے کہ ایک ہستی ہے جس کا جوہر اس میں ملوث ہے۔ اگرچہ ہمیں اس جوہر کا کچھ علم نہیں ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہے کہ ایسی کوئی ہستی ہے۔

کوپلسٹن: ہمارے پاس کوئی ایسی شئے موجود نہیں جس سے ہم اخذ کر سکیں کہ کوئی جوہر موجود ہے۔ البتہ ایسے مشاہدات و تجربات ضرور ہیں جن سے اُس ہستی کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ جوہر اور موجود ایک جیسے ہونے چاہیں۔ کیونکہ اگر خدا کے جوہر اور اُس کے موجود

میں مماثلت نہ ہوگی تب ہمیں اس موجود کے لیے ایسی کافی شہادت تلاش کرنے کی ضرورت ہوگی جو خدا سے ماوراء ہو۔

رَسل: اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے مؤقف کا سارا دارومدار کافی وجہ پر ہے۔ لیکن آپ نے اس کافی وجہ کا اب تک اِس پیرائے میں مطلب بیان نہیں کیا جس سے میں یہ سمجھ سکوں کہ کافی وجہ سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مُراد بنانے والا تو نہیں ہے؟

کوپلیسٹن: یہ ضروری نہیں ہے۔ ہاں البتہ بانی ہونا ایک طرح سے کافی وجہ کی ایک قسم ہے۔ صرف امکانی وجود کا ہی کوئی جواز ہوسکتا ہے۔ خدا خود ہی اپنے آپ میں کافی وجہ ہے۔ وہ خود اپنا جواز نہیں ہے جہاں تک کافی وجہ کا تعلق ہے اس کے مکمل معنوں سے میرا مطلب ایک ایسی حسب ضرورت وضاحت ہے جو کسی خاص وجود کو ثابت کرے۔

رَسل: لیکن ایک وضاحت حسب ضرورت کب مکمل ہوتی ہے؟ فرض کریں میں ایک دیا سلائی جلاتا ہوں اور ایک شعلہ پیدا ہوتا ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی حسب ضرورت وضاحت یہ ہے کہ میں نے ماچس پر دیا سلائی کو رگڑا۔

کوپلیسٹن: عملی طور پر تو یہ درست ہے لیکن نظریاتی اعتبار سے یہ جزوی وضاحت ہے۔ حسب ضرورت وضاحت وہ ہوتی ہے جو لازمی طور پر مکمل احاطہ کرے اور جس میں مزید اضافہ نہ ہوسکے۔

رَسل: تب پھر آپ کسی ایسی شئے کی تلاش میں ہیں جس کا حصول ناممکن ہے اور کسی کو ایسی توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ حاصل ہو۔

کوپلیسٹن: یہ کہنا کہ کوئی شئے حاصل نہیں ہوئی ایک الگ بات ہے اور یہ کہنا کہ اُسے سرے سے ہی تلاش نہ کیا جائے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ لگی بندھی ذہنیت ہو۔

رَسل: مجھے نہیں معلوم۔ میرا مطلب ہے کہ ایک چیز کی وضاحت کا انحصار دوسری چیز پر ہوتا ہے جبکہ دوسری کا تیسری پر انحصار ہوتا ہے اس لامتناہی سلسلے کو ہر طرح سے سمجھا جائے اور پھر اس سے اپنے مطلوبہ معنی اخذ کریں ایسا ہم نہیں کر سکتے۔

کوپلیسٹن: کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ نہ تو ہم ایسا سوال اُٹھا سکتے ہیں اور نہ اُٹھانا چاہیے جو اس ساری افسوسناک سکیم کے بارے میں ہے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ اس پوری کائنات کے بارے میں؟

رَسل: ہاں! میرا نہیں خیال کہ اس کا کچھ بھی مطلب ہے۔ میرا خیال ہے لفظ کائنات کئی لحاظ سے کارآمد ہے۔ لیکن اس کا کچھ مطلب نہیں۔

کوپلیسٹن: اگر یہ لفظ بے معنی ہے تو پھر یہ کسی لحاظ سے کارآمد نہیں ہوسکتا۔ تاہم میں یہ نہیں کہتا کہ کائنات ایسی

اشیاء سے مختلف ہے جن سے یہ خود عبارت ہے (میں پہلے ہی ثبوت کے طور پر اپنا مختصر بیان دے چکا ہوں) میں تو صرف وجہ کی تلاش میں ہوں تا کہ اس کیس میں یہ معلوم کر سکوں کہ اِن اشیا کو کس نے بنایا۔ چاہے وہ حقیقت میں ہوں یا تصوراتی اکائی جن کے مجموعے سے یہ کائنات تشکیل پاتی ہے۔آپ کا کہنا ہے کہ یہ کائنات یا میں خود یا کوئی اور وجود نا مناسب ہیں۔

رَسل: جیسے کہ آپ کا کہنا ہے کہ اگر ایک لفظ بے معنی ہے تو پھر یہ کارآمد بھی نہیں ہو سکتا۔ سننے میں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ بالکل درست ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ غلط ہے مثال کے طور پر ''یہ'' یا ''تب'' کسی بھی ایسی شئے کی طرف اشارہ نہیں کرتے جو موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ الفاظ بہت کارآمد ہیں۔اس بات کا اطلاق کائنات پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن میں اس نقطے کو یہیں پر ختم کرتا ہوں۔آپ نے پوچھا ہے کہ آیا میں اس کائنات کو نامعقول قرار دیتا ہوں تو میں کہتا ہوں کہ یہ نامعقول نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اپنی کوئی وضاحت نہیں ہے معقول ہونا میرے نزدیک ایک الگ چیز ہے۔ معقول وہ ہوتی ہے جس کا تعلق خود اپنے اندر کی خصوصیت سے ہو نہ کہ کسی اور کے تعلق سے۔

کوپلیسٹن: قطع نظر خدا کے میرا خیال ہے کہ ہم اس دنیا کو اندرونی طور پر نا قابل فہم جانتے ہیں۔ میں واقعات کے لامتناہی تسلسل پر یقین نہیں رکھتا۔ بلکہ اُنکو ایک ہی سطح پر دیکھتا ہوں۔ لہٰذا اگر کسی ایک انتہا کو ثابت کر دیا جائے تو یہ موجودہ صورت حال سے قدرے تھوڑا سا متعلق ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر آپ چاکلیٹ کو کسی بھی انتہا تک جمع کریں تو وہ چاکلیٹ ہی رہیں گے بھیڑ بکریاں نہیں آپ چاکلیٹ لامتناہی مقدار میں جمع کرتے جائیں تو آپ کو یقینی طور پر اُسی مقدار میں چاکلیٹ ہی ملیں گے۔اسی طرح اگر آپ امکانی وجود جمع کرتے چلے جائیں تو آخر میں آپ کو امکانی وجود ہی ملیں گے نہ کہ حقیقی وجود۔ میرے انداز فکر کے مطابق لامتناہی امکانی وجود کسی طرح بھی ایک امکانی وجود کا باعث نہیں ہو سکتے۔ تاہم آپ کا کہنا ہے کہ میرا خیال ہے کہ یہ سوال اُٹھانا ہی درست نہیں جو کسی خاص شئے کے وجود کی وضاحت کرے۔

رَسل: اگر آپ کا مطلب وضاحت کے لیے اس کا سبب تلاش کرنا ہے تو یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔

کوپلیسٹن: تو پھر ایک ہی مخصوص شئے کا سبب کیوں تلاش کیا جائے؟ اور کیوں نہ تمام مخصوص اشیاء کے جواز تلاش کیے جائیں؟

رَسل: میرا خیال ہے کہ اور کوئی چیز ہے ہی نہیں جس کا جواز تلاش کریں کیونکہ جواز کا پورا تصور مخصوص اشیاء کے مشاہدے سے پُھوٹتا ہے۔ مجھے تو کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی جس سے یہ فرض کر لیا جائے کہ پوری کائنات کا جواز تلاش کیا جائے۔

کوپلیسٹن : یہ کہنا کہ کوئی جواز ہوتا ہی نہیں ایک الگ بات جبکہ ہمیں کوئی جواز تلاش ہی نہیں کرنا چاہیے بالکل مختلف بات ہے۔ یہ بیان کہ کوئی جوز موجود نہیں صرف اُس وقت ہی درست ہوتا ہے جب تحقیق مکمل ہو جائے لیکن شروع ہی میں ایسا کہنا غلط ہے۔ معاملہ جو بھی ہو البتہ اگر پوری کائنات کا بطور ایک مکمل اکائی کے کوئی جواز نہیں تب میرے خیال میں لازم ہے یہ خود اپنے آپ میں جواز ہے جو کہ ناممکن ہے اور یہ بیان کہ دنیا وہاں جوں کی توں موجود ہے تو اس کے جواب میں پہلے ہی سے فرض کرلیا جاتا ہے کہ سوال کے واقعی کوئی معنی ہیں۔

رَسل: اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ یہ خود اپنا جواز ہو میرا تو صرف یہ کہنا ہے کہ کُل کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔

کوپلیسٹن : تو پھر آپ سارترے سے متفق ہیں جس کے مطابق دنیا ایک عطیہ قدرت ہے؟

رَسل: لفظ عطیہ یہ باور کراتا ہے کہ یہ کوئی الگ سی چیز ہے۔ میرا تو صرف یہ کہنا ہے کہ کائنات تو اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت ہے اور یہی میرا مدعا ہے۔

کوپلیسٹن : میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ کُل یا دیگر اشیاء کو جواز کے بغیر وجود میں آتے ہوئے کیسے دیکھتے ہیں۔ آخر اشیاء کیونکر موجود ہیں آخر کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کچھ بھی موجود نہیں ہے جس سے کچھ وجود میں آئے؟ یہ حقیقت ہے کہ ہم عملی طور پر مشاہدے کی بنیاد پر اسباب تلاش کرتے ہوئے علم حاصل کرتے ہیں اور مخصوص اسباب سے پتہ چلتا ہے کہ اُن اسباب کا بھی پتہ چلایا جائے جو تسلسل کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر لفظ جواز بے معنی ہے اور یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ کانٹ کا مادے سے متعلق نظریہ درست ہے تو یہ سوال کرنا ہی ناجائز ہوگا کہ میں اس سے متفق ہوں لیکن بظاہر آپ لفظ وجہ کو بے معنی نہیں مانتے اور نہ ہی آپ کو کانٹ کے خیالات سے متفق پاتا ہوں۔

رَسل: میں آپ کی خام خیالی یا فکری مغالطے کی اچھی طرح سے تصویر کشی کر سکتا ہوں۔ مثال کے طور پر ہر شخص کی ایک ماں ہوتی ہے لیکن آپ کے استدلال کے مطابق دنیا کے تمام اشخاص کی ایک ہی ماں ہے۔ لیکن اس میں ایسا نہیں ہے یہ ایک الگ دائرہ فکر ہے۔

کوپلیسٹن : میں اس میں کوئی مطابقت نہیں پاتا۔ اگر میں کہوں کہ ہر شئے کا وجود مظاہر قدرت سے ہے اور سارے تسلسل کا وجود اسی سے ہے تو پھر تو مطابقت ہوگی۔ لیکن میں ایسا نہیں کہتا۔ میرا کہنا تو یہ ہے کہ ہر شئے کی ایک مظاہراتی وجہ ہے اگر آپ تسلسل کے لامتناہی تصور پر ڈٹے رہیں تو مظاہراتی وجوہ کا ہر تصور ناکافی ہے اس لیے مظاہرات قدرت اس تسلسل کا باعث نہیں بلکہ اِن کا سبب

انسانی عقل وفہم سے بالا ہے۔

رسل: یہ صرف ایک مفروضہ ہے کہ دنیا اور اس کے موجودات کے پیچھے ایک وجہ ہے۔ مجھے اس مفروضہ کے پیچھے کوئی دلیل نظر نہیں آتی اور اگر آپ کے پاس کوئی ہے تو میں ضرور سنوں گا۔

کوپلیسٹن: واقعات کے تسلسل کی کوئی وجہ ہے یا نہیں اور اگر ان کی وجہ ہے تو وہ تسلسل سے باہر ہے اور اگر وجہ نہیں ہے تو پھر اپنے تئیں مکمل ہے میں اسے لازمی قرار دیتا ہوں کوئی شئے مکمل نہیں ہوتی کیونکہ ہر شئے مشروط ہے اور ہم اس پر متفق ہو چکے ہیں کہ کُل کی حقیقت اس کے اجزا کے بغیر کچھ نہیں بلکہ ایسی حقیقت کو تو پایا ہی نہیں جا سکتا۔ لہٰذا لازم ہے کہ اس کی کوئی وجہ ہو۔ میں یہاں یہ کہنا چاہوں گا کہ دنیا تو موجود ہے لیکن یہ ناقابل تشریح ہے تاہم کسی بھی استدلالی تجزیہ کو رَد نہیں کرتا۔

رسل: اگر آپ مجھے مغرور نہ سمجھیں تو میرا خیال ہے کہ میں اُن چیزوں کو سمجھ سکتا ہوں جن کو آپ کے خیال میں ایک عام انسان سمجھنے سے قاصر ہے۔ جہاں تک بغیر وجہ ہونے کی بات ہے تو ماہرین طبعیات ایٹم کے اندر کوانٹم Quantum تغیرات کو بلاوجہ قرار دیتے ہیں۔

کوپلیسٹن: میں اسے صرف ایک عارضی نتیجہ سمجھتا ہوں۔

رسل: اگر ایک عام انسان نہیں سمجھ سکتا تاہم ایک ماہر طبعیات کا ذہن تو ضرور اسے سمجھ سکتا ہے۔

کوپلیسٹن: میں اس سے متفق ہوں کہ بعض سائنسدان چند حدود کے اندر کئی امُور کے غیر متعین ہونے کو مانتے ہیں مگر زیادہ تر اس کے قائل ہیں۔ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈِنگل کا کہنا ہے کہ ہیزن برگ کا نظریہ غیر یقینیت صرف مشاہدات کے باہمی تعلق کو مربوط کرتا ہے۔ جبکہ اس کی نوعیت کے متعلق خاموش ہے۔ بہت سے سائنسدان بھی اس سے متفق ہوں گے تاہم میرے خیال میں ہر سائنسدان اسے قبول کرتا ہوا نظر آتا ہے حالانکہ نظریاتی طور پر کوئی بھی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ میرے خیال میں نظم اور ادراک کے بغیر سائنس کو نہیں جانا جا سکتا بظاہر ایک ماہر طبعیات واقعات کے ظہور کی وجہ کے لیے بہت سے مفروضے پہلے ہی سے قائم کر لیتا ہے جیسے کوئی سراغ رساں قتل کے محرکات جاننے کے لیے آغاز ہی سے کچھ مفروضوں پر کام جاننے شروع کرتا ہے۔ ایک مابعدالطبعیات کا ماہر بھی کسی مظہر کا جواز تلاش کرنے سے پہلے فرض کر لیتا ہے کہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہو گی۔ چونکہ میں کانٹ کا پیروکار نہیں ہوں اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح مابعدالطبعیات کا ماہر کوئی مفروضہ قائم کرنے میں حق بجانب ہے۔ اسی طرح فزکس کا ماہر بھی ایسا کرنے میں حق بجانب ہوگا۔ مثال کے طور پر جب سارتر نے اس دنیا کو مفت کا عطیہ قرار دیا تو اس نے اسے عطیہ قرار دینے سے پہلے شاید سوچا ہی نہ ہوگا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

رَسل: آپ معاملے کو غیر ضروری طور پر طول دے رہے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے ایک فزکس کا ماہر جب اسباب تلاش کر رہا ہوتا ہے اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اسباب ہر جگہ ادھر اُدھر پڑے ہوئے ہیں اور وہ چن لیتا ہے مثال کے طور پر اگر کوئی شخص سونے کی تلاش میں ایک بہت بڑے علاقے کو چھان مارتا ہے اگر تو اُسے سونا مل جائے تو بہت اچھا اور نہیں ملتا تو بدقسمتی۔ اسی طرح جب فزکس کا ماہر اسباب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر بھی مذکورہ قسمت کا ہی معاملہ ہی ہوتا ہے۔ جہاں تک سارتر کا تعلق ہے مجھے نہیں معلوم کہ اس کا کیا مطلب تھا اور نہ ہی مجھ سے یہ توقع ہونی چاہیے کہ میں اُس کی تشریح کروں۔ تاہم میرا یہ خیال ضرور ہے کہ یہ کہنا کہ دنیا کی کوئی وضاحت ہے غلط ہے مجھے تو کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایسی کوئی توقع بھی کی جائے۔ جہاں تک آپ سائنسدانوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ پہلے ہی سے مفروضے قائم کیے ہوتے ہیں یہ مبالغہ آرائی ہے۔

کوپلیسٹن: مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سائنسدان کوئی نہ کوئی مفروضہ پہلے ہی قائم کر دچکا ہوتا ہے جب وہ کسی سچائی کو دریافت کرنے کے لیے تجربہ کر رہا ہوتا ہے تو اس تجربے کے پیچھے یہ مفروضہ ہوتا ہے کہ یہ کائنات ایسی نہیں ہے جس کا تسلسل نہ ہو۔ اس کا امکان ہوتا ہے کہ وہ اِس تجربے سے کہ وہ سچائی دریافت بھی کر لے۔ وہ تجربہ ناخوشگوار بھی ہوسکتا ہے یا اس سے کوئی بھی نتیجہ نہ نکلے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو نتیجہ وہ چاہتا ہے وہ نہ نکلے تاہم اس کا بھی امکان ہے کہ جو اس نے سوچ رکھا ہو وہی نتیجہ نکلے۔ لیکن مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ایسا ہی فرض کرنا چاہیے کہ یہ کائنات باقاعدہ منظم بھی ہے اور قابل وضاحت بھی۔

رَسل: میرے خیال میں آپ ضرورت سے زیادہ ہی غیر معین پیرائے میں بات کر رہے ہیں بلاشبہ سائنسدان فرض کر لیتے ہیں کہ اس کا امکان ہے کہ فلاں فلاں شئے دریافت ہو جائے اور اکثر دریافت ہو بھی جاتی ہے۔ لیکن وہ یہ فرض نہیں کرتا کہ وہ ضرور دریافت ہو گی اور یہی وہ نقطہ ہے جو آج کی جدید فزکس میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

کوپلیسٹن: میرا خیال ہے کہ وہ ضرور فرض کر لیتا ہے یا عملی طور خاموشی سے اُسے فرض کرنا پڑتا ہے جیسے کہ پروفیسر ہیلڈ ڈین کا کہنا ہے کہ ''جب میں کیتلی چولہے پر رکھ کر آگ جلاتا ہوں تو پانی کے کچھ ذرات بھاپ بن کر اُڑ جائیں گے لیکن ایسا کوئی طریقہ موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کون سے ذرات اُڑ جائیں گے'' لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ''چانس'' کے عنصر کو داخل کر دیا جائے سوائے اپنے علم کی مناسبت سے۔

رَسل: ایسا نہیں ہوتا بلکہ ہر سائنسدان کا کہنا ہے کہ اُس کا کام اُن تمام چیزوں اور واقعات کا کھوج لگانا ہوتا ہے جو پُوری دُنیا میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ شروعات میں اُس کو ایسا عمومی سلسلہ اسباب ہاتھ آتا ہے جن کا اپنا کوئی جواز نہیں ہوتا اور وہ قطعی طور پر فرض نہیں کرتا کہ ہر شئے کا کوئی جواز ہوتا ہے۔

کوپلیسٹن: یہی تو میرا کہنا ہے وہ ایک مخصوص اپنے منتخب کردہ میدان میں پہلا ہی سبب ہے اور اضافیت کے اعتبار سے بھی پہلا ہوتا ہے۔

رَسل: میرا نہیں خیال کہ وہ ایسا کہتا ہو یا کہے۔ اگر کوئی ایسی دنیا موجود ہے جس میں اکثر و بیشتر واقعات (تمام نہیں) کے اسباب ہوتے ہیں تب ہی وہ کوئی مفروضہ قائم کرتے ہوئے ان امکانات کی نقشہ کشی کر پائے گا کہ کسی ایسے واقعہ کے بارے میں امکان ظاہر کر پائے گا (جس میں آپ کی دلچسپی شامل ہے) کہ اُسکا کوئی سبب ہے۔ البتہ وہ یہ فرض نہیں کرے گا کہ ہر چیز کا کوئی سبب ہوتا ہے۔

کوپلیسٹن: یہ شاید اس لیے ہوتا ہے کہ سائنسدان کو امکان سے زیادہ کے حصول کی اُمید ہی نہیں ہوتی۔ لیکن جب وہ سوال اُٹھاتا ہے تو گویا فرض کر لیتا ہے کہ وضاحت کے سوال کے کوئی معنی ہیں۔ رَسل آپ کا مجموعی نقطہ نظر تو یہی ہے کہ دنیا کے جواز کا سوال اُٹھانا ہی ناجائز ہے؟

رَسل: ہاں! میرا یہی مؤقف ہے۔

کوپلیسٹن: اگر ایسا ہی ہے کہ آپ کے نزدیک مذکورہ سوال ہی بے معنی ہے تو اس پر مزید گفتگو بہت مشکل ہو گی۔

رَسل: آپ نے بالکل دُرست فرمایا کہ آگے بڑھنا محال ہے۔ تو کیا خیال ہے کسی دوسرے مسئلے پر ہی کیوں نہ گفتگو کی جائے۔

مذہبی تجربہ

کوپلیسٹن: میں مذہبی تجربے کے بارے میں چند ایک الفاظ ہی کہوں گا۔ اِس کے بعد ہم اخلاقی تجربے کی طرف رُخ کریں گے۔ میں مذہبی تجربے کو خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے زیادہ زور نہیں دیتا۔ یوں ہماری گفتگو کی خصوصیت تبدیل ہو کر رہ جائے گی تاہم میرا خیال ہے کہ اس طریقے سے خدا کے وجود کی بہترین وضاحت ہو جاتی ہے۔ مذہبی تجربے سے میری مُراد یہ نہیں ہوتی کہ محض اچھا محسوس کیا جائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی پیار کرنے والا محسوس ہوتا ہے لیکن غیر واضح

سا ہوتا ہے جو اس تجربے سے گزر رہا ہوتا ہے اُسے ایسی شئے سے آگاہی ہوتی ہے جو اس کے فہم و فراست سے ماورا ہو بلکہ انسانی سُوجھ بوجھ سے ہی بالاتر ہوتی ہے۔ لیکن وہ ایک ایسی حقیقت ہوتی ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہوسکتا کم از کم اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ تجربہ جاری رہتا ہے۔ یہ ایسا تجربہ ہوتا ہے جس کی نہ تصویر کشی کی جاسکتی اور نہ ہی احاطہ تصور میں لایا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ خالصتاً تصوراتی ہوتا ہے۔ اس تجربے کی حقیقی اور بنیادی وضاحت صرف اس مفروضے کی بنا پر آسانی سے ہوسکتی ہے کہ اس تجربے کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔

رَسل: یہ پوری دلیل اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ جیسے یہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔ جس میں یہ وہم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ہم سے باہر ہے جو ہم پر مسلط ہو رہا ہے جو سراسر خودفریبی کے مترادف ہے۔ ہم سب لوگ اس صورتِ حال کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک کمرے میں بہت سے لوگوں کا ہجوم ہو۔ اس میں ایک کلاک لگا ہو۔ وہ کلاک سب کو نظر آتا ہے۔ اُس کی ٹِک ٹِک بھی ہو رہی ہو یہ حقیقت سب پر عیاں ہوتی ہے کہ وہ ایک کلاک ہے نہ کہ واہمہ۔ جبکہ مذہبی تجربہ محض نجی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس میں جو شئے موجود نہیں ہوتی وہ نظر آتی ہے ایسا مستقل ہونا ایک بیماری کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔

کوپلیسٹن: میں تو محض عارفانہ تجربے کی بات کر رہا تھا جبکہ میں کسی شخص یا شئے کی تصویر کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ میری مراد ایک ایسے تجربے سے ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جو عقل و فہم سے بالاتر ہوتا ہے۔ مجھے جولین ہکسلے کا ایک لیکچر اچھی طرح یاد ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ عارفانہ تجربہ اتنا ہی حقیقی ہوتا ہے جتنا کہ کسی کی محبت میں مبتلاء ہونا یا شاعری اور کسی فن کی قدر و قیمت پہنچاننا۔ یہ بات تو طے ہے کہ جب ہم محبت کرتے ہیں تو وہ کسی موجود شخص سے ہی ہے یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کوئی نہ ہو۔

رَسل: ایک لمحہ ٹھہر جائیں۔ ایسا ہر کیس میں نہیں ہوتا مثال کے طور پر جاپانی ناول نگاروں نے کبھی نہیں ایسا سوچا کہ اُنہیں کوئی کامیابی حاصل ہوگئی جب تک کہ اُن کی تصانیف کے زیرِ اثر بیشار لوگوں نے کسی تصوراتی ہیروئین کی محبت میں خودکشی نہ کرلی۔

کوپلیسٹن: جاپان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں آپ ہی کی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ میں دو سوانح عُمری کی کتابوں سے بے حد متاثر ہوا مجھے خوشی ہے کہ میں نے خودکشی نہیں کی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُن کتابوں کے اثر اور جو مجھے عارفانہ تجربہ ہوا اُس میں کوئی مماثلت نہ تھی۔ یہی وہ نکتہ ہے جس سے میرے خیال میں کوئی بیرونی شخص ایسے تجربے کے خیال کو دیکھتا ہے۔

رَسل: یوں ہم خدا کو انسانوں کے کرداروں کی سطح تک لے آتے ہیں۔ کیا آپ کو اس کا اعتراف نہیں کہ یہاں کس قدر امتیاز ہے؟

کوپلیسٹن: میں یقیناً فرق کرتا ہوں۔ لیکن میں دوبارہ زور دے کر کہتا ہوں کہ اس کی بہترین وضاحت خالصتاً تصوراتی کیفیات سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ بھی درُست ہے کہ تصوراتی وضاحت ممکن ہو سکتی ہے لیکن یہ اُن لوگوں کے ذریعے ممکن ہے جن کی زندگی اور تجربے میں کوئی تعلق نہ ہو اور جو واہموں میں مبتلاء ہوں لیکن اگر آپ خالص حالت سمجھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ سینٹ فرانسس کی بات مان لیں۔ اُنکا کہنا ہے کہ جب آپ کسی ایسے تجربے سے گزرتے ہیں جس کے نتیجے میں زوردار، فعال اور تخلیقی محبت ظاہر ہو تو حقیقت میں ایک ایسے وجود کا اظہار ہوتا ہے جو خود اس تجربے کی حقیقی وجہ ہوتی ہے۔

رَسل: لگی بندھی ذہنیت کے تحت یہ کہنا نہیں ہوتا کہ خدا نہیں ہے میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ مجھے نہیں معلوم کہ خدا ہے۔ میرے لیے تو صرف وہ باتیں اہم ہوتی ہیں جو ریکارڈ پر آئیں۔ لیکن جب میں ریکارڈ شدہ معاملات کو بھی دیکھتا ہوں تب بھی ایسی فضول باتیں سامنے آتی ہیں جو خود میرے اپنے لیے بھی ناقابل قبول ہوتیں ہیں بلکہ مجھے یقین ہے کہ آپ کو بھی اُن پر قطعی طور پر اعتماد نہ ہو گا۔ مثلاً آسیب، بدرُوح اور شیطان کا ذکر بڑے یقین اور اعتماد کے پیرائے میں رپورٹ ہوتا رہتا ہے۔ اگر کوئی قابلِ اعتماد صوفی بھی یہ کہے کہ شیطان ہوتے ہیں۔ لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ ہوتے ہیں۔

کوپلیسٹن: میں مانتا ہوں کہ ایسے لوگ ملتے ہیں جن کا یہ کہنا ہوتا ہے کہ اُنہوں نے شیطان، بدرُوح یا فرشتے وغیرہ کو دیکھا ہے۔ میں اُن کے ظاہر ہونے کو مسترد کرتا ہوں کیونکہ اُن کی تو اس سے قطع نظر کہ وہ نظر آتے ہیں یا نہیں۔ ویسے ہی وضاحت ہو سکتی ہے۔

رَسل: کیا آپ کے خیال میں ایسے بہت سے لوگ موجود نہیں ہیں۔ جنہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ اُنہوں نے شیطان کو اُنکے دل میں کچھ کہتے ہوئے سُنا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے کہ صوفی خدا کے بارے میں کہا کرتے ہیں میں اب کسی بیرونی مشاہدے کی بات نہیں کر رہا میں صرف ذہنی تجربے اور کیفیت کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجربہ صوفی کے تجربے کی طرح کا ہی ہوتا ہے۔ اس بارے میں جو کچھ صوفی ہمیں بتاتے ہیں آپ اُس سے خدا کے بارے میں کوئی ایسی دلیل اخذ نہیں کر سکتے جو شیطان جیسی نہ ہو۔

کوپلیسٹن: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے شیطان کا تصور کیا ہوتا ہے اور

یوں انہوں نے اُس کو سُنا یا دیکھا ہوتا ہے۔ یہاں میں یہ نہیں چاہوں گا کے شیطان کے وجود سے انکار کروں۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ لوگوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اُنہوں نے خدا کا تجربہ کر لیا ہے۔ میں ایک غیر مسیحی پلوٹینس کی مثال دیتا ہوں۔ اُسے اعتراف ہے کہ یہ تجربہ اس قسم کا ہوتا ہے جس کا اظہار ممکن نہیں ہو پاتا۔ چونکہ محبت اس کا مرکز ہوتی ہے اس لیے اس سے خوف یا مایوسی نہیں ہوتی۔ اس تجربے کا اثر پلوٹینس کی پوری زندگی پر محیط رہا جو کہ اس کے ریکارڈ سے ظاہر ہے۔ اگر ہم پورفائری کی باتوں کو جو اس نے پلوٹینس کی رحمدلی اور فیض کے بارے میں کہی ہیں اُن کے پیش نظر یہ فرض کر لینا مناسب ہوگا کہ اُس کو یہ تجربہ ہوا ہے۔

رَسل: کسی عقیدے کا کسی شخص پر اچھے اثرات مرتب کرنا یہ ہرگز ثابت نہیں کرتا کہ وہ عقیدہ دُرست بھی ہے۔

کوپلیسٹن: لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اُس عقیدے نے ہی ایک شخص کی زندگی پر اچھے اثرات مرتب کیے ہیں تب پھر میں اس کے سچ ہونے کو کسی نہ کسی حد تک فرض ضرور کروں گا۔ کم اَز کم اُس کے مثبت حصے کے بارے میں نہ کہ اُس پورے عقیدے کو تسلیم کروں گا۔ میں زندگی میں کردار کی خصوصیت کو اہمیت دیتا ہوں اسی لیے صوفی کی سچائی اور اس کی صحیح الدماغی کی بناء پر شہادت کو اہم سمجھتا ہوں۔ جبکہ اُس کے عقائد کی سچائی کو بطور ثبوت پیش نہیں کرتا۔

رَسل: اس کے باوجود اس کو شہادت کے طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ میں خود ایسے تجربات سے گذرا ہوں جنہوں نے میری زندگی پر زبردست اثرات مرتب کیے۔ جب وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں تو اس وقت میں سوچتا تھا کہ یہ میرے لیے بہت اچھا ہوتا ہے۔ وہ تجربات گو کہ میرے لیے بہت اہم تھے۔ لیکن اُن میں کسی باہر والی ہستی کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ لیکن اگر میں یہ فرض کر بھی لیتا کہ باہر سے کوئی ہستی ملوث ہے تو بھی یہ اِس بات کی شہادت نہ ہوتی کہ میں سچائی پر ہوں۔

کوپلیسٹن: لیکن میرا خیال ہے کہ آپ جب اچھے اثرات کا بیان کر رہے ہوتے ہیں تو وہ آپ کے سچے ہونے کی دلیل ہوتی ہے۔ برائے مہربانی یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ میں صوفی کے غور و فکر اور اس کی تشریحات کو اپنی گفتگو یا تنقید سے ماوراء نہیں سمجھتا۔

رَسل: یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی نوجوان تاریخ میں ایک بہت بڑی شخصیت کے واقعات و حالات کے مطالعے سے متاثر ہو کر اپنے کردار کو اچھا بنا لیتا ہے۔ حالانکہ وہ بڑی اور تاریخی شخصیت محض فسانہ بھی ہو سکتی ہے اس کی واضح مثال لائی کرگس کی ہے۔ آپ بھی اس کے مطالعے سے بے حد متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ کبھی حقیقت میں ہوا کرتا تھا۔ لیکن وہ حقیقت میں موجود ہی نہ تھا۔ اس سے

یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ ایسی شئے کی محبت میں مبتلاء ہو سکتے ہیں جس کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

کوپلیسٹن: میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ کوئی شخص افسانے میں موجود کسی کردار سے متاثر ہو سکتا ہے۔ میں اس معاملے کو زیر بحث نہیں لانا چاہتا کہ وہ کیا چیز ہوتی ہے جس سے وہ متاثر ہوتا ہے (حالانکہ میں اُس کو اصل قدر کا نام دیتا ہوں) میرا خیال ہے کہ ایک عام شخص اور صوفی کی صورت حال میں بہت فرق ہے۔ کیونکہ جو شخص لائی کرگس سے متاثر ہوتا ہے اُس کو وہ پُرکشش و مرغوب تاثر نہیں ملتا کہ اُس نے ایک حتمی حقیقت کو پالیا۔

رَسل: میرا خیال ہے کہ آپ میری بات کو سمجھے ہی نہیں۔ میں وہ بات فرض نہیں کررہا جس کو آپ سب کو متاثر کرنے والی قرار دیتے ہیں۔ میں تو محض یہ فرض کررہا ہوں کہ ایک نوجوان کسی ایسے شخص کے بارے میں پڑھ رہا ہے جس کو وہ حقیقی سمجھے ہوئے ہے اور اس سے محبت کرنے لگتا ہے اور ایسا بڑی آسانی سے ہوجاتا ہے۔ حالانکہ وہ محض سائے سے محبت ہوتی ہے۔

کوپلیسٹن: ایک طرح سے تو وہ واقعی سائے سے محبت کررہا ہوتا ہے۔ یہ تو دُرست ہے لیکن دوسرے معنوں میں وہ کسی x یا y سے محبت کررہا ہوتا ہے جس کا وجود نہیں ہوتا۔ لیکن وہ تو سایہ بھی تو نہیں ہوتا جس سے وہ محبت کررہا ہوتا ہے۔ وہ دراصل حقیقی قدر کا احساس کررہا ہوتا ہے۔ وہ ایسے خیال کی بطور ٹھوس حقیقت کے پہچان کررہا ہوتا ہے۔ یہی وہ شئے ہوتی ہے جو اس کو محبت پر اُکساتی ہے۔

رَسل: اُنہیں معنوں میں جیسے کہ میں افسانے کے کرداروں کے بارے میں ذکر کر چکا ہوں۔

کوپلیسٹن: ہاں ایک طرح سے وہ سائے سے محبت کررہا ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرے معنوں میں اُسے ایک حتمی قدر کا احساس ہورہا ہوتا ہے۔

اخلاقی دلائل

رَسل: جو کچھ اچھا ہے یا جو بھی مجموعی صورت حال اچھی ہو یا اچھائی کا پورا نظام۔ کیا آپ کے نزدیک خدا ہے؟ مثال کے طور پر ایک نوجوان کسی ایسی شئے سے محبت کرتا ہے جو اچھی ہے تو کیا وہ خدا سے محبت کررہا ہوتا ہے کیا اس سے آپ کا یہی مطلب ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہے تو پھر مزید دلائل کی گنجائش موجود ہے۔

کوپلیسٹن: میرا حقیقت میں یہ مطلب نہیں کہ خدا کا مطلب اچھائی کا پورا نظام ہے۔ نہ ہی میں تصوف کے معنوں میں اچھا کہتا ہوں اور نہ میں تصوف پر یقین رکھنے والا شخص ہوں۔ لیکن میرا یہ ضرور خیال ہے کہ تمام اچھائی خدا کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کی شروعات خدا سے ہی ہوتی ہے۔ اس لیے ایک

طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ جو چیز اچھی ہوتی ہے اور جو اُس سے محبت کرتا ہے دراصل وہ خدا سے محبت کر رہا ہوتا ہے۔ چاہے وہ خدا سے محبت کا اقرار نہ بھی کرے تاہم اس محبت کے تبھی کوئی معنی ہو نگے اگر وہ خدا کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔

رَسل: یہی تو وہ نقطہ ہے جس کو ثابت ہونا ہے۔

کوپلیسٹن: بالکل ایسا ہی ہے۔ لیکن میں تصوراتی دلیل کو بطور ثبوت پیش کرتا ہوں۔ لیکن یہیں ہمیں اختلاف ہے۔

رَسل: دیکھیں مجھے احساس ہے کہ کچھ چیزیں اچھی ہوتی ہیں اور کچھ بُری۔ میں اُن چیزوں سے محبت کرتا ہوں جن کو اچھی جانتا ہوں اور میں اُن چیزوں سے نفرت کرتا ہوں جنہیں میں بُری جانتا ہوں۔ لیکن میں قطعی طور پر یہ نہیں کہتا کہ میں جن چیزوں کو اچھا جانتا ہوں اُن کو اس لیے اچھا جانتا ہوں کیونکہ وہ ازل سے خدا کی طرف سے اچھی ہوتی ہیں۔

کوپلیسٹن: آپ اچھے اور بُرے میں کس طرح تفریق کرتے ہیں یا اچھائی اور بُرائی کو آپ کس طرح جواز بناتے ہیں؟

رَسل: میرے پاس اچھائی اور برائی کا اور تو کوئی جواز نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ میں نیلے اور پیلے میں فرق کر لیتا ہوں۔ تب نیلے اور پیلے میں فرق کر لینے میں میرا کیا جواز ہوتا ہے؟ اور وہ یہ کہ میں فرق کر لیتا ہوں کیونکہ مجھے مختلف دکھائی دیتے ہیں۔

کوپلیسٹن: ہاں یہ تو بہت زبردست جواز ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ آپ دیکھنے کے ذریعے سے نیلے اور پیلے میں فرق کر لیتے ہیں آپ اچھائی اور برائی میں کس ذریعے سے فرق کر لیتے ہیں۔

رَسل: میں اپنے احساست کے ذریعے سے فرق کرتا ہوں۔

کوپلیسٹن: ٹھیک ہے آپ اپنے احساسات سے ہی فرق کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اچھے اور برے میں محض احساسات کا حوالہ ہی ہوتا ہے جو اُن میں فرق کرتا ہے؟

رَسل: تب پھر آپ ہی بتائیں کہ ایک قسم کی شئے نیلی کیوں نظر آتی ہے۔ جبکہ دوسری قسم کی شئے پیلی نظر آتی ہے؟ میں خود اس کا جواب فزکس کے ماہرین کی تحقیقات کی بدولت دے سکتا ہوں۔ البتہ ایک شئے بُری اور دوسری اچھی کیوں ہے اس کا جواب بھی میرے خیال میں اسی طرح کا ہونا چاہیے۔ لیکن ابھی اس پر اتنی تحقیق نہیں ہوئی۔ لہٰذا میں بھی اس کا جواب نہیں دُوں گا۔

کوپلیسٹن: اچھا اب ہم کسی نازی کیمپ کے حاکم کے رویئے پر بات کرتے ہیں۔ آپ اور میرے دونوں کے نزدیک ناپسندیدہ بھی ہے اور بُرائی بھی۔ جبکہ ہٹلر کے نزدیک ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ نہ

صرف پسندیدہ فعل ہے بلکہ اچھائی بھی۔اب میں فرض کیے لیتا ہوں کہ آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہٹلر کے نزدیک یہ اچھائی ہے جبکہ آپ اس کو برائی جانتے ہیں۔

رَسل: میں اس چیز کو اس طرح نہیں لیتا اور نہ ہی مجھے ایسا لینا چاہیے۔میرا مطلب یہ ہے کہ ہم کئی ایک مسائل کی طرح اس میں بھی غلطی کر سکتے ہیں۔اگر آپ کو یرقان ہو جاتا ہے تب تو آپ کو وہ تمام چیزیں زرد نظر آئیں گی جو حقیقت میں زرد نہیں ہوتیں۔تب تو آپ غلطی پر ہی ہوتے ہیں۔

کوپلیسٹن: ہاں کسی ایک سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔لیکن تب آپ بھی یہی غلطی کر رہے ہیں۔اگر معاملہ اتنا ہی سیدھا سا ہوتا جیسے کہ آپ کے احساسات و جذبات کے حوالے ہی سے اچھائی اور برائی کو پرکھا جاتا ہے۔تب تو ہٹلر بھی اپنے جذبات سے اپنے آپ میں سب سے بڑا پرکھ رکھنے والا جج ہوتا۔

رَسل: یہ کہنا بالکل دُرست ہے کہ یہ اُس کے جذبات سے مطابقت رکھتا ہے۔لیکن اس بارے میں آپ بھی بہت سی باتیں کہہ سکتے ہیں۔مثال کے طور پر ایک قسم کی چیز ہٹلر کے جذبات کو ایک اور طرح سے متاثر کرتی ہے۔تب ہٹلر خود میرے جذبات پر کسی اور طرح سے اثر انداز ہوتا ہے۔

کوپلیسٹن: مان لیا۔تب پھر احساسات سے باہر کوئی ایسی مادی کسوٹی موجود نہیں جس کی بنیاد پر نازی افسر پر تنقید کی جائے؟

رَسل: تب تو قصور اُنکا ہے جو رنگوں میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ پھر ہم کیوں دانش وارانہ نقطہ نظر سے کسی ایسے شخص کے ناقد ہوتے ہیں جو رنگوں میں امتیاز نہیں کر سکتا؟ تو کیا محض اُنکو اس لیے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہ وہ اقلیت میں ہیں۔

کوپلیسٹن: میرے نزدیک اُس کی وجہ یہی ہے۔وہ ایک ایسی چیز سے محروم ہیں جو ایک عام انسان کی فطرت کا حصہ ہوتی ہے۔

رَسل: لیکن اگر وہ اکثریت میں ہوتے تب بھی ہمارا یہی نقطہ نظر ہوتا۔

کوپلیسٹن: تب پھر آپ کا یہی کہنا ہے کہ احساسات سے باہر کوئی ایسی کسوٹی موجود نہیں جس کی بنیاد پر نازی کیمپ کے آفیسر اور آرچ آف کنٹربری کے رویوں میں فرق کیا جا سکے۔

رَسل: اصل میں احساس کو بہت محدود معنوں میں لیا گیا ہے۔آپ کسی بھی عمل کے اثرات کو مدنظر رکھیں اور پھر اس کے بعد ہی احساسات کو اُس عمل کے اثرات کے زیرِ اثر پرکھیں مثلاً آپ بھی اس قسم کی دلیل دے سکتے ہیں کہ کچھ ایسے وقوعے ہیں جو آپ کو ناپسند ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں آپ پسند کرتے ہیں۔یوں آپ بڑی اچھی طرح بیان کر سکتے ہیں کہ نازی کیمپ کے آفیسر کے عمل کے اثرات تکلیف دہ اور ناخوشگوار ہیں۔

کوپلیسٹن: وہ واقعی تکلیف دہ تھے۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ کیمپ کے اندر موجود تمام لوگوں کے لیے تکلیف دہ اور ناخوشگوار ہیں۔

رَسل: نہ صرف اُن کے لیے جو کیمپ کے اندر موجود ہیں بلکہ اُن کے لیے بھی جو کیمپ سے باہر ہیں اور وہ بھی جو اُن کے بارے میں تصور کر رہے ہوتے ہیں۔

کوپلیسٹن: ہاں یہ بالکل سچ ہے جو اُس کے بارے میں تصور کرتے ہیں۔ یہی میرا نقطہ ہے جو میں سمجھانا چاہتا ہوں۔ مجھے خود بھی ناپسند ہے۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ آپ اُسے ناپسند کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ آپ کس بنیاد پر اُس کو ناپسند کرتے ہیں جبکہ نازی کیمپ کے آفیسر کے لیے یہ عمل بڑا خوشگوار ہے۔

رَسل: آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کیس میں مجھے اُس سے بہتر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ جیسا کہ میں اسے سے قبل رنگ کے اعتبار سے اندھا ہونے کے تصور کے بارے میں ذکر کر چکا ہوں۔ کچھ ایسے لوگ ضرور موجود ہوتے ہیں جنہیں شئے زرد نظر آتی ہے۔ وہ یقیناً یرقان زدہ ہوتے ہیں۔ جن سے میں اتفاق نہیں کر سکتا۔ میں یہ تو ثابت نہیں کر سکتا کہ چیزیں زرد نہیں ہوتیں اور اس کا کوئی ثبوت بھی موجود نہیں اس کے باوجود لوگ مجھ سے اتفاق کرتے ہیں کہ چیزیں زرد نہیں ہیں۔ اسی طرح لوگوں کی اکثریت مجھ سے اتفاق کرتی ہے کہ نازی آفیسر غلطی پر ہے۔

کوپلیسٹن: کیا کوئی اخلاقی فرض بھی ہوتا ہے؟

رَسل: مجھے اس کا جواب دینے کے لیے بڑی تفصیل میں جانا پڑے گا۔ عمل کے اعتبار سے میرا جواب ہاں ہے۔ لیکن نظریاتی اعتبار سے اخلاقی فرض کے بیان کرنے کے لیے مجھے تھوڑی احتیاط برتنی ہوگی۔

کوپلیسٹن: تب آپ ہمیں بتائیں کہ ''اخلاقی فرض'' کے جذباتی اعتبار سے کوئی لغوی معنی ہیں؟

رَسل: میرا نہیں خیال کہ کوئی مطلب ہوتا ہے کیونکہ ایک لمحہ پہلے ہی میں یہ کہہ چکا ہوں کہ اصل بات اثرات ہی کو مدنظر رکھا جانا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں درست رویہ وہی ہوتا ہے جو اپنی اندرونی قدر کی خصوصیت کے حوالے سے اعلیٰ ترین توازن قائم کرئے اور جس کو آپ دُرست مانتے ہیں اس کے پیشِ نظر آپ کے عمل کے اثرات مخصوص حالات سے مطابقت رکھتے ہوں۔

کوپلیسٹن: میں اب اخلاقی ذمہ داری کو درمیان میں لاتا ہوں کیونکہ میرے خیال میں اسی کے ذریعے خدا کے وجود کا مسئلہ سُلجھ سکتا ہے۔ انسانی نسل میں سے اکثریت اچھائی اور برائی کے درمیان ہمیشہ فرق کرتی رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ میرا خیال ہے ایک بہت بڑی اکثریت کا اخلاقی دائرے

کے اندر اپنا ایک شعور ہے اقدار کے تصورات اور اخلاقی قوانین کا شعور اور ذمہ داری ایسے عناصر ہیں جن کے ذریعے میرے خیال میں انسانی فہم سے بالاتر قدر اور اخلاقی قانون کے مصنف کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ اخلاقی قانون کے مصنف سے میری مُراد وہی ہے جو جیسا چاہے قانون بنائے۔ درحقیقت میرے خیال میں جدید ملحدین جب اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ خدا نہیں ہے تب اُن کو یہ کہنا کہ اس لیے نہ کوئی حتمی قدر ہے اور نہ کوئی حتمی قانون عین منطقی ہوتا ہے۔

رَسل: مجھے لفظ ''حتمیت'' Absolute قطعی طور پر پسند نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ دُنیا میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جسے حتمی کہا جا سکے۔ مثال کے طور پر اخلاقی قوانین ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی نسل کی ترقی کے ادوار میں ایک وقت وہ بھی تھا جب انسانی گوشت کھانا عین اخلاق ہوا کرتا تھا۔

کوپلیسٹن: میرا نہیں خیال کہ کسی خاص صورت حال میں اخلاقی فیصلوں کا آفاقی قدروں سے تقابل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ایسی دلیل کو حتمی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے فرض کر لیں کہ حتمی اخلاقی قدریں بھی ہوتیں ہیں۔ اس مفروضے کے تحت بھی مختلف افراد اور گروپوں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ اُن قدروں کے اندر رہتے ہوئے اپنی اپنی عقل و فہم کے مطابق عمل پیرا ہوں۔

رَسل: ''فرض سمجھ کر کرنا چاہیے'' میرے خیال میں یہ ایک ایسا جُملہ ہے جو ماضی کی بازگشت ہوتا ہے جو والدین یا نرس کے ذریعے بچے کے ذہن میں اُنڈیلا جاتا ہے۔

کوپلیسٹن: میں حیران ہوں کہ آپ نے کیسے ''فرض سمجھ کر کرنا چاہیے'' کے نظریئے کی کس طرح والدین اور نرسوں کو بنیاد بنا کر وضاحت کر لی یہ نظریہ بذاتِ خود ہی فہم میں داخل ہو جاتا ہے نہ کہ کوئی اس کو داخل کرے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی انسانی ضمیر کے تحت اخلاقی نظام موجود ہے تب وہ خدا کے وجود سے قطع نظر نامعقول قسم کا اخلاقی نظام ہی ہو گا۔

رَسل: تب پھر آپ کو دو باتوں میں سے ایک سے اتفاق کرنا پڑے گا۔ یا تو خدا پوری انسانیت میں سے چند ایک لوگوں سے ہی مخاطب ہوتا ہے جس میں اتفاق سے آپ بھی شامل ہیں یا پھر یہ کہ وہ جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لیتا ہے کہ جب وہ وحشیوں کے ضمیر سے محوِ گفتگو ہوتا ہے۔

کوپلسٹن: میں یہ باور نہیں کروا رہا کہ خدا ضمیر کو اخلاقی تصورات کا حکم دیتا ہے انسانی خیالات کی نوعیت کے بارے میں اخلاقی قانون کا یقینی طور پر زیادہ تر انحصار تعلیم اور ماحول پر ہوتا ہے اور ایک شخص کو اپنے سماجی گروپ کے اخلاقی نظریات کی افادیت کو جانچنے کے لیے اپنی عقل استعمال کرنا پڑتی ہے۔ لیکن جانے مانے ہوئے اِخلاقی قوانین پر تنقید کے امکانات تو ہر وقت ہوتے ہیں لیکن اُس سے پہلے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ایک اعلیٰ ترین اخلاقی معیار پہلے ہی سے موجود ہے جو خود اپنی

تعمیل چاہتا ہے (اس سے میری مراد کردار ہے جو فرض کے زُمرے میں آتا ہے اور جسے تسلیم بھی کیا جاتا ہے) میرا خیال ہے کہ اس اعلیٰ ترین اخلاقی نظام کی تسلیم شدہ حیثیت امکان کا ہی ایک حصہ ہے جو خدا کے وجود کی حقیقی بنیاد کے مترادف ہے۔

رَسل: مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ قانون دینے والے یا تو والدین ہوتے ہیں یا پھر اسی قسم کے حاکم ہوتے ہیں۔ اس دھرتی پر بے شمار لوگ موجود ہیں جو قانون بناتے ہیں اور اُن سے متعلق جوابدی بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کا شعور مختلف جگہوں اور مختلف اوقات میں ایک دوسرے سے کیوں مختلف ہوتا ہے۔

کوپلیسٹن: اِن سے تو مخصوص اخلاقی قدروں کو سمجھنے میں اختلافات کی وضاحت ہونے میں مدد ملتی ہے اگر صورت حال اس کے برعکس ہوتی تو ان کی وضاحت ہی نہ ہو سکتی۔ بلکہ جب بدلی ہوئی صورت حال میں جانے مانے ہوئے اصولوں کو اپنے ڈھنگ سے کس طرح کوئی قوم یا فرد اپناتا ہے کی بھر پور وضاحت ہو پاتی ہے۔ لیکن بقول کانٹ اس کی ظاہری شکل وہی رہتی ہے یعنی ''فرض سمجھ کر کرنا چاہیے'' میرا نہیں خیال کہ یہ نرسوں اور والدین کے ذریعے سے ربط میں آسکتا ہے۔ اگر اس کے کسی اور طرح سے معنی دریافت کرنے کی کوشش ہوگی تو پھر یہ اخلاقی طور پر ''فرض سمجھ کر ضرور کرنا چاہیے'' تو نہیں ہوگا بلکہ کچھ اور ہوگا کیونکہ بذات خود ''سمجھ کر ضرور کرنا چاہیے'' بالکل واضح ہے۔

رَسل: ''فرض سمجھ کر ضرور کرنا چاہیے'' کا احساس دراصل کسی تصور شدہ خفگی یا نامنظوری کا اثر ہے ہوسکتا ہے کہ یہ خدا کا اپنا تصور شدہ نامنظوری کا اثر ہو! بہر حال یہ جو بھی ہے کسی کی خفگی کا اثر میرے خیال میں ''فرض سمجھ کر ضرور کرنا چاہیے'' کا یہی مطلب ہے۔

کوپلیسٹن: مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تمام بیرونی رسومات، ممنوعات اور اسی قسم کی دوسری چیزیں جن کی بڑی آسانی سے ماحول اور تعلیم کے ذریعے وضاحت ہوسکتی ہے کا تعلق قانون کے مسئلے سے ہوتا ہے یعنی اس کے جوہر سے ''فرض سمجھ کر ضرور کرنا چاہیے''۔ کا نظریہ کسی شخص کو کسی قبائلی سردار یا کسی اور شخص کے ذریعے نہیں پہنچایا جاسکتا۔ کیونکہ اس کا نہ تو کوئی اظہار ہے اور نہ کوئی طریقہ کار جس کے ذریعے سے یہ پہنچایا جاسکے۔

رَسل: مجھے تو ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟ ہم سب اضطراری حالتوں کی جانتے ہیں ہمیں معلوم ہے جب کسی جانور کسی کو خاص فعل کی بناء پر بار بار سزا دی جاتی ہے تو آخر ایک وقت آتا ہے جب وہ اس فعل سے باز آجاتا ہے۔ جانور خود کو دلیل دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ''اگر

میں نے یہ حرکت کی تو مالک ناراض ہوگا'' اُس کو احساس ہوتا ہے کہ وہ ایسا نہ کرے۔ ہم بھی یہی کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

کوپلیسٹن : مجھے تو کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی جس کی بناء پر یہ فرض کر لیا جائے کہ جانور کو اخلاقی فرض کا شعور ہوتا ہے۔ ہم یقینی طور پر جانور کو کسی اخلاقی نافرمانی کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ لیکن انسان فرض کا شعور رکھتا ہے اور اخلاقی قدریں بھی جانتا ہے۔ مجھے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ میں فرض کر لوں کہ کوئی شخص تمام لوگوں کو اُسی جانور کی طرح اضطراری کیفیت میں مبتلاء کر سکتا ہے اور میں یہ بھی فرض نہیں کر سکتا کہ آپ بھی ایسا کرنا چاہیں گے۔ اگر کوئی ایسا کر بھی سکتا ہو۔ اگر اس قسم کے رویوں کو درست مان لیا جائے تو پھر شہنشاہ نیرو اور سینٹ پال فرانسس آسیسی میں کچھ بھی فرق نہ رہتا۔ جناب لارڈ رسل میں یہ احساس کیے بغیر رہ نہیں سکتا کہ آپ نازی کیمپ کے آفیسر کی کاروائی کو اخلاقی طور پر قابل ملامت سمجھتے ہیں۔ یہ بھی کہ آپ کسی بھی حالت میں ایسے فعل کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ آپ اس کے بارے میں سوچ لیں یا آپ کے پاس ایسا سوچنے کے جواز بھی موجود ہوں کہ جس طرح سے اُن لوگوں سے ناروا سلوک ہو رہا ہے اگر یہ ہوتا رہے تو بالآخر انسانی خوشی کے توازن میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

رسل: میں اس پاگل کتے کی کبھی نقل نہ کرتا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اُسکا اس سوال سے کوئی تعلق نہیں۔

کوپلیسٹن : یقیناً نہیں لیکن اگر آپ اچھائی اور بُرائی کے درمیان افادیت کی بنیاد پر نتائج کو سامنے رکھ کر فرق کر رہے ہوتے تب پھر یہ بھی کہا جا سکتا تھا جیسے کہ کچھ بہتر نازی بھی اس خیال کے حامی ہونگے کہ جو کچھ ہو رہا ہے بہت برا ہو رہا ہے۔ لیکن بالآخر دنیا زیادہ خوشی کی طرف گامزن ہوگی میرا نہیں خیال کہ آپ ایسا کہیں گے۔ تو کیا آپ بھی ایسا ہی کہیں گے؟ میرا خیال ہے کہ آپ یہی کہتے کہ اس قسم کی کاروائی غلط ہے۔ بلکہ یہ ایک بدی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ عمومی خوشی اس سے بڑی نہیں اگر آپ واقعی اُسے بدی قرار دیتے ہیں۔ تب تو میرے خیال میں آپ کے پاس صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں کوئی ایسی کسوٹی ضرور ہے جو احساسات کے دائرے سے باہر ہو۔ میرے نزدیک آپ کی طرف سے ہاں کہنا اس بات کے مترادف ہوگا کہ مجھے ایسی قدر مل گئی ہے جو خدا کے ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

رسل: میرا خیال ہے کہ ہم شدید اُلجھن میں مبتلاء ہو رہے ہیں۔ دراصل یہ عمل کا براہ راست احساس نہیں ہے جس کے ذریعے سے میں کوئی فیصلہ کروں۔ بلکہ یہ ایک ایسا احساس ہے جو بذات خود اثر کی

حیثیت رکھتا ہے۔ میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ حالات چاہے کیسے ہی ہوں۔ اس قسم کا رویہ جس کا ذکر آپ کر رہے تھے کسی اچھائی پر منتج ہوسکتا ہے۔ میں تو ایسے حالات کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس میں اس قسم کا رویہ مفید اثرات مرتب کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایسا کرتے ہوئے دُرست کر رہے ہیں۔ تب وہ خود کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں۔ تاہم اگر کچھ ایسے حالات ہوں جن میں قدرے بہتر اثرات ہونے کی توقع ہو تب بھی میں خود کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے ''میں ان چیزوں کو پسند تو نہیں کرتا۔ لیکن میں ان پر خاموشی اختیار کرلوں گا'' اگر چہ یہ قدرے ہچکچاتے ہوئے ہی ہوگا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح میں فوجداری قوانین کے نفاذ پر خاموش رہتا ہوں اگر چہ مجھے سزا سے سخت نفرت ہے۔

کوپلیسٹن: شاید اب وہ لمحہ آ گیا ہے جہاں مجھے اپنی پوزیشن اختصار سے بیان کر دینی چاہیے۔ میں نے دو نقاط اُٹھائے تھے پہلا یہ کہ خدا کے وجود کو فلسفیانہ انداز میں تصوراتی نوعیت کے دلائل کے ذریعے ثابت کیا جا سکتا ہے دوسرا یہ کہ یہ خدا کا وجود ہی ہے جس کے ذریعے سے انسان کے اخلاقی اور مذہبی تجربات کا کچھ مطلب ہوسکتا ہے۔ میرا ذاتی طور پر یہ خیال ہے کہ آپ جس طرح انسان کے خلاقی رویئے کو جانچتے ہیں ایسا رجحان ناگزیر طور پر ایک ایسے تضاد کی طرف رُخ کرتا ہے جس میں ایک طرف تو وہ ضرورت ہوتی ہے جس کا آپ کی تھیوری تقاضا کرتی ہے اور دوسری طرف آپ کا یکا یک فیصلہ دے دینا ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ آپ کا نظریہ اخلاقی فرض کو تو رد کرتا ہے جبکہ کسی وضاحت کو رد کرنے سے بذات خود کوئی دوسری وضاحت نہیں ہو جاتی۔ جہاں تک مابعد الطبعیاتی دلیل کا تعلق ہے۔ ہم دونوں بظاہر اس بات پر متفق ہیں کہ یہ دنیا محض ایسے امکانی وجودوں پر مشتمل ہے۔ جن کے اپنے وجود کا کوئی جواز نہیں۔ مسٹر رَسل آپ کا یہ کہنا ہے کہ سلسلہ واقعات کے لیے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن میرا یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی لازمی وجود نہ ہوتا تب پھر کوئی بھی وجود موجود نہ ہوتا اور نہ ہی کوئی وجود موجود ہوسکتا ہے۔ لہٰذا امکانی وجودوں کا لامتناہی سلسلہ چاہے ثابت بھی ہو جائے تب بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے کچھ نہ کچھ موجود ہے جس سے اس کی توجیہہ ہو پاتی ہے۔ اگر آپ نے یہ بات مان لی ہوتی تب پھر ہم یہ بات بھی زیر بحث لا چکے ہوتے کہ وہ وجود کوئی شخص ہے یا اچھا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن جو نقطہ یہاں مرکز گفتگو رہا ہے یعنی کوئی اس کائنات میں ضروری وجود ہے یا نہیں تو کلاسیکل فلسفیوں کی اکثریت نے اس وجود کے ہونے کے بارے میں مجھ سے اتفاق کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ کا یہ کہنا ہے کہ جو وجود ہیں وہ تو یہاں موجود ہیں لہٰذا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اُنکے وجود

کی وضاحت کے بارے میں سوال اُٹھاؤں۔ لیکن میں یہ نشاندہی ضرور کروں گا کہ آپ کا یہ
موٗقف کسی منطقی تجزیے پر پورا نہیں اُترتا کیونکہ اس سے ایک ایسے فلسفے کا اظہار ہوتا جسے بذات
خود دُرست ثابت ہونے کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم بحث کرتے ہوئے
اب ایک ایسی سطح پر پہنچ چکے ہیں جسے بند گلی کہا جا سکتا کیونکہ ہمارے فلسفیانہ خیالات بالکل ہی
متضاد ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسے میں فلسفے کا ایک جزو مانتا ہوں اُسے آپ کُل قرار
دیتے ہیں۔ میں نے ذرا سخت الفاظ کا استعمال کر دیا ہے۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ آپ انہیں نظر
انداز کر دیں گے۔ مزید براں خود آپ اپنے منطق کو قدیم منطق کے برعکس جدید منطق قرار دیتے
ہوئے بڑی جانبداری سے کام لیتے رہے ہیں۔ یہ بات بہر حال ہے کہ خدا کے وجود کا مسئلہ
وجودیت ہی کا مسئلہ ہے جبکہ منطقی تجزیہ کا کسی طرح بھی اس سے براہ راست تعلق نہیں ہوسکتا۔ اس
سے مجھے ایسا لگتا ہے کہ مسائل کے ایک مجموعے کے حل میں کئی اصطلاحات محض اس لیے بے معنی
ہو کر رہ جاتی ہیں کیونکہ وہ دوسرے مسائل کے ایک مجموعے کے حل میں کار آمد نہیں رہتیں۔ لہٰذا یہ
شروع ہی سے طے کرنا ضروری تھا کہ فلسفے کی نوعیت اور اس کا احاطہ کہاں تک وسیع ہوسکتا ہے جو
خود ایک فلسفیانہ عمل ہے جس کے لیے بذات خود جواز چاہیے ہوتا ہے۔

رَسل: میں اپنی طرف سے چند ایک گزارشات پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ جس طرح بشپ کوپلیسٹن
مابعد الطبعیاتی دلیل دیتے ہوئے امکانی وجود کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور اس کی جس طرح
تعبیر کرتے ہیں مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ لفظ ''امکانی'' ناگزیر طور پر کسی ایسے
امکان کو باور کراتا ہے جیسے آپ حادثاتی طور پر کسی کے موجود ہونے کی بات کر رہے ہوں۔ میرا
نہیں خیال کہ یہ بات دُرست ہے۔ سوائے اس کے کہ جیسے ہم خالصتاً یونہی تسلیم کر لیں۔ آپ
بعض دفعہ یونہی کسی ایک چیز کا حوالہ دیتے ہوئے کسی دوسری ایسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں
جو وہاں ہوتی ہی نہیں اور یہی کوپلیسٹن کے بیان کرنے کا انداز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں
نے ''امکانی وجود'' کی اصطلاح کا بے محابہ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اس کا کچھ بھی مطلب نہیں ہوتا
کیونکہ وہ جس طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہاں کچھ ہے ہی نہیں۔ جہاں تک کوپلیسٹن کے الزام کا
تعلق ہے کہ میں صرف منطق کو مکمل فلسفہ قرار دیتا ہوں سراسر بہتان ہے۔ میں کسی طرح بھی منطق
کو پورا فلسفہ قرار نہیں دیتا البتہ میں منطق کو فلسفے کا ایک لازمی جزو ضرور سمجھتا ہوں جسے فلسفے میں
لازمی طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے اس پر میں اور کوپلیسٹن دونوں متفق ہیں۔ ارسطو کے زمانے میں
منطق ایک بالکل نئی چیز تھی اور جب بھی اس کا استعمال ہوا کرتا تو خاصا بڑا ہنگامہ کھڑا ہوتا۔ خود

ارسطو جب اس کا استعمال کرتا تو بڑی لے دے ہوا کرتی تھی اب چونکہ اس کا استعمال بہت پرانا ہو چکا ہے اور ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں۔لہٰذا اب اس کے استعمال کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس لیے اب اس کے استعمال سے کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں ہوتا۔تاہم جو منطق مجھے پسند ہے مقابلتاً قدرے جدید ہے اس لیے ارسطو کی پیروی میں بھی ہنگامہ برپا کرنے کا باعث بن رہا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں منطق ہی کو مکمل فلسفہ قرار دیتا ہوں۔میرا خیال ہے کہ میں اس سے قبل بھی بیان کر چکا ہوں کہ مطبق فلسفے کا یک نہایت اہم حصہ ہے اور جب مجھے کسی لفظ کے معنی نہیں ملتے تو اس کا صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ میں اپنی طرف سے خود کی پوزیشن واضع کر رہا ہوتا ہوں کہ فلاں فلاں لفظ کی تفصیل کی بنیاد معلوم کرنا ہوتی ہے کہ آیا اس کے کچھ معنی ہیں یا نہیں ہیں۔یہ تو ہے میرا عمومی مؤقف تاہم میرا نہیں خیال کہ مابعد الطبعیات میں استعمال کیے گئے تمام الفاظ فضول ہوتے ہیں اور ایسا میں نے کبھی نہیں کہا۔

تاریخ اور علم بشریات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشُمار حکمران اور مذہبی پیشوا لوگوں کے اخلاق درُست کرنے کے نام پر عام لوگوں پر بے پناہ ظلم ڈھانے کو اپنا آسمانی فریضہ سمجھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ میں کسی اخلاقی فرض کو آسمانی قرار نہیں دے سکتا۔کیونکہ جب کوئی اخلاقی فرض آسمانی تقدس کا درجہ اختیار کر لے جس کے تحت یہ حکم آجائے کہ اپنے باپ ہی کو ذبح کر دو تو یہ میرے لیے نا قابل برداشت ہوتا ہے۔ اس حوالے سے مجھے الٰہیات اور آسمانی احکام فضول چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔

باب ۔ ۱۴

کیا مذہب ہمارے دُکھوں کا مداوا کر سکتا ہے

I

اس وقت انسانیت انتہائی مہلک خطرے اور خوف میں مبتلاء ہو کر ماضی کی طرح خدا کے ہاں پناہ کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ پورے یورپ میں مذہب کا نئے سِرے سے احیاء ہو رہا ہے۔ کمیونسٹوں اور نازیوں نے مسیحیت کو مسترد کرتے ہوئے ایسے اقدامات اُٹھائے ہیں جنہیں ہم افسوسناک قرار دیتے ہیں۔ سوویت حکومت اور ہٹلر کی طرف سے مسیحیت کو دیس نکالا دینے کے پیشِ نظر یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہے کہ اُن کا یہ اقدام ہمارے بین الاقوامی تعلقات میں کسی نہ کسی حد تک ہماری پریشانیوں کا باعث بن رہتے ہیں مزید یہ کہ اگر دُنیا پھر سے مسیحیت کی طرف لوٹ آئے تو ہمارے بین الاقوامی تعلقات درُست سمت میں حل ہونے لگیں گے۔ میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک ایسا فضول واہمہ ہے جو دہشت کی پیداوار ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک خطرناک واہمہ ہے کیونکہ یہ اُن لوگوں کو گُمراہ کرنے کا باعث بن رہا ہے جن کے افکار و خیالات اس قسم کے واہموں کی عدم موجودگی میں شائد معقول حل کے لیے ثمر آور ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہ مسئلہ محض موجودہ حالات و واقعات سے ہی منسلک نہیں بلکہ اس سے زیادہ ایسی وسیع نوعیت کا ہے جو صدیوں سے زیر بحث چلا آ رہا ہے۔ سوال دراصل یہ ہے کہ ہمارے سماج طوطے کی طرح رٹے رٹائے مذہب کی مدد کے بغیر بھی باقی ماندہ اخلاقیات سے رواں دواں رہ سکتے ہیں یا نہیں؟ میرا نہیں خیال کہ اخلاق کا مذہب پر اِتنا زیادہ انحصار ہے جتنا کہ مذہبی لوگ اس کے بارے میں تصور کرتے ہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ جو لوگ مذہب کو سرے سے ہی رد کر دیتے ہیں اُن میں زیادہ اہمیت کی نیکیاں اور خوبیاں پائی جاتی ہیں بہ نسبت اُن لوگوں کے جو رٹے رٹائے مذہب پر جوں کا توں ایمان رکھتے ہیں۔ سچائی اور دانشورانہ ایمانداری تو خاص طور پر اُن میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ دانشوارانہ ایمانداری سے میری مُراد وہ عادت ہے جس میں مناسب اور کافی شہادتیں موجود ہوں تب ہی وہ کوئی فیصلہ دیتے ہیں اور اُن مسائل کو فیصلہ

طلب ہی چھوڑ دیتے ہیں جن میں مناسب شہادتیں دستیاب نہ ہوں کسی بھی قسم کے گھڑے گھڑائے نظام کے ماننے والوں کے نزدیک یہ خوبی اگرچہ بے حد کم اہمیت کی حامل ہوتی ہے لیکن میرے خیال میں یہ ایک ایسی اہم ترین خوبی ہے جو مسیحیت و دیگر منظم نوعیت کے عقائد کے کسی بھی نظام کے مقابلے میں پوری دُنیا کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

آیئے اب ہم کوشش کرتے ہیں کہ اخلاقی اُصولوں کو کس طریقے سے قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر اجمالی نظر سے جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی اُصول دو قسم کے پائے جاتے ہیں ایک تو وہ جن کی جڑیں صرف مذہب سے جڑی ہوتی ہیں اور دوسرے وہ جن کی بظاہر سماجی افادیت ہوتی ہے۔ یونانی قدامت پرست چرچ کے مطابق ایک ہی بچے کے معنوی ماں باپ کی آپس میں شادی حرام ہے۔ چونکہ یہ اُصول صرف مذہبی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر آپ کے خیال میں یہ اُصول اہم ہے تو پھر آپ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مذہب کا زوال قابل ملامت ہے کیونکہ مذہب کے زوال سے اس اُصول کی پامالی کا احتمال ہوگا۔ لیکن اس قسم کا اُصول یہاں زیرِ بحث ہی نہیں۔ بلکہ یہاں وہ اُصول زیرِ غور ہیں جن کا جواز مذہب سے مبّرا ہوتا ہے۔

آیئے چوری کو ایک مثال کے طور پر لیتے ہیں۔ ایک ایسے سماج میں جہاں ہر شخص چوری کرتا ہو۔ ہر شخص تکلیف میں مبتلاء ہوگا ظاہر ہے وہاں لوگوں کی اکثریت یہی چاہے گی کہ وہ کسی ایسی جگہ زندگی گذاریں جہاں چوری کی لعنت اول تو سرے سے موجود ہی نہ ہو اگر ہو تو کبھی کبھار ہی ہو۔ لیکن قانون اخلاق اور مذہب کی عدم موجودگی میں ایسی مشکل آن پڑتی ہے کہ ہر شخص کے لیے آئیڈیل سماج وہی ہوگا جس میں ہر شخص کی یہ خواہش ہوگی کہ وہاں پر رہنے والا ہر شخص تو ایماندار ہو لیکن وہ اکیلا ہی چوری کرتا رہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ایک ایسے ادارے کے قیام کی ضرورت بہر حال ہے جو فرد کے مفاد کو سماج کے مجموعی مفاد سے ہم آہنگ بنا سکے۔ اس معاملے سے نمٹنے کے لیے فوجداری قوانین اور پولیس قدرے کم یا زیادہ حد تک کامیاب رہے ہیں۔ چونکہ پولیس صاحب اقتدار لوگوں کے زیر اثر عام طور پر نرم رویہ رکھتی ہے۔ اس لیے مجرم ہمیشہ ہاتھ نہیں آتے۔ ایسی صورتِ حال میں جب کہ پولیس ناکام ہو چکی ہو تو لوگوں کو یہ ترغیب دی جائے کہ اوپر خدا موجود ہے جو چوروں کو بالاخر کیفرِ کردار تک پہنچائے گا تو اس کا امکان ہے کہ یہ عقیدہ سماج کے اندر ایمانداری میں اضافہ کرنے میں مددگار ثابت ہو۔ ایک ایسی آبادی میں جو پہلے ہی خدا پر ایمان رکھتی ہو بڑی آسانی سے متفق ہوجائیگی کہ خدا نے چوری منع کر رکھی ہے۔ اس حوالے سے مذہب کی افادیت کو نابوتھ کے انگوروں کی باڑ کے قصے (جس میں بادشاہ خود چور ہونے کیساتھ اَرضی انصاف سے بالاتر ہوتا ہے) میں بڑے واضع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ ماضی میں نیم مہذب سماجوں کے اندر اس قسم کی تجاویز بہتر رویوں کا باعث ہوتی رہیں ہیں لیکن آج کے دور میں اس قسم کی سچائیوں اور اخلاقیات کو مذہب سے جوڑنا ایسی اُلجھن میں ڈال سکتا ہے کہ وہ اچھائی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ جوں جوں تہذیب ترقی کرتی چلی جاتی ہے دُنیاوی پابندیاں اور بندھن زیادہ مؤثر اور اہم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جبکہ الٰہیاتی پابندیوں میں دراڑیں آنے لگتی ہیں۔ لوگ عقل و فہم اور دلیل کی طرف زیادہ راغب ہونے لگتے ہیں اور یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اگر وہ چوری کرتے ہیں تو ضرور پکڑیں جائیں گے لیکن اس طرف اُن کی توجہ بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے کہ آخر کار خدا کی طرف سے بھی اُن پر عذاب نازل ہوگا۔ آج تو یہ حال ہو گیا ہے کہ بڑے بڑے نامور مذہبی لوگ بھی یہ توقع نہیں رکھتے کہ چوری کی بناء پر جہنم میں دھکیلا جا سکتا ہے۔ اُن کا اکثر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ کسی مناسب وقت پر توبہ سے استفادہ کر لیں گے اور یہ بھی کہ جہنم نہ تو اتنا یقینی ہے اور نہ ہی اتنا گرم جتنا کہ ماضی میں گرم ہوا کرتا تھا۔ مہذب معاشروں میں لوگوں کی اکثریت چوری نہیں کرتی اور میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ سزا کا امکان ہوتا ہے۔ یہ حقیقت اس بات سے بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ کسی سونے کی کان کنی کے کیمپ میں سونے کے ڈھیر لگے ہوں یا کوئی ایسا سماج ہو جہاں لاقانونیت کا دور دورہ ہو اور افراتفری کا عالم ہو وہاں ہر شخص چوری میں ملوث ہو جاتا ہے۔

لیکن شائد آپ یہ کہیں گے کہ اگرچہ اب چوری پر مذہبی پابندی بہت ضروری نہیں رہی کیونکہ ہم میں سے ہر ایک کی یہی خواہش ہے کہ کوئی شخص چوری نہ کرئے اگر یہ پابندی برقرار بھی رہے تو کوئی نقصان بھی نہیں تاہم ہوتا یہ ہے کہ جونہی مذہبی خیالات کے بارے میں لوگ شکوک و شبہات کا اظہار کرنے لگتے ہیں تو مذہبی پیشوا دفاع کے لیے بڑے گھناؤنے اور ضرر رساں ذرائع سے لوگوں کیساتھ پیش آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر نیکی کے لیے کسی مذہب کا ہونا ضروری خیال کیا جائے تو ایسی صورتِ حال میں اگر کسی متجسس شخص کو کوئی ایسی وجہ نظر نہ آتی ہو جس کی بناء پر اُسے یقین ہو کہ وہ مذہب سچا ہے تو متعلقہ حکام ایسے متجسس کی روک تھام کے لیے حرکت میں آ جاتے ہیں پچھلی صدیوں کے دوران تو ایسے متجسس شخص کو زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ روس میں اس جرم کی سزا مقابلتاً کم رکھی گئی ہے۔ لیکن مغربی ممالک میں حکام نے سمجھانے بجھانے اور ترغیب کا طریقہ کار اختیار کر رکھا ہے۔ یہاں ان ملکوں میں شاید سکولوں کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے نوجوانوں اور بچوں کے بارے میں بڑی احتیاط برتی جاتی ہے کہ وہ ایسی آراء سُننے ہی نہ پائیں جو حکام کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں۔ مزید یہ کہ جو لوگ اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبوراً سوالات کیے بغیر نہیں رہ سکتے اُنہیں سماجی ناپسندیدگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اگر ممکن ہو سکے تو اُنہیں یہ احساس بھی دلانے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے کہ وہ اخلاقی طور پر قابل مذمت ہیں۔ یوں کوئی بھی اخلاقی نظام جس کی بنیاد کوئی مذہب ہو صاحب

اقتدار لوگوں کے ہاتھوں میں ایک ایسے ہتھیار کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو نوجوانوں کی عقل و دانش کو کُند کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

آج کے دور میں بے شمار لوگوں میں سچائی سے لاتعلقی کے بڑھتے ہوئے رجحان کو دیکھتے ہوئے اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ اسے خطرناک ضرور قرار دے سکتا ہوں۔ مثال کے طور پر مسیحیت کے دفاع کے لیے دلائل دینے لگتے ہیں تو تھامس اکیناس کی طرح کے دلائل دینے کا انداز اختیار نہیں کرتے کہ خدا موجود ہے اور یہ کہ وہ بائبل میں اپنی منشاء کا اظہار کر چکا ہے بلکہ وہ کچھ اس طرح کہیں گے کہ اگر وہ ایسا سوچتے ہیں تب وہ اس پر قدرے عمل کریں گے بصورت دیگر وہ بہتر عمل نہیں کر پائیں گے لہٰذا ہمیں کسی طرح بھی اُن لوگوں کی اس کوشش کو کسی طرح بھی کامیاب نہیں ہونے دینا چاہیے جس سے ہم خود خدا کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قیاس کرنا شروع کر دیں۔ اگر خدانخواستہ کسی لمحے شکوک و شبہات سر اُٹھانے لگیں تو اُنہیں پوری قوت سے دبا دینا چاہیے۔ اگر کوئی چُبھتا ہوا سوال یا اچھوتا خیال شک کا باعث بن رہا ہو تو ہم پر لازم ہے کہ اُس خیال ہی سے احتراز کریں۔ اگر قدامت پسندی کی طرف سے باقاعدہ مقرر کردہ ترجمان آپ سے یہ کہہ دے کہ آپ کی مرحومہ بیوی کی ہمشیرہ سے شادی بدی کے ذمرے میں آتی ہے تو چپ چاپ اس پر ایمان لے آئیں کہ کہیں اخلاقی گراوٹ سرزد نہ جائے۔ اگر وہ آپ سے کہیں کہ برتھ کنٹرول گناہ ہے تو اُن کے ارشاد کو قبول کر لیں چاہے یہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہو کہ برتھ کنٹرول نہ کرنا تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ جونہی ایسا ہونے لگتا ہے کہ کوئی عقیدہ چاہے وہ کیسا ہی ہو اور یہ کہ سچ پر مبنی نہ بھی ہو لیکن کچھ لوگوں کے لیے بعض وجوہات کی بناء پر اہمیت کا حامل ہو تو فوراً برائی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ تجسس اور سوال کرنے کی حوصلہ شکنی جیسی برائی سب سے پہلے نمودار ہوتی ہے جبکہ اور دوسری برائیاں اس کیساتھ شروع ہو جاتی ہیں جبکہ اختیارات کے استعمال کی قوت قدامت پسندی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اگر تاریخ کے حوالے سے موصولہ آراء پر شکوک و شبہات کے سائے پڑ رہے ہوں تو تاریخ کے ریکارڈ کو بھی جھٹلانا اور مسخ کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ پھر جلد بدیر وہ وقت آ جاتا ہے جب روشن خیالی کو جرم قرار دینا لازم ہو جاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی پر ظالمانہ تشدد وسیع پیمانے پر تطہیر اور بیگار کیمپوں کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ میں اُن لوگوں کا احترام تو کر سکتا ہوں جو دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں مذہب سچا ہے اس لیے لازم ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے لیکن جو براہ راست کہتے ہیں کہ مذہب کو ماننا لازم ہے کیونکہ یہ نہایت مفید ہوتا ہے کیونکہ ان سے یہ دریافت کرنا کہ آیا یہ سچا بھی ہے یا نہیں نہ صرف یہ کہ وقت کے ضیاع کے مترادف ہوتا ہے بلکہ اسے میں بے اُصولی تصور کرتا ہوں۔

مسیحی معذرت خواہوں کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ مسیحیت کو کمیونزم سے بالکل مختلف قرار دیتے ہیں اور

اس کی برائیوں کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے مفروضہ رحمتوں اور برکتوں کا ذکر کرتے ہیں جن سے مسیحی اقوام فیضیاب ہو رہی ہیں۔ لیکن اُن کی طرف سے ایسا کہنا سِرے سے ہی غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ کمیونزم کی برائیاں تو وہیں ہیں جو مسیحیت میں مذاہب کے اَدوار میں ہوا کرتی تھیں آگیُو نے کیتھولک ٹربیونل سے معمولی سا اختلاف کیا تھا تب اُس ٹربیونل کے مظالم بھی اسی قسم کے تھے وہ جو روسی دانش ورانہ اور اخلاقی زندگی کو نقصان پہنچایا گیا وہ بھی اسی قسم کا تھا جس طرح وہ ٹربیونل کے افراد پہنچاتے رہے جنہیں جب بھی اقتدار پر قبضہ کرنے کا موقع ملا۔ کمیونسٹ تاریخ کو جُھٹلاتے ہیں اور چرچ بھی تحریک احیائے علوم کے زمانے تک یہی کرتا رہا تھا۔ اگر اب چرچ اتنا بُرا نہیں رہ گیا جتنا کہ سوویت حکومت ہے تو یہ اُن کے اثر ورسوخ ہے جو کونسل آف ٹرینٹ سے لیکر آج تک اس پر حملے ہوتے رہے ہیں۔ قصہ مختصر اب جو کچھ بہتری پائی جاتی ہے وہ سب کی سب اس کے دُشمنوں کی کاوِشوں کی بدولت ہے دُنیا میں بہت سے سوویت حکومت کے معترض موجود ہیں کیونکہ اُنہیں کمیونسٹوں کی معاشی پالیسیاں ناپسند ہیں۔ لیکن یہی وہ نقطہ ہے جس پر کریملین کا ابتدائی مسیحیوں، فرانسسکنز اور قرون وسطیٰ کے اکثریتی کافر قسم کے مسیحیوں سے اِتفاق پایا جاتا ہے۔ کمیونسٹوں کا طریقہ کار محض کافروں تک ہی محدود نہ تھا اس کے بارے میں تھامس مور جو خود ایک قدامت پسند شہید تھے مسیحیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ معاشی پہلو کے اعتبار سے کمیونسٹوں جیسی ہی ہے اور یہی اس کا وہ پہلو ہے جس کی بنیاد پر یہ خیالی سوشلسٹوں کی تعریف کرتی رہی ہے۔ یہ اندازِ فکر بذاتِ خود سوویت حکومت کا ہی نہیں جسے بجا طور پر ایک خطرہ قرار دیا جائے بلکہ درحقیقت خطرہ تو اصل میں وہ ہے کہ جس پیرائے میں اس کو پیش کیا جاتا ہے۔ اِس کو سچائی کیساتھ جوڑ کر وہ تقدس کا مقام دے دیا گیا ہے جس کی خلاف ورزی کرنے والا بدترین سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ ایک کمیونسٹ کا ایک مسیحی کی طرح ہی ایمان ہوتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اُسی کا اندازِ فکر ہی سب سے اعلیٰ وارفع ہوتا ہے مزید یہ کہ صرف وہی نجات کا باعث ہو سکتا ہے اور اسی یقین میں اُس کی نجات ہو سکتی ہے مسیحیت اور کمیونزم میں یہی دو مماثلتیں اِن دونوں کو آپس میں بے جوڑ بناتی ہیں۔ جب دو سائنس دان آپس میں اختلاف پر تبادلہ خیال کرتے ہیں تو وہ اپنے اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ اور کتابوں کے حوالے نہیں دیتے بلکہ مسئلے کے حل کے لیے مزید شہادتوں اور مشاہدوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اُنہیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی غلطی کر سکتا ہے اور اگر اُنہیں اس کے لیے کچھ وقت درکار ہو تو وہ مناسب وقت تک انتظار بھی کر لیتے ہیں لیکن جب دو مذہبی اشخاص آپس میں اختلاف کرتے ہیں تو چونکہ اُنکے درمیان اندھا اعتقاد ہی مشترک ہوتا ہے اور کوئی ایسی کسوٹی بھی موجود نہیں ہوتی جو ایک دوسرے کا نقطہ نظر سمجھنے کے لیے اُن میں سے کسی ایک کو بھی قابلِ قبول ہو۔ لہٰذا نفرت اُبلنا شروع ہو جاتی ہے۔ آخر کار کُھلے یا باطنی انداز میں نوبت ہتھیاروں تک آ سکتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ

مسیحیت اب اتنی خطرناک نہیں رہی جتنی کہ یہ ماضی میں ہوا کرتی تھی کیونکہ اب اس سے متعلق لوگوں میں جوش اور ولولہ بہت کم رہ گیا ہے۔ شائد وہ وقت بھی بہت جلد آنے والا ہے جب کمیونزم میں بھی عقیدے جیسے تقدس میں کمی واقع ہو جائے جو اُسے قابل نفرت بناتا ہے لیکن اگر مغرب میں ایسا ماحول برقرار رہتا ہے جس میں یہ خیال نشوونما پاتا رہے کہ مسیحیت نیکی اور استحکام کے لیے ضروری قرار دی جائے تو اِس کا اِمکان موجود ہے کہ مسیحیت ایک دفعہ پھر اپنی تمام تر قرونِ وسطیٰ کی برائیوں کیساتھ کمیونزم کی طرح ظہور پذیر ہو کر اس طرح سامنے آ جائے کہ زندگی اجیرن ہو جائے اور پھر دُنیا کو تباہی سے کوئی بچا نہ سکے گا۔

II

پہلے مضمون میں میری زیادہ تر توجہ اُن طوطے کی طرح رٹے رٹائے اور لگے بندھے نظریات پر رہی ہے جو اس بنیاد پر پیش نہیں کیے جاتے رہے کہ وہ سچ پر مبنی ہیں بلکہ سماجی بنیاد پر پیش کیے گئے تھے اور اب تک میں جو کچھ بھی کہہ چکا ہوں اس کا مسیحیت کمیونزم، بُدھ اِزم، اِسلام، ہندو اِزم الغرض تمام مذہبی نظاموں پر یکساں اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن اگر محققین اور سائنسدانوں کی طرف سے دُنیا کی فلاح و بہبُود کے لیے کچھ دعویٰ کیے گئے ہوں تو اُنہیں استثنا حاصل ہے تاہم حال ہی میں کچھ خاص قسم کے دلائل مسیحیت کی مفروضہ سپیشل حیثیت کے حق میں منظرِ عام پر آئے ہیں یہ دلائل بڑی فصاحت و بلاغت کیساتھ نہایت عالمانہ انداز میں ''مسیحیت اور تاریخ'' نامی کتاب میں یونیورسٹی آف کیمبرج کے جدید تاریخ کے پروفیسر ہربرٹ بٹر فیلڈ کے تحریر کردہ ہیں۔ میں یہاں اس کو ایک اکثریت کا ترجمان سمجھتے ہوئے اُس کے تصنیف کردہ خیال پر کچھ کہنے کی کوشش کروں گا۔

پروفیسر بٹر فیلڈ چاہتے ہیں کہ اُنہیں کچھ مخصوص متنازعہ فائدے اور کچھ ایسی رعایتیں پہلے ہی سے حاصل ہو جائیں جن سے ثابت ہو کہ وہ بہت ہی کُھلے دِل و دماغ کے مالک ہیں حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ اُسے اعتراف ہے کہ مسیحی چرچ ماضی میں تشدد اور ایذا رسانی پر خاصا انحصار کرتا رہا ہے اور یہ کہ وہ بیرونی دباؤ ہی تھا جس کی وجہ سے اُسے اس قسم کی کاروائیوں کو ترک کرنا پڑا اور یوں ایسی کاروائیاں ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔ اُسے یہ بھی اعتراف ہے کہ مغرب اور رُوس کے بیچ پاور پولیٹکس کا نتیجہ ہے کہ اگر رُوس میں یونانی آرتھوڈوکس چرچ کے پیروکاروں کی حکومت بھی ہوتی تب بھی ایسا ہی ہوتا۔ اُسے یہ بھی اعتراف ہے کہ کچھ ایسی خوبیاں بھی ہیں جو صرف مسیحیت کا ہی طرۂ اِمتیاز ہیں جنہیں آزاد خیال لوگ تو اپنا چکے ہیں لیکن خود مسیحیوں کے رویوں میں ناپید ہو چکی ہیں۔ لیکن ان تمام رعایتوں اور اعترافات کے باوجود اُس کا خیال ہے کہ دُنیا آج جن برائیوں اور دُکھوں میں مبتلاء ہے اُس کا مداوا صرف مسیحیت سے وابستگی سے ہی ہو سکتا ہے مسیحیت سے اُس کی مراد صرف خدا اور لافانیت پر ایمان لانا ہی نہیں بلکہ خدا کی مسیح کی صورت میں تجسیم پر بھی ایمان لانا ہو

گا۔ وہ مسیحیت کیساتھ مخصوص تاریخی واقعات سے تعلق پر بہت زور دیتا ہے یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ واقعات بطور تاریخی ہونے کے صرف اس لیے اُسے قابلِ قبول ہیں کیونکہ ان کا تعلق خود اس کے اپنے مذہب کیساتھ جُڑے ہوئے ہیں۔ ورنہ عام حالات میں وہ شائد اس کے لیے اتنے پسندیدہ نہ ہوتے۔ مثال کے طور پر اگر کنواری مریم کی پیدائش کا واقع اگر کسی ہوشمند شخص کے سامنے مذہبی دائرے سے باہر پیش کیا جاتا تو وہ شائد اسے ماننے سے ہی انکار کر دیتا۔ اس قسم کے بے شمار واقعات دیو مالائی قصوں اور کہانیوں میں موجود ہیں جن کے بارے میں کوئی شخص خواب میں بھی سنجیدگی سے نہیں سوچتا۔ ایک تاریخ دان ہونے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر بٹر فیلڈ کو ایسے معاملات میں قطعی دلچسپی نہیں ہوتی جن کا تعلق مسیحیت کی شروعات سے جُڑے ہوئے سوالات سے ہوتا ہے۔ اُس کے دلائل ہی کُچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ جن کا مطالعہ کرنے سے اُس کی ساری شائستگی اور وسعت خیالی کا بھانڈا پُھوٹ جاتا ہے۔ اگر چہ اس کے بارے میں استعمال کیے گئے یہ الفاظ سخت معلوم ہوتے ہیں لیکن دُرست ضرور ہین آئیں آپ بھی اُس کا ایک پیراگراف بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

''یہ دریافت کرنا کہ آیا کرائسٹ حقیقتاً کنواری سے پیدا ہوا تھا یا جبرائیل کے قائم کردہ حمل سے پیدا ہوا تھا۔ ایسا تھا یا نہیں اس سے قطع نظر یہ کیس بہر حال ایسی بہترین اُمید کی یقین دہانی ضرور کراتا ہے جس کی مدد سے ہم اس دُکھوں بھری دُنیا سے تھوڑی دیر کے لیے فرار حاصل کر پاتے ہیں'' بٹر فیلڈ نے اپنی تصنیف میں اس مسیحی اعتقاد کی سچائی ثابت کرنے لے لیے معمولی سی بھی کوشش نہیں کی۔ اگر کوئی عملی قسم کی دلیل دی بھی ہے تو وہ محض یہ ہے کہ مسیحی فضولیات پر ایمان رکھنا بہت مُفید ہوتا ہے۔ پروفیسر جن نقاط کو بھی زیر بحث لایا ہے وہ قطعی طور پر اُسی صفائی اور درستگی سے بیان نہیں کیے گئے جتنا کہ کوئی بھی قاری خواہشمند ہو سکتا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس نے ان نقاط کو نہایت صفائی اور دُرستگی سے یہاں بیان کیا ہوتا تو وہ شاید پرلے درجے کے نامعقول ہوتے۔ اس نے جو نقاط بیان کیے ہیں ان میں سے اگر غیر ضروری الفاظ کو نکال دیا جائے تو وہ کچھ یوں ہیں:

> ''اگر لوگ اپنے ہمسائیوں سے محبت کرتے ہیں لیکن اگر وہ اپنے میلان کو کافی حد تک ظاہر نہیں کرتے حالانکہ کرائسٹ نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ اُنہیں ایسا ضرور کرنا چاہیے اور اگر ان کا ایمان ہے کہ کرائسٹ بذاتِ خود خدا ہے تو ان سے توقع کی جاتی ہے کہ اس کی تعلیمات پر اس نقطے کے حوالے سے زیادہ توجہ دیں لیکن اگر ان کا یہ ایمان نہ ہو تب وہ اس کی تعلیمات پر اس حوالے سے کم عمل کر پائیں گے اس لیے وہ جو چاہتے ہیں کہ لوگ اپنے ہمسائیوں سے محبت کریں تو وہ یہ

بھی چاہیں گے کہ اُن کو اس بات کی ترغیب دینے کی کوشش کریں کہ وہ ایمان لے
آئیں کہ کرائسٹ خدا ہے۔''

اس قسم کے دلائل دینے کے انداز پر اعتراضات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ جاننا مشکل ہے کہ کہاں سے شروع کیا جائے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ پروفیسر بٹرفیلڈ اور اس کے ہم خیال لوگوں کے نزدیک ہمسائے سے محبت کرنا بڑی اچھی بات ہے لیکن ان کا یہ خیال کرائسٹ کی تعلیمات سے اخذ نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برعکس ان کا پہلے ہی سے یہ خیال رہا ہے کہ بذات خود کرائسٹ کی تعلیمات اس کی شہادت ہیں کہ وہ خود آسمانی حیثیت کا حامل ہے تو پھر یہ واضع ہے کہ ان کے پاس ایسا کوئی اخلاقی ضابطہ ہی نہیں کہ جس پر مذہب کی عمارت قائم ہو سکے بلکہ ان کے پاس مذہب ہے جس پر ضابطہ اخلاق قائم کیا جائے۔ مزید یہ کہ بظاہر ان کا یہ خیال ہے کہ وہ جو غیر مذہبی وجوہات ہیں جو یہ باور کراتی ہیں کہ ہمسائے سے محبت کرنا ایک اچھا فعل ہے کچھ زیادہ پُرکشش ثابت نہیں ہوتیں اسی لیے اُنہوں نے نئے دلائل اس اُمید پر ایجاد کر لیے کہ شائد یہ مؤثر ثابت ہونگے۔ یہ عمومی رویوں کے حوالے سے بہت خطرناک اور ضرر رساں طریقہ کار ہے بہت سے پروٹسٹنٹ لوگوں کا خیال ہے کہ سبت وار (آرام کا دِن) کی رسم توڑتے ہوئے قتل کرنا بہت بڑی بدی ہے تو وہ اس سے یہ نتیجہ اخذ بھی کر سکتے ہیں کہ سبت توڑنا تو بدی ہے لیکن قتل کرنا بدی نہیں۔ لہٰذا ہر مذہبی رویہ یا اخلاق اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس کے کُچھ حصے کا دفاع تو بڑے معقول طریقے سے کیا جا سکتا ہے اور کُچھ ممنوعات کیساتھ توہم پرستی جوڑ دی جاتی ہے اور وہ حصہ جس کا دفاع معقول طریقے سے کیا جا سکتا ہے اس کا دفاع اس پیرائے سے اتنی شدت کیا جائے کہ دوسرا حصہ دُھندلا کر رہ جائے۔ کیونکہ اس کے دفاع کی نامعقولیت آشکارا ہو جائے تو اس کا امکان بڑھ جاتا ہے کہ سارے معاملے کو ہی مسترد کر دیا جائے۔

لیکن کیا مسیحیت کیساتھ اس کے حریفوں اور مخالفین کے مقابلے میں زیادہ بہتر اخلاقیات منسلک ہیں؟ مجھے تو نظر نہیں آتا کہ کوئی بھی تاریخ کا دیانتدار طالب علم اس سے اتفاق کرے، تشدد اور ایذا رسانی کے اعتبار سے مسیحیت کو تمام مذاہب کے مقابلے میں امتیازی اہمیت حاصل ہے۔ اسلامی خُلفاء کی سلطنت کے زمانے میں حکمران مسیحیوں اور یہودیوں کے بارے میں رحمدل واقع ہوئے تھے۔ جبکہ مسیحی ریاستوں کے حکمرانوں کا رویہ یہودیوں اور مسلمانوں کے بارے میں اِس کے برعکس ہوا کرتا تھا۔ مسلم ادوار میں یہودیوں اور مسیحیوں کو اگر وہ خراج ادا کرتے رہتے تو اُنہیں کوئی گزند نہیں پہنچائی جاتی تھی۔ جونہی رومن سلطنت پر مسیحیت کا غلبہ ہوا اُسی لمحے یہودیوں اور عربوں کی نسل کشی کے لیے مہم کا آغاز ہو گیا۔ مذہب کے متعلق صلیبی جنگوں کے تحت مغربی یورپ میں یہودیوں کا قتل عام ہوا۔ یہ مسیحی ہی تھے جنہوں نے ڈرائی فس کو غیر منصفانہ طور پر الزامات کا نشانہ بنایا اور پھر آزاد خیال لوگوں نے ہی اِس کی رہائی کو یقینی بنایا۔ آج کے جدید دور میں

بھی مسیحی اپنے ماضی کے اُن گھناؤنے اِقدامات کا دفاع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جب نہ صرف یہودی نشانہ ہوا کرتے تھے بلکہ سماج کے دوسرے حصوں پر بھی ظلم ڈھائے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں کانگو کے بادشاہ لیوپولڈ کی حکومت کے گھناؤنے جرائم کو بھی چرچ نے بالکل نظرانداز کر دینے کی سرتوڑ کوشش کی یا جب وہ ناکام ہونے لگا تو اس کے کرتوتوں کو قدرے کم کر کے پیش کرتا ہے جو بالآخر روشن خیال لوگوں کے احتجاج اور مظاہروں کی بناء پر اختتام پذیر ہوئے اس سارے پس منظر میں اگر کوئی اس بات کا خواہشمند ہو کہ مسیحیت کے دائرہ اثر کو بڑھاوا دیا جائے تو اُسے سب سے پہلے مسیحیت کی کرتوتوں کو تاریخی طور پر تھوک کے حساب سے نظرانداز کرنا ہوگا یا پھر تمام دستیاب شہادتوں کو جھٹلانا ہوگا۔

معمول کے مطابق تو اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ جنہوں نے ایسے اعمال کا اِرتکاب کیا جن کو ہم افسوسناک قرار دیتے ہیں وہ دراصل سچے مسیحی ہی نہ تھے کیونکہ وہ کرائسٹ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہی نہ تھے۔ اس قسم کی دلیل کو بنیاد بنا کر تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سوویت حکومت سچے مارکسٹوں پر مشتمل نہیں کیونکہ مارکس نے تو یہ تعلیم دی تھی کہ سلواک جرمنوں سے کمتر ہیں لیکن کریملین کے نزدیک یہ اندازِ فکر قابل قبول نہیں۔ ایک اُستاد کے پیروکار اس سے جدا ہوتے ہوئے اس کے اندازِ فکر سے متاثر ہونے کی وجہ سے کسی قدر عزت و احترام محسوس کرتے ہیں۔ اُن لوگوں کو جو چرچ کی بنیاد رکھتے ہیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ہر چرچ اس نقطہ نظر سے اس اَمر کا خاص خیال رکھتا ہے کہ وہ اپنے بانی کے اس اندازِ فکر کے اُن حصوں کی ضرر رسانی کو کم سے کم کر کے پیش کرے جو اس چرچ کی سلامتی کے مقاصد کی نفی کرتے ہوں۔ لیکن آج کے جدید معذرت خواہ جس کو سچ کہہ کر پکارتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسیحیت انتہائی گنے چنے منتخب اعمال پر انحصار کرتی ہے۔ انجیل میں اکثر و بیشتر جو کچھ پایا جاتا ہے اُسے عام طور پر مسیحیت نظرانداز کر دیتی ہے مثال کے طور پر اس میں بھیڑ بکریوں کے بارے میں ایک تمثیلی واقعہ درج ہے اور اس کیساتھ وہ اندازِ فکر بھی کہ بدکار ہمیشہ جہنم کی ابدی آگ میں جُھلستے رہیں گے۔ تو ہوتا یہ ہے کہ پہاڑی پر دیئے گئے واعظ کے کچھ حصوں کو تو یہ منتخب کر لیتی ہے اگرچہ ان کو بھی اکثر عملاً مسترد کر دیتی ہے مثال کے طور پر یہ عدم تشدد کو بھی ترک کر دیتی ہے۔ اس کے نزدیک اس پر عمل پیرا ہونے والے گاندھی کی طرح کے غیر مسیحی ہی ہو سکتے ہیں۔ مسیحیت کیساتھ زبردست قسم کے عظیم آدرش مُنسلک کر دیئے جاتے ہیں اور اس کے بعد ایسا ماحول تخلیق کر دیا جاتا ہے کہ یہ باور ہو کہ جیسے وہ آدرش آسمانوں سے اُترے ہوں۔ لیکن پروفیسر فیلڈ کو لازمی طور پر یاد رکھنا چاہیے کہ کرائسٹ سے قبل یہودی بھی ایسے ہی آدرشوں اور تصورات کا نہ صرف ذکر کرتے رہے ہیں بلکہ وہ انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان سب کا ذکر قدیم عہدناموں میں یعقوب کے بارہ بیٹوں کے حوالے سے ہمیں ملتا ہے اور ہلل کی تعلیمات میں بھی ان کا ذکر موجود ہے اس سلسلے میں محترم ڈاکٹر آر ایچ چارلس جو اس معاملے میں

اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہیں کا کہنا ہے ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑی پر کا واعظ نہ صرف روح کے اعتبار سے ہی بلکہ پورے پیرا گراف حرف بحرف قدیم عہد ناموں اور ہلل کی تعلیمات سے نقل کیے گئے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ سینٹ پال نے اس کتاب کو بطور حوالہ جات کے استعمال کیا'' ڈاکٹر چارلس کا خیال ہے کہ کرائسٹ اس کتاب سے بخوبی واقف تھا۔ جیسے کہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ مسیحیت کیساتھ وابستہ اخلاقیات کی اعلیٰ و ارفع نوعیت اس کے مصنف کی خدائی کا ثبوت فراہم کرتی ہے تو پھر لازم ہے کہ اِن قدیم عہد ناموں کا نامعلوم مُصنف ہی دراصل خدا ہے۔

یہ کہ دنیا بھوک، افلاس اور جہالت سے اَٹی پڑی ہے اس سے تو کسی کو انکار نہیں۔ لیکن پوری انسانی تاریخ میں ایک بھی ایسا شائبہ تک نہیں ملتا جس سے کسی طرح بھی یہ فرض کر لیا جائے کہ مسیحیت کو قبول کر لینے سے مذکورہ بالا خرابیوں سے نجات مل سکتی ہے۔ ہماری مُشکلات اور تکالیف یونانی المیہ ڈرامے کے مصادق اس پہلی جنگ عظیم سے پُھوٹی ہیں جس کے نتیجے میں کمیونزم اور نازی اِزم ظاہر ہوئے ہیں۔ پوری پہلی جنگ عظیم اپنے ماخذ کے اعتبار سے مسیحی نوعیت کی تھی تینوں شہنشاہ کٹر مذہبی تھے اسی طرح برطانوی کابینہ بھی جنگ پر تُلی ہوئی تھی۔ جنگ کی مخالفت جرمنی کی طرف سے ہوئی اور روس سے سوشلسٹوں کی طرف سے آئی جو مسیحیوں کے سخت مخالف تھے۔ فرانس کی طرف سے جاؤرز نے بھی مخالفت میں حصہ لیا لیکن جب وہ قتل ہوا تو کٹر قسم کے مسیحیوں کی خوشی کی اِنتہا نہ رہی۔ جبکہ انگلینڈ میں جان مُورلے نامی ایک ناستک نے بھی اس جنگ کی مخالفت کی کمیونزم کی سب سے خطرناک خصوصیات قرونِ وسطیٰ کے چرچ کی یاد دلاتی ہے۔ وہ خصوصیات ایسے اندازِ فکر اور طریقہ ہائے کار کی یاد دلاتی ہیں۔ اِس قسم کی خصوصیات ایسے اندازِ فکر اور طریقہ ہائے کار پر مُشتمل ہیں جن میں مقدس کتاب کے مندرجات کو جنونی انداز میں قبول کرنا اور اپنے اندازِ فکر کا کبھی بھول کر بھی تنقیدی انداز میں جائزہ لینے کی زحمت نہ کرنا اور وحشیانہ انداز میں اُن لوگوں پر تشدد کرنا جو اُن کے انداز فکر کو من وعن ماننے کے لیے تیار نہ ہوں۔ گلوبل پیمانے پر اس قسم کی حکومتوں کے ظہور کا صرف یہ مطلب ہوگا کہ یہ بیماری کی صورت اختیار کر جائے۔ دُنیا کو اس وقت معقولیت، رواداری اور گلوبل فیملی کے افراد کے درمیان باہمی انحصار کے احساس کی ضرورت ہے۔ اس باہمی انحصار میں جدید ایجادات کی بدولت بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے اور اپنے ہمسائیوں کی طرف ہمارا اپنا خالصتاً دُنیاوی رشتہ اتنا مضبوط ہو چکا ہے جس کا ماضی میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ ہیں وہ معاملات جن پر ہمیں حقیقی طور پر غور و فکر کرنا چاہیے اور ہمیں کبھی پیچھے مُڑ کر قدامت پسندی جیسی فضولیات کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ کربِ آگاہی ہمارے دُکھوں کا باعث ہے۔ لیکن محض آگاہی ہمارے دُکھوں کا علاج نہیں کر سکتی بلکہ زیادہ بہتر آگاہی اور پھر اس کا بُہتر ہُنر مندی اور عقلمندی سے استعمال ہی اس دُنیا کو خوشیوں کا گہوارہ بنا سکتی ہے۔

باب ـــ ۱۵

مذہب اور اخلاقیات

بے شمار لوگوں کا کہنا ہے کہ خدا پر یقین کے بغیر نہ تو انسان پارسا ہو سکتا ہے اور نہ ہی خوشی کا حصول اُس کے لیے ممکن ہے جہاں تک پارسائی اور راست بازی کا تعلق ہے اس کے بارے میں صرف اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کچھ کہہ سکتا ہوں۔ جبکہ ذاتی تجربے کی بنیاد پر میں کچھ بھی کہنے سے قاصر ہوں۔ میں اپنے طویل تجربے اور مشاہدے کے باوجود یہ کبھی معلوم نہیں کر سکا کہ آیا ایمان والے مُلحد حضرات سے زندگی میں عام طور پر خوش رہتے ہیں یا ناخوش۔ میں نے عام طور پر یہی پایا ہے اوسطً وہ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ روایتی طور پر کسی بھی بیچارگی یا بے بسی کو بڑی تمکنت کے انداز میں بہت آسانی سے ایمان کی کمزوری سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ چاہے وہ بیچارگی جگر کی کسی خرابی کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس کے لیے کسی توجہ اور تحقیق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جہاں تک اخلاقیات کا تعلق ہے اس کا اِنحصار اس بات پر ہے کہ کوئی شخص اس اِصطلاح سے کیا معنی اخذ کرتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ رحم دِلی اور ذہانت اِنسان کی دو اہم ترین خوبیاں ہیں۔ لیکن عقیدہ چاہے وہ کوئی بھی ہو یا کسی بھی نوعیت کا ہو عقل اور ذہانت کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹ ثابت ہوتا آیا ہے۔ جبکہ گناہ کی سزا کا تصور یا عقیدہ رحم دِلی کے جذبے کے لیے زہر قاتل ہوتا ہے۔ (گو کہ اب سوویت حکومت نے آرتھوڈوکس مسیحیت کو اس عقیدے سے محروم کر رکھا ہے)

روایتی اخلاقیات زندگی میں عملی اعتبار سے ہماری سماجی پسندیدگیوں میں کئی طریقوں سے مداخلت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جن میں جنسی بیماریوں کی روک تھام کی کوششوں میں رکاوٹ ثابت ہونا بھی شامل ہے۔ آبادی پر کنٹرول میں اس کی مداخلت اور بھی زیادہ پیچیدہ ثابت ہو رہی ہے۔ صحت کے معاملے میں ادویات کی بہتری نے اس خطرے کو اتنا خوفناک حد تک مہیب بنا دیا ہے کہ ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں مِلتی۔ اگر قوموں اور نسلوں نے اپنی عادات نہ بدلیں اور اپنی آبادی کی شرح نمو وہی رہنے دی جو آج سے سو سال قبل انگلستان میں ہوا کرتی تھی تو غربت و افلاس، جہالت، بیماریاں اور جنگیں پوری اِنسانیت کا مقدر ہو کر رہ جائیں گی۔ گو کہ ہر طالب علم کو اس حقیقت کا ادراک ہے لیکن مذہبی پیشوا اس کو ماننے کے لیے

تیار نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ عقیدے کے زوال کا انجام سوائے خیر کے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرہ بھر بھی تامل نہیں کہ آج کے جدید دور میں ماضی کے عقائد کے نظام کے مقابلے میں دو نئے انتہائی خوفناک عقائد کے نظام نازی اِزم اور کمیونزم کی صورت میں نمودار ہو چکے ہیں۔ میں بڑے وسوخ سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر قدامت پسندی پر مبنی عقائد کو ہمارے نوجوانوں کے ذہن میں اس بری طرح ٹھونسا نہ گیا ہوتا تو مذکورہ بالا دونوں عقائد اِنسانیت پر اس قدر مضبوط گرفت حاصل نہ کر پاتے خود سٹالن کی فصاحت و بلاغت سے بھرپور بیانات پادریوں کی اُن درسگاہوں کی یاد دلاتے ہیں جن میں اُس نے تربیت پائی۔ دنیا کو کسی عقیدے کی ضرورت نہیں ہاں البتہ اُس سائنسی رویئے کی ضرورت ہے جو علم و تحقیق کیساتھ جڑا ہوا ہو اور ساتھ ہی اس یقین کیساتھ جڑا ہونا چاہیے کہ لاکھوں لوگوں پر تشدد کسی طور پر پسندیدہ فعل نہیں ہو سکتا۔ وہ تشدد سٹالن کی طرف سے ہو یا اُس دیوتا کے نام کی طرف سے جو ایمان والوں کے تصورات میں بسا رہتا ہے۔

باب __ ۱۶

روئداد

(برٹرینڈ رَسل کو نیویارک شہر کے کالج میں تعلیم دینے سے کیسے محروم رکھا گیا)

I

نیویارک شہر کے کالج میں مسٹر موریس رافیل کوہن اور ہیری اَوورسٹریٹ نہ صرف فلسفہ کے شعبے کے ممبر تھے بلکہ کالج کی انتظامیہ کے رُکن بھی تھے۔ چونکہ فلسفے کے دو پروفیسر مدت ملازمت پوری ہونے کی وجہ سے ریٹائرڈ ہو چکے تھے۔ لہٰذا مذکورہ دونوں حضرات نے آپس میں فیصلہ کیا کہ کسی ممتاز فلسفی سے رابطہ کر کے اُن دونوں خالی آسامیوں میں سے ایک آسامی کو پُر کرنے کے لیے راضی کیا جائے۔ چنانچہ متعلقہ شعبے نے سفارش کر دی کہ برٹرینڈ رَسل کو تعلیم دینے کے سلسلے میں دعوت دی جائے جو اُس وقت یونیورسٹی آف کیلیفورنیا میں پہلے ہی سے تعلیم دینے میں مصروف تھے۔ رَسل کی شہرت کے پیش نظر کالج کی فیکلٹی کے قائم مقام صدر، بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کی انتظامی کمیٹی اور آخر میں خود بورڈ نے بھی بڑے جوش و خروش کیساتھ اس سفارش کی منظوری دے دی۔ چونکہ رَسل کی شہرت اور قابلیت کے مالک جیسی شخصیت کالج میں پہلے کبھی موجود نہ رہی تھی اس لیے بورڈ کی 22 رُکنی کمیٹی کے اجلاس میں 19 ارکان نے رَسل کی تعنیاتی کے حق میں ووٹ دیا۔ چنانچہ رَسل کی طرف سے اس دعوت کو منظور کرنے کے بعد بورڈ کے چیئرمین اورڈوے ٹیڈ نے رَسل کو مندرجہ ذیل خط ارسال کیا۔

بخدمت جناب پروفیسر رَسل، ''بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کے 26 فروری 1940ء کے منعقدہ اجلاس میں فیصلے کے مطابق میں آپ جیسی قابل صد احترام شخصیت کو سٹی کالج میں یکم فروری 1941ء سے 30 جون 1941ء تک فلسفے کے پروفیسر کی حیثیت سے تعیناتی کی اطلاع دیتے ہوئے بے حد فخر محسوس کرتا ہوں۔''

''مجھے اچھی طرح علم ہے اس تعیناتی کی آپ کی طرف سے قبولیت جہاں ہمارے کالج کے ڈیپارٹمنٹ کی شان و شوکت میں بے پناہ اضافے کا باعث ہوگا وہیں اِنسانی زندگی کے فلسفے کے حوالے سے ہمارے اپنے کالج کے مفاد میں بے حد وسعت اور گہرائی آنے کا بے حد اِمکان بڑھ جائے گا۔''

دوسری طرف کالج کے قائم مقام صدر مسٹر میڈ Mead نے بھی 24 فروری 1940ء کو اپنی طرف

سے اخبارات کو بیان جاری کر دیا کہ ہمارا کالج ایک واحد خوش قسمت ادارہ ہے کہ جس کو دنیا کے ایک بہت مشہور و معروف فلسفے کے پروفیسر کی خدمات میسر آ گئی ہیں۔

آئندہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے پیش نظر دو باتوں کا ذہن نشین رہنا بے حد ضروری ہے اور وہ یہ کہ برٹرینڈ رَسل کو صرف تین مضامین پڑھانے کی اجازت تھی۔

(i) لوجک کے متعلق جدید نظریات کا مطالعہ اور اس کا سائنس، ریاضی اور فلسفے سے تعلق

(ii) ریاضی کی بنیادوں پر مسائل کا مطالعہ

(iii) دی ریلیشن آف پیور اپلائیڈ سائنسز اینڈ دی ریسی پروکل اِنفلوئنس آف میٹافزکس اینڈ سائنٹفک تھیوریز مزید یہ کہ جب رَسل کی تقرری ہو جائے تو سٹی کالج میں صرف مردوں کو اجازت ہو گی کہ وہ دِن کے سیشن میں لبرل آرٹس کے مضامین کی تعلیم کے دوران شرکت کریں۔

II

رَسل کی تعیناتی کی تشہیر ہونے کے بعد پروٹسٹنٹ اپیسکوپل چرچ کے بشپ مینگ نے نیو یارک کے تمام اخبارات کو کالج انتظامیہ کمیٹی کی جانب سے رَسل کی تعیناتی کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کالج انتظامیہ کی شدید مذمت پر مبنی خط لکھ دیا جو مندرجہ ذیل ہے:

''اُن یونیورسٹیوں اور کالجوں کے بارے میں کیا کہا جائے جو ہماری نوجوان نسل کے سامنے فلسفے کے ایک ایسے اُستاد کو بڑے فخر سے پیش کرتے ہیں جو نہ صرف مذہب اور اِخلاقیات کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف رہتا ہے بلکہ خاص طور پر زنا کی کھلم کھلا حمایت کرتا ہے۔ کیا کوئی ہے جو ہمارے وطن کی فلاح و بہبود پر توجہ دے اور کیا کوئی ہے جو ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں کی حوصلہ افزائی سے ایسی شرمناک تعلیمات کی اشاعت کا نوٹس لے؟''

چند دن کے وقفے کے بعد بشپ نے دوبارہ حملہ کرتے ہوئے اخبارات کو لکھا جو مندرجہ ذیل ہے:

''ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ذہنی اور اِخلاقی طور پر اتنے گر چکے ہیں کہ اُنہیں ایک ایسے شخص کی تعیناتی پر ذرہ بھر پشیمانی محسوس نہیں ہوتی جو اپنی تحریروں میں یہ اعتراف کر چکا ہے کہ اِنسانی خواہشات سے باہر کسی اِخلاقی معیار کا وجود نہیں ہوتا۔''

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر فلسفے کے اُستاد کے لیے یہ لازم ٹھہر جائے کہ اُس کا رویہ ایسا ہو

اساتذہ کو یک قلم ملازمت سے سبکدوش کرنا ہوگا۔
بشپ کا خط گویا ایک ملک گیر پیمانے پر لعن طعن اور ایسی مذمتی مہم کا آغاز تھا جو امریکی تاریخ میں جیفرسن اور تھامس پائین کے زمانے سے لے کر آج تک اتنے وسیع پیمانے پر نہیں چلائی گئی تھی جہاں کلیسا سے وابستہ اخبارات نے اس معاملے کو زور شور سے اُچھالنا شروع کر دیا وہیں تمام جمہوری پارٹیوں کے سیاستدانوں نے بھی اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے زبردست تنقید شروع کر دی دی ٹیبلٹ The Tablet نے رسل کی تعیناتی کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''رَسل کی تعیناتی دراصل نہ صرف نیویارک بلکہ امریکی قوم کے منہ پر طمانچہ ہے'' اس نے اپنے اداریہ میں اس کو ''لادینیت کا پروفیسر'' اور فلسفے کے اعتبار سے ''سیاسی و مذہبی ابتری پھیلانے والا'' اور اِخلاقی اعتبار سے مذہب اور اِخلاقی اصولوں سے رُوگردانی کرنے والا برطانوی قرار دیا۔ مزید براں اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ بھی بے بنیاد الزام لگا دیا کہ ''رَسل کی طرف سے زنا کی وکالت اس کے اپنے دوست کو اتنی بُری لگی کہ اس نے طیش میں آ کر اس کی ٹھکائی کر دی'' ایک ہفتہ وار دی جیسوٹ The Jesuit Weekly America نے رَسل کو ایک خشک قسم کا طلاق شدہ زوال پذیر ایسا شخص قرار دیا جو آزاد جنسی تعلقات کا مبلغ ہو'' جواب کیلیفورنیا کی یونیورسٹی میں اپنے طالب علموں کو اپنے بے اصولی پر مبنی اصولوں کی بنیاد پر جنسی بے راہ روی محبت اور شادی کے بندھن سے آزاد مرد و عورت کے آزادانہ تعلقات کی تعلیم میں مصروف ہے یہ ایک ایسا شخص ہے جس کے ذہن کے اندر ضمیر نام کی کوئی شئے ہی نہیں۔ اس اِخلاق سے عاری پروفیسر کو بجا طور پر انگریز شرفا نے برطانیہ سے نکال باہر کیا تھا'' اُن دِنوں اِن اخبارات و رسائل میں ایڈیٹر کے نام خطوط اس سے بھی زیادہ وحشت و جنون سے بھرے ہوتے تھے اس سلسلے میں دی ٹیبلٹ کے ایک مکتوب میں ایک دھمکی آمیز خط شائع ہوا جس کا متن مندرجہ ذیل ہے:

> ''اگر بورڈ آف ہائر ایجوکیشن نے رَسل کی تعیناتی کا فیصلہ واپس نہ لیا تو پھر اس کے لیے سانپوں سے اٹی دلدل تیار ہے۔ ہمارے اذہان نفرت سے اُبلے جا رہے ہیں۔ اندر ہی اندر آتش فشاں پک رہا ہے۔ اگر رَسل میں ایمانداری کا ذرا سا بھی شائبہ پایا جاتا ہے تو اُسے خود ہی روسو کی طرح اعلان کر دینا چاہیے کہ ''جب میں اپنی لکھی ہوئی کتابوں کو دیکھتا ہوں تو مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے میں ہدایت دینے کے بجائے گُمراہی پھیلاتا رہا ہوں۔ اچھی غذا دینے کی بجائے زہر پلاتا رہا ہوں۔ میں جذبات کے ہاتھوں اندھا ہو گیا تھا۔ میری تمام تر نفیس گفتگو، بحث و مباحثہ اور تقاریر کوئی حقیقت نہیں رکھتیں بلکہ میں خود ایک بد دیانت اور گُمراہ قسم کا شخص واقع ہوا ہوں'' یہ خط

ٹیلی گرام کی شکل میں مئیر لاگارڈیا Leguardia کو بھیجا گیا جس کے ساتھ یہ الفاظ بھی درج تھے، 'جناب عالیٰ، گذارش یہ ہے کہ خدا کے لیے ہماری نوجوان نسل کو اس کے گمراہ کن اور زہر میں بجھے قلم کے اثرات سے بچانے کے لیے اقدامات اُٹھائیں کیونکہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو بلا کا ذہین ہے لیکن اس کی ذہانت کا تمام تر رُخ بدی کی طرف ہوتا ہے وہ درحقیقت شیطان کا پیروکار ہے۔''

اسی اثناء میں بورڈ کے ایک رُکن چالس ایچ ٹیوٹل جو ایک پروٹسٹنٹ اپیس کوپل چرچ کا ایک عام پیروکار تھا نے اعلان کر دیا کہ 18 مارچ کو ہونیوالی بورڈ کی میٹنگ میں رَسل کی تعیناتی کو دوبارہ زیرِ غور لائیں گے اور اس کے ساتھ ہی یہ وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھی کہ جس میٹنگ میں تعیناتی کی منظوری دی گئی اُسے اُس وقت رَسل کے خیالات کے بارے میں کُچھ علم نہ تھا اور اگر اُسے اس وقت کُچھ علم ہوتا تو وہ کبھی بھی اس کے حق میں ووٹ نہ دیتا۔ بلکہ اس کے خلاف ووٹ دیتا۔ جب مذکورہ میٹنگ کے انعقاد میں چند دِن باقی رہ گئے تو جنونیوں نے بورڈ ممبران کو خوفزدہ کرنے کے لیے ہر وہ حربہ استعمال کیا جو ان کے بس میں تھا اور ساتھ ہی رَسل کے 'گناہوں' کی فہرست طویل کرتے چلے گئے تاکہ بورڈ ممبران میٹنگ سے پہلے ہی اچھی طرح دباؤ محسوس کر لیں۔ امریکن یوتھ لیگ کے سربراہ نے ایک بیان میں یہ کہا کہ ''ہم رَسل کے مخلوط طرزِ تعلیم کے تحت سکولوں اور کالجوں میں مشترکہ سونے کے کمروں کے استعمال کے خیال کی حمایت نہیں کر سکتے'' جرنل امریکن (مذہبی نقطۂ نظر کا اخبار) نے بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کی تحقیقات کا مطالبہ کرتے ہوئے الزام لگایا کہ رَسل عورتوں کو قومی ملکیت قرار دینے کی حمایت کرتا ہے۔ شادی کے بندھن سے باہر بچوں کی پیدائش کی حمایت کرتا ہے کہ بچوں کی پیادوں جیسی پرورش ایک ایسی ریاست کی ذمہ داری قرار دیتا ہے جس میں کسی خدا کا تعلق نہ ہو اس کے ساتھ ہی مذکورہ رسالے نے بہت سے ایسے حوالوں کو بھی شائع کیا جو کئی سال پہلے رَسل کی کتاب میں شائع ہو چکے تھے جن سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ رَسل دراصل کمیونسٹ ہے۔ حالانکہ رَسل سوویت کمیونزم کے سخت مخالف ہونے کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور تھے۔ اس کے باوجود جنونی قسم کے لوگ اُن پر کمیونزم کا حمایتی ہونے کا الزام مسلسل لگاتے رہے۔ الغرض اس کے خلاف نفرت کی اس مہم کی بدترین خصوصیت مخالفین کی جانب سے جان بوجھ کر غلط بیانی کا بار بار اعادہ تھا۔

رَسل کو نکال باہر کرنے کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا۔ بلکہ بورڈ کے اُن ارکان کے اخراج کا بھی مطالبہ کیا جا رہا تھا جنہوں نے اس کی تعیناتی کے حق میں ووٹ دیے تھے ہر نئے سورج کے ساتھ اس مطالبے کے حق میں مختلف سماجی، سیاسی اور مذہبی تنظیمیں مذمتی بیان بازی، دھرنے اور احتجاج کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اس تحریک میں حصہ لینے والی قابلِ ذکر تنظیموں کے نام مندرجہ

ذیل ہیں:

(i) Sons of Xavier, The newyork branch of the catholic central, rerein of America.

(ii) The ancient order of Hibeniaons,

(iii) The Knights of Columbus.

(iv) The guild of catholic lawyers.

(v) The saint Joan of Arc Holy name society.

(vi) The metropotitan Baptist Minister's conference.

(vii) The midwest conference of the Society of new England Women.

(viii) The Empire state sons of the American Revolution.

مندرجہ بالا تقریباً تمام تنظیموں کے احتجاجی بیانات روزانہ اخبارات میں رپورٹ ہوتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ امریکا کی ممتاز مذہبی شخصیتوں کی زوردار تقریریں بھی شائع ہونے لگیں تمام تقریریں اور بیانات رَسل کے خلاف دو ہی قسم کے الزامات کے گرد گھومتے تھے۔ پہلا یہ کہ رَسل غیر امریکی ہونے کی وجہ سے یہاں اجنبی ہے اس کا اس سرزمین سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا اسے یہاں کالج میں تعلیم سے قانونی طور پر روک دینا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ اس کے جنس کے بارے میں خیالات اشتعال انگیز اور انتہائی نامناسب ہیں۔ محترم جان شُلز پروفیسر آف سیکرڈ ایلوکیونس نیویارک نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا، ''اس شہر میں نوجوانوں کو یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ جھوٹ جیسی چیز کا دُنیا میں کوئی وجود نہیں چوری، ڈاکہ اور لُوٹ مار کا باقاعدہ جواز موجود ہے اُنہیں اس پیرائے میں تعلیم دی جاتی ہے جیسے شکا گو یونیورسٹی میں کوایب اور لیوپولڈ کو تعلیم دی گئی تھی کہ غیر اِنسانی ظالمانہ جرائم عین اِخلاق کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ تمام الزامات اور بُہتان تراشی رَسل کی تعیناتی کیساتھ بڑی گہرائی کیساتھ جُڑی ہوئی تھی۔ رَسل کو آزاد محبت اور نوجوانوں میں جنسی بے راہ روی اور والدین سے نفرت کا علمبردار کے طور پر پیش کیا جانا روزانہ کا معمول بن گیا تھا۔

اس سارے شور و غوغا کے دوران میئر لاگارڈیا دانستہ طور پر خاموش تماشائی بنا رہا جبکہ دوسرے سیاستدان بھی اس میدان میں کود پڑے۔ اُن سب کا تعلیمی آزادی کا تصور جان الیف ایکس میگوئے ڈپٹی ڈسٹرکٹ اٹارنی آف نیویارک سٹیٹ اور سنز آف ایکساویر کے ذریعے بے نقاب ہوگیا۔ اُس نے نیکس ادا

کرنے والوں کی رقم کو زندگی کے فلسفے کی ایسی تعلیمات پر صرف کرنے پر پُرزور احتجاج کیا کہ جس میں ''خدا کی نفی کی جاتی ہے۔ شائستگی کو بالائے طاق رکھا جاتا ہے اور ہمارے ملک حکومت اور عوام کے مذہب سے متعلق بنیادی کردار کی چولیں ہلائی جارہی ہیں۔''

15 مارچ کو بورڈ کی میٹنگ ہونا طے پاچکی تھی کہ اس سے تین دِن پہلے بورف پریذیڈنٹ آف دی بورنکس جیمز جے لائیاونز نے سٹی کونسل میں ایک تحریک پیش کی جس کے تحت بورڈ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ رَسل کی تعیناتی کو منسوخ کردے۔ چنانچہ وہ تحریک 5 کے مقابلے میں 16 ووٹوں سے منظور کرلی گئی۔ لیکن یہاں یہ بات بھی مستقل ریکارڈ پر رہے گی کہ ریپبلکن پارٹی کے سیاستدان سٹینلے اسحاق نے عام ہجوم کے جذبات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے برٹرینڈ رَسل اور بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کا زبردست دفاع کیا۔ اس لحاظ سے اس کی جرأت اور حوصلہ قابلِ داد ہے تاہم اس کی آواز مخالفین کے مقابلے میں بہت کمزور تھی۔ چنانچہ کوئنز کارپوریشن کے صدر جارج دی ہاروے نے ایک بڑے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کردیا کہ اگر رَسل کو نکال باہر نہ کیا گیا تو وہ 1941ء کے بجٹ میں تمام کالجوں کے لیے منظور کردہ 750000 ڈالر کی رقم کونسل کے ذریعے منسوخ کروادیں گے۔ اس نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا یا تو امریکی طرز پر یہاں خدا کی چھتر چھاؤں ہی میں کالج رہیں گے یا پھر تمام کالجوں کو بند کردیا جائے گا۔ اُسی احتجاجی جلسے میں کئی دوسرے ممتاز مقررین نے اپنے زورِ خطابت میں رَسل کو ''کتا'' قرار دیا۔ ایک کونسل کے رکن چارلس ای کیگن نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''تارکین وطن سے متعلق ہمارا انظام بہتر ہوتا تو اس قسم کا آوارہ شخص ہزاروں میل دور سے یہاں آکر قیام نہ کرسکتا'' نیویارک کونٹی کی رجسٹرار نے چیختے ہوئے کہا کہ ''اب جبکہ وہ یہاں آکر بس ہی گیا ہے تو ہمیں چاہیے کہ اُس کتے کو یہاں سے دھکے دے کر باہر نکال دیں'' اس سے مجھے اچھی طرح پتہ چل گیا ہے کہ اُن مقررین کے نزدیک خدا کی چھتر چھاؤں اور ''امریکی طرز'' سے کیا مراد ہوتی ہے۔

III

اگر جنونی سیاست کے میدان میں طاقتور تھے تو اعلیٰ معیار کی تعلیم اس کی آزادی و خودمختاری کے حامی ملک بھر کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اپنی جگہ بڑی قوت تھے۔ رَسل کے دفاع کے لیے بے شمار کالجوں کے موجودہ اور سابقہ صدور بھی میدان میں اُتر آئے۔ کیلیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر حضرات نے بھی رَسل کی حمایت کا اعلان کردیا جہاں رَسل اب بھی بقول جنونیوں کے ''آزادانہ جنسی تعلقات کی تعلیم دینے میں مصروف تھا ملک بھر کی ایسوسی ایشنوں نے بھی رَسل کی حمایت میں بیان دینے شروع کردیئے۔ امریکا کے مشہورترین عالم فاضل سترہ افراد (جن میں بیکر آف کارنل، کوجوائے آف جان ہاپکنز، کینن، کیمبلے، پیری اور شیلنگر آف ہارورڈ شامل تھے) نے میئر لاگارڈیا کو ایک خط ارسال کیا جس میں دُنیا کے مشہورترین فلسفی کی

تعیناتی کے بارے میں جنونیوں کے حملوں کے خلاف سخت ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے احتجاج کیا اُس خط کے مندرجات درج ذیل ہیں:

''اگر کسی بھی مرحلے پر جنونی اپنی مہم میں کامیاب رہتے ہیں تو کوئی بھی امریکی کالج یا یونیورسٹی تعلیمی آزادی فکر کے حوالے سے تعلیم دُشمنوں سے محفوظ نہ رہ سکے گی۔ رَسل جیسے پایہ کے اِنسان سے تعلیم حاصل کرنا دُنیا بھر میں کہیں بھی طالب علموں کے لیے قابلِ فخر اعزاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ناقدین اس کے خلاف جہالت پر مبنی مہم چلانے کی بجائے علمی میدان میں سائنسی اور دانشورانہ نقطہ نظر سے گفتگو اور تبادلہ خیال کریں۔ اُنہیں کسی طرح بھی رَسل کو تعلیم دینے سے زبردستی روکنے کا حق نہیں پہنچتا یہ مسئلہ اتنا اصولی اور بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ اس پر کسی قسم کا سمجھوتا ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ تعلیمی فکری آزادی، عقل و دانش اور فہم ایسے عناصر ہیں جن پر پوری امریکی قوم کا تعلیمی ڈھانچہ استوار ہے اور امریکی یونیورسٹی کی زندگی کا انحصار ہے۔ وائٹ ہیڈ، ڈیوے، شاپلے اور آئن سٹائن جیسے سکالروں اور سائنسدانوں نے رَسل کیساتھ یکجہتی کا اظہار کیا۔ آئن سٹائن نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''جہالت کے پیغمبر ہمیشہ ہی عظیم روحوں کے آڑے آتے رہے ہیں جُہلا کے دماغ میں یہ بات سما ہی نہیں سکتی کہ آخر ایک عالم موروثی تعصبات کے سامنے کیوں ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیتا ہے اور نہایت جرأت بہادری اور ایمانداری کو اپنی مشعل راہ بناتا ہے۔''

رَسل کی حمایت کسی طرح بھی محض تعلیمی حلقوں تک محدود نہ تھی۔ امریکن سول لبرٹی یونین اور کمیٹی فار کلچرل فریڈم جس کے اُس وقت سڈنی ہُک سربراہ تھے نے نہ صرف رَسل کی تعیناتی کی حمایت کی بلکہ جنہوں نے اُسے تعینات کیا تھا اُن سب کی اتھارٹی کو بھی جائز قرار دیا۔ امریکا کے نمایاں حیثیت رکھنے والے لبرل مذہبی گروپوں نے بھی رَسل کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ بلکہ بعض گروپوں نے یہاں تک ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے بیان دیا کہ بشپ مینگ کو ایپس کوپل چرچ کی نمائندگی کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ اس کے علاوہ امریکا کے سب سے بڑے نو پبلشروں نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں رَسل کی تعیناتی کے خلاف چلائی جانے والی مہم کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم رَسل جیسے اعلیٰ ترین فلسفی اور شاندار تعلیمی ریکارڈ کے حامل شخص سے نیویارک سٹی کے طالب علموں کا اُس کی تعلیم سے استفادہ نہ کر سکنے کو بدقسمتی قرار دیتے ہیں اور بطور پبلشرز ہم جو کتابیں شائع کرتے ہیں ان میں اظہار کیے گئے خیالات سے ہمارا ذاتی طور پر ان سے اتفاق کرنا ضروری نہیں ہوتا لیکن ہم خود ہر وقت اس ٹوہ میں لگے رہتے ہیں کہ

ہمارے شائع شدہ مواد کے لیے دُنیا کے عظیم ترین دماغوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ وحشت اور جہالت دنیا کے بیشتر حصوں میں علم و دانش پر غلبہ پانے کے درپے ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہمیشہ سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ جب بھی موقع میسر آئے دانشمندانہ برتری کا شدت سے احترام کیا جائے'' نیویارک ہیرالڈ ٹریبون اور پبلشرز ویکلی نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ ان دنوں ڈورتھی تھامپسن نے لکھا کہ ''لارڈ رَسل کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اخلاق سے عاری ہو اور کوئی بھی شخص جو اس کو جانتا ہے اُسے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ انتہائی اخلاقی بلندی، اعلیٰ ترین دانش اور ایماندارانہ صفات کا مالک ہے۔''

خود سٹی کالج کے اندر نہ صرف طالب علموں بلکہ فیکلٹی کے تمام پروفیسر حضرات کے درمیان کالج کے امور میں سیاسی اور مذہبی مداخلت کے بارے میں بے پناہ غم و غصہ پایا جاتا تھا۔ کالج کے گریٹ ہال میں پروفیسر رافیل کوہن نے ایک عام اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے رَسل کی صورتِ حال کو سقراط سے ملتی جُلتی قرار دیا اور کہا کہ ''اگر رَسل کی تعیناتی کو منسوخ کیا گیا تو کالج کے نام کو ایسا بدنامی کا داغ لگ جائے گا جیسا کہ سقراط پر نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے الزام میں ایتھنز پر لگا تھا جو آج تک نہیں دُھل سکا۔ یا پھر ٹینیسی Tennessee پر اِرتقا کی تعلیم دینے کے الزام میں لگایا گیا تھا۔ اُسی اجلاس میں پروفیسر ہرمین رانڈال جونیئر جو نامور تاریخ دان اور فلسفی ہی نہیں تھے بلکہ خود مذہبی قسم کے شخص بھی تھے چرچ سے متعلقہ لوگوں کی طرف سے رَسل کی مخالفت کی مذمت کو ''شرمناک دیدہ دلیری اور ڈھٹائی'' سے تعبیر کیا۔ اس کی تین سو رکنی فیکلٹی نے اپنے دستخطوں سے بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کو اس شاندار اور قابل احترام تعیناتی پر خراج تحسین پیش کیا۔ تنگ نظر اور متعصب مخالفین کے بدترین پروپیگنڈے کے باوجود طالب علموں کے والدین ذرا بھر بھی اس بات سے پریشان نہیں ہوئے کہ اُن کے بچے ''آزاد محبت کے ماسٹر مائنڈ'' سے تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے گمراہ ہو جائیں گے۔ اگرچہ رَسل کا ہر مخالف شخص طالب علموں کے ناراض والدین کا ترجمان بن کر رَسل کے خلاف بیان جاری کر رہا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سٹی کالج کے طالب علموں کے والدین کی ایسوسی ایشن نے بورڈ کی کاروائی کے حق میں متفقہ طور پر ووٹ دیئے۔''

IV

جنونیوں کی طرف سے شور و غوغا اور دھمکیوں کیوجہ سے کچھ ممبران کے اپنے اعصاب بھی جواب دے گئے تھے۔ تاہم 18 مارچ کے اجلاس میں اکثریت اپنے مؤقف پر قائم رہی۔ لہٰذا اُس اجلاس میں 72 کے مقابلے میں 11 ووٹوں سے متنازع تعیناتی کی توثیق کر دی۔ اپوزیشن کو چونکہ اپنی شکست کا پہلے ہی سے علم تھا لہٰذا وہ دوسرے محاذوں پر زیادہ سرگرم ہو گئے۔ سٹی کالج سے رَسل کے اخراج میں ناکام رہنے کے بعد

اُنھوں نے یہ کوششیں شروع کر دیں کہ کہیں وہ ہاورڈ میں بھی تعلیم دینا شروع نہ کر دے کیونکہ 1940ء کے سمسٹر کے دوران رَسل کو کُچھ لیکچروں کے لیے دعوت دی جا چکی تھی۔ 24 مارچ کو تھامپس دور گن جو کہ بوسٹن شہر کے لیے قانونی ایجنٹ تھا صدر جے. جی کونانٹ کو لکھا کہ ''جیسے کہ آپ جانتے ہیں کہ رَسل شادی کے بندھن کے بغیر خاندان کی روایت کا پرچار کرتا ہے جس سے اِخلاقی گِرواٹ پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کا خاص خیال رکھیں کہ اس سے امریکا کا ہر شہری اپنے مَن میں ذِلت محسوس کرتا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی ریاست نیو یارک کی قانون ساز اسمبلی نے بورڈ آف ہائر ایجوکیشن سے مطالبہ کیا کہ رَسل کی تعیناتی کو منسوخ کیا جائے۔ مین ہٹن کے ایک ڈیموکریٹ سنیٹر فلپس فلپس نے قانون ساز اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی جس میں یہ کہا گیا کہ ''ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جانوروں کی جنسی اِخلاقیات کا پرچار کرنے والا شخص ٹیکس ادا کرنے والوں کی قیمت پر ہمارے ریاستی تعلیمی نظام میں کسی بھی عہدہ کے لیے غیر موزوں ہوتا ہے'' جہاں تک مجھے علم ہے یہ قرارداد کسی بھی قسم کی مخالفت کے بغیر متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

دراصل یہ قرارداد ایک بہت بڑی کاروائی کا پیش خیمہ تھی۔ بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کے وہ گیارہ ممبران جواب تک ڈٹے ہوئے تھے اُنھوں نے کسی بھی قسم کا سمجھوتا نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اُنھوں نے کسی بھی اتھارٹی کے احکام ماننے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا اُن ''کفار'' کو سبق سکھانا لازم ہو گیا تھا اُنھیں یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ نیو یارک ریاست کی طاقت کن ہاتھوں میں ہے۔ بِشپ میننگ کے بیان میں ظاہر کی گئی رائے کی بنیاد پر اقلیتی لیڈر نے سینٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''رَسل کا فلسفہ مذہب، ریاست اور خاندانی تعلقات کو پراگندہ کرنے کا باعث بن رہا ہے'' اُس نے شکایت کی کہ اب ''نیو یارک سٹی سکول سسٹم پر ملحدین اور مادیت پرستوں کی حکومت ہے'' اُس نے اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ بورڈ کا عام پبلک کی طرف سے مخالفت کے باوجود ''رَسل کی تعیناتی پر اصرار کا رویہ اس پورے قانون ساز ادارے کے لیے باعث تشویش ہے'' اُس نے نیو یارک سٹی کے پورے تعلیمی نظام کی تفصیلی تحقیقات کا مطالبہ کرتے ہوئے یہ بات صاف کر دی کہ ان تحقیقات میں اصولی طور پر اُن سہولتوں کا جائزہ بھی لینا ہوگا جو ریاست کی طرف سے بورڈ کو حاصل ہو رہی ہیں۔ بالآخر اُس کی جانب سے پیش کی گئی قرارداد معمولی ترامیم کے بعد منظور کر لی گئی۔

یہ سارا معاملہ ابھی تک زبانی تو تکار تک ہی محدود رہا تھا۔ لیکن اب عملی طور پر ٹھوس بنیادوں پر خود نیو یارک میں کوشیش شروع ہو گیں۔ بروکلین کی کوئی مسز جین کے Mrs. Jean Kay جنھوں نے پبلک کے کاموں میں ماضی میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی کہ اچانک اس نے نیو یارک سپریم کورٹ میں ٹیکس ادا کرنے والوں کی طرف سے رَسل کی تعیناتی کی منسوخی کے لیے مقدمہ دائر کر دیا جس میں کہا گیا کہ وہ یہاں پر اجنبی

ہے مزید یہ کہ وہ جنسی بے راہ روی کا پرچارک ہے لہٰذا اُسے نکال باہر کیا جائے۔ مسز جین کے نے مزید اپنی طرف سے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس کی بیٹی گلوریا رَسل کی طالب علم ہوتی تو کیا ہوتا! لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت خود گلوریا اس قابل ہی نہ تھی کہ وہ سٹی کالج نیویارک میں اس کی سٹوڈنٹ ہوسکتی اور شاید اسی لیے اس معاملے کو زیرِ غور ہی نہ لایا گیا۔ مسز کے کے وکیل نے عدالت میں رَسل کے اخراج کی دو مزید وجوہات پیش کیں اوّل یہ کہ رَسل نے اُستاد منتخب ہونے کے لیے مقابلے کا امتحان نہیں دے رکھا۔ دوئم یہ کہ یہ پبلک پالیسی کے برعکس ہوگا کہ کسی ملحد کو ملازمت دی جائے۔

جوزف گولڈسٹین مسز کے کا وکیل مقرر ہوا تھا جو لاگارڈیا سے قبل سٹی مجسٹریٹ تھا۔ اس نے اپنے مختصر بیان میں رَسل کی تصانیف کو گھٹیا، جنس کی شدید خواہش پر مبنی فسق و فجور، تنگ نظری اور جھوٹ کا پلندہ قرار دیتے ہوئے مزید کہا کہ اُس کی تعلیمات نہایت نامناسب، نامعقول، شہوت کا سرچشمہ اور کسی بھی سماجی اِخلاق سے عاری ہیں۔ لیکن یہ سب کُچھ کہنے کے باوجود اس کی تسلی نہ ہوسکی گولڈسٹین کے مطابق ''رَسل نے انگلینڈ میں برہنہ لوگوں کی باقاعدہ ایک کالونی بنا رکھی تھی۔ اِس کے بچے برہنگی کا عام مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ وہ خود اور اس کی بیوی پبلک کے سامنے برہنگی کا عام مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ یہ شخص جو کہ اب تقریباً ستر سال کا ہو چکا ہے جنس پر شاعری میں مشغول رہتا ہے۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم جنسیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ میں بڑے وثوق سے کہتا ہوں کہ وہ اس کو پسند بھی بہت کرتا ہے۔'' میرے خیال میں گولڈسٹین اپنے فرصت کے اوقات فلسفے کے مطالعہ میں صرف کرتا رہا تھا۔ لہٰذا اس نے رَسل کی تصانیف کے بارے میں فیصلہ کُن انداز میں اپنے اختتامی الفاظ یوں تباہ کُن لہجے میں بیان کیے جو مندرجہ ذیل ہیں:

> ''جیسے کہ لفظ فلسفہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے رَسل کسی بھی اعتبار سے قطعی طور پر فلسفی نہیں ہے نہ ہی اُسے عقل و دانش سے واسطہ ہے نہ ہی وہ فکر و فہم کا متلاشی ہے نہ ہی اُسے آفاقی سائنس کے بارے میں جستجو رہتی ہے جس کا مقصد آفاقی مظاہر کی تشریح و اسباب کے حوالے سے کرنا ہوتی ہے اور یہ کہ وہ میری مؤکلہ اور تمام لوگوں کے نزدیک فریب کُن سخن ساز ہے۔ وہ سوفسطایت پر یقین رکھنے والا شخص ہے۔ وہ ایک ایسا سخن ساز ہے جو پُرفریب دلائل تراشتا ہے۔ بڑی مکاری کیساتھ متنازع مسائل پر بحث چھیڑتا ہے۔ مختلف طریقوں، چالبازیوں اور نکتہ چینیوں کی مدد سے بے ہودہ دلائل آگے بڑھاتا ہے۔ جبکہ وہ دلائل کسی بھی ٹھوس بنیاد پر قائم نہیں ہوتے۔ لیکن وہ ایسے نتائج اخذ کرتا ہے جنہیں کسی طور پر بھی مناسب قرار نہیں دے سکتے۔ اُس کا مبینہ اندازِ فکر جسے وہ فلسفہ کہتا ہے نہایت بے جان گھسا پٹا، مکروہ، بھڑکیلا چمکدار لیکن گھٹیا قسم کے دعووں پر مبنی ہے جو

اس مقصد کے لیے گھڑے گئے ہیں کہ لوگوں کو گمراہ کیا جا سکے۔"

اخبار ڈیلی نیوز کے مطابق نہ مسز کے کو علم تھا اور نہ ہی اس کا خاوند جانتا تھا کہ مقدمے کے اخراجات کون برداشت کر رہا ہے حتیٰ کہ اس کا وکیل گولڈسٹین بھی اس معاملے سے بے خبر تھا۔

رَسل اب تک اپنے خلاف مہم کے دوران کسی بھی قسم کے تبصرے سے گریز کرتا رہا تھا۔ تاہم اُس مُہم کے آغاز میں یہ ضرور کہا کہ "میں بشپ مینگ کی طرف سے حملے کا جواب قطعی طور پر نہیں دینا چاہتا کیونکہ جس نے بھی اپنی جوانی ہی میں ٹھان لیا ہو کہ سوچنا بھی ایمانداری سے اور بولنا بھی سچائی سے لازمی ہے تو اس سے قطع نظر کہ اس سے کس قسم کی عداوت جنم لے سکتی ہے اور اس کے خیالات کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے گا۔ اُسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی باتوں کو نظر انداز ہی کر دینا ہی بہترین حکمت عملی ہوتی ہے" چنانچہ اب جبکہ اس پر یلغار عدالت کے دروازے تک پہنچ چکی تھی لہٰذا رَسل نے محسوس کیا کہ اب جواب کسی اشاعت کے ذریعے دینا ضروری ہو گیا ہے تب اس نے لکھا کہ "میں اب تک سٹی کالج میں اپنی تعیناتی کے سلسلے میں بحث مباحثہ سے لاتعلق رہتے ہوئے خاموش رہا ہوں کیونکہ میرے خیالات سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا لیکن اب چونکہ میرے اعمال کے متعلق عدالت میں جھوٹے اور بے بنیاد بیانات دیئے جا رہے ہیں اس لیے میں اپنی پوزیشن واضع کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی بھی اِنگلینڈ میں برہنہ کالونی نہیں بنائی تھی۔ میری بیوی نے اور نہ ہی کبھی میں نے خود برہنگی کی عام پبلک میں نمائش کی۔ مزید یہ کہ میں نے کبھی شہوت پر مبنی شاعری نہیں کی اس قسم کی بے بنیاد باتیں محض مجھے بدنام کرنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ حالانکہ میں ایسا کرنا تو کجا ایسا سوچ بھی نہیں سکتا مجھے حلفاً ایسا کہتے ہوئے خوشی ہوگی" اس میں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ رَسل کو ہمیشہ سے ہم جنس پرستی ناپسند رہی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا نقطہ ہے جس پر میں آگے چل کر تفصیل سے بیان کروں گا۔

مسز کے کا مقدمہ مگی ہان کی عدالت میں سماعت کے لیے پیش ہوا جس کا برونکس ڈیموکریٹک مشن (کمپنی) سے گہرا تعلق تھا۔ وہ اس کیس کی شنوائی سے قبل مارٹن لوتھر کی دیوار پر نقش تصویر اور اس کیساتھ متعلقہ لکھی ہوئی قانونی تحریر کو صاف کروانے کی کوشش کر چکا تھا لہٰذا اس کی اس کوشش سے اس کی پست ذہنیت پہلے دن ہی سے عیاں تھی۔ نکولس بکسی Nicholas Bucci کو بطور سرکاری وکیل کے بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کی طرف سے وکیل صفائی مقرر کیا گیا۔ اس نے بجا طور پر بڑے سلیقے سے رَسل کے "بدی" پر مبنی خیالات اور خود اس کی اپنی تعیناتی بطور فلاسفر کے "نا اہلی" زیرِ بحث لانے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنی طرف سے دیئے گئے دلائل کے دوران اپنی توجہ اس قانونی نقطے پر مرکوز رکھی کہ آیا ایک اجنبی سٹی کالج میں تعیناتی کا اہل ہوتا ہے یا نہیں اور رَسل کے حق میں معقول دلائل دینے کے بعد مقدمے کے اخراج کی استدعا

کی۔ جج مگی ہان نے قدرے نفرت اور بدنیتی سے جواب دیا کہ ''اگر مدعی کی طرف سے دی گئی درخواست میں جو الزامات لگائے گئے ہیں اور ان کے ثبوت میں جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے کی رُو سے درست ثابت ہوتے ہیں تو پھر میں اپیلیٹ ڈویژن اور کورٹ آف اپیل سے کہوں گا کہ ان کے بارے میں ضرور غور کیا جائے'' جن کتابوں کے بارے میں ذکر کیا تھا وہ گولڈسٹین پہلے ہی اپنے الزامات کو ثابت کرنے کے لیے عدالت کو مہیا کر چکا تھا۔ وہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

تعلیم اور اچھی زندگی

شادی اور اخلاق

تعلیم اور جدید دُنیا

میرا نُقطہ نظر

V

دو دِن کے بعد یعنی 3 مارچ کو جج نے اپنی سوچ بچار کیمطابق اِن خیالات کا اظہار کر دیا جن کا معیار عام روایتی سا تھا۔ اس کے نزدیک شاید فطرت کے قوانین یا فطرت پر جس کا غلبہ حاصل ہے اور پھر کسی مقرر پادری کی طرح تقریر شروع کر دی غرض اُس نے رَسل کی تعیناتی کو منسوخ کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ تعیناتی نیویارک سٹی کے شہریوں کی بےعزتی کے مترادف ہے'' اس نے بورڈ کی کاروائی کو شرمناک قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایسا کرتے ہوئے بورڈ نے بلا سوچے سمجھے اپنی من پسند کو سامنے رکھا اور یہ نہ جانا کہ ایسا کرنے سے پبلک ہیلتھ، سلامتی، عام لوگوں کا اِخلاق اور خود درخواست دہندہ کے حقوق خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ یوں درخواست ہندہ عین اس کا اہل ہے کہ وہ برٹرینڈ رَسل کی تعیناتی کی منسوخی کا مطالبہ کرے اس پر دی سنڈے مرر نے لکھا کہ خود جج کو یہ اعتراف ہے کہ اُس کا فیصلہ ''ڈائنامائٹ'' کی حیثیت رکھتا ہے مزید یہ کہ اُس کا دماغ محض قانون پر مرکوز نہ تھا ہاں اگر اس میں کُچھ شک باقی رہ جاتا ہے تو وہ اُس نے مزید یہ کہہ کر تصدیق کر دی کہ ''اس فیصلے نے نئے سِرے سے قانون ساز کمیٹی کے لیے ایسی بنیادیں رکھ دیں ہیں کہ وہ اس کی نئے سِرے سے تحقیق کرے۔ میں بڑی جرأت سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس اُمر کی بھی تحقیق کریں کہ رَسل جیسے شخص کی تعیناتی کیسے ممکن ہوگئی۔ دی نیور پبلک نے اس حقیقت کی طرف اِشارہ کیا کہ مگی ہان کا فیصلہ ''لازمی طور پر بجلی کی سی تیزی سے کیا گیا ہوگا'' جان ڈیوئے نے شک وشبہات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اُسے یقین ہے کہ جج نے گولڈسٹین کی طرف سے بطور شہادت پیش کی گئی کتابوں کا مطالعہ کبھی کیا ہی نہیں اور یہ کہ فیصلہ دیتے ہوئے غیر معمولی جلد بازی کا مظاہرہ کیا گیا اور یہ بات تو ناممکن ہے کہ محض دو دِنوں میں چار عدد کتابوں کا مطالعہ کرنا اور اُس کے علاوہ اتنا طویل فیصلہ لکھ دینا۔ جج نے فیصلہ دیتے وقت

ایسی کوئی کوشش نہیں کی کہ جس سے تمام فریقین کے حقوق کا خیال رکھا جا سکے جیسا کہ ایک ایماندار جج کو کرنا چاہیے اور یہ حقیقت تو اس کیس کی کئی خصوصیات سے ظاہر ہے۔ اس نے رَسل کو گولڈسٹین کی طرف سے لگائے گئے الزامات کی نفی کرنے کی اجازت تک نہیں دی بلکہ جج نے ظاہری طور پر خود سے فرض کر لیا کہ رَسل نے سب الزامات کو پہلے ہی سے تسلیم کر رکھا ہے۔ مگی ہان نے رَسل کو کوئی بھی ایسا موقع نہیں دیا کہ جس میں اُس سے پوچھا جاتا کہ کیا اُس کی (جج) تشریحات رَسل کے خیالات کی عکاسی کرتی ہیں یا نہیں۔ نہ ہی اُس نے اس اَمر کو یقینی بنایا کہ جن کتابوں کو رَسل آٹھ سے پندرہ سال قبل لکھ چکا ہے کیا وہ اب بھی ان سے متفق ہے۔ اگر ایسا کیا ہوتا تو یہ عین قاعدہ اور قانون کی عمومی شائستگی کے مطابق ہوتا اور انصاف کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا۔

جیسے کہ ہم پہلے مشاہدہ کر چکے ہیں کہ بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کی طرف سے مقرر کردہ وکیل بکسی نے اپنے دلائل کو رَسل کی تعیناتی تک ہی محدود کئے رکھا لیکن مگی ہان نے تو اُنہیں سرے سے ہی نظر انداز کرتے ہوئے مسز کے کی طرف سے دائر کی گئی درخواست و دیگر الزامات کے تحت اُس کی تعیناتی کو منسوخ کر دیا اور بکسی کو دوسرے الزامات کا جواب دینے کا موقع دیئے بغیر ہی اپنے فیصلے کی اشاعت کر دی جس میں مگی ہان نے کہا کہ ''وکیل صفائی نے عدالت کو کسی بھی قسم کا جواب دینے سے انکار کر دیا'' لیکن مسٹر بکسی نے اس کی فوراً ہی ایک حلفیہ بیان کے ذریعے تردید کر دی۔ تاہم اس تردید کو بعد میں کبھی بھی چیلنج نہیں کیا گیا۔ مسٹر بکسی نے حلفیہ بیان دیتے ہوئے کہا کہ جج نے اُسے کہہ رکھا تھا کہ اُسے بعد میں بورڈ کی طرف سے جواب دینے کی اجازت دے دی جائے گی۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک جمہوری ریاست میں بھی اگر کوئی انصاف کی اہم کرسی پر بیٹھا ہو اور اس نے کسی ایک فریق کے حق میں جانبداری کی ٹھان رکھی ہو اور مزید یہ کہ اُسے با اثر سیاستدانوں کی حمایت بھی حاصل ہو تو پھر دن دیہاڑے وہ کیا نہیں کر سکتا! لہٰذا یہ بے حد ضروری ہے کہ اُس جج کے تحریری فیصلے کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے کیونکہ اس کے بغیر کوئی قاری یقین ہی نہیں کرے گا کہ حقیقت میں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ مجھے یہ قطعاً زیب نہیں دیتا کہ میں بھی اُس جج کی تقلید میں متن سے علیحدہ کر کے کچھ حصے حوالے کے طور پر بطور نمونہ پیش کرتے ہوئے جج پر لاتعداد الزامات کی بوچھاڑ کر دوں۔ مگی ہان معاملات کو مسخ کر کے دوسروں کی شخصیت پر کیچڑ اُچھالنے کے فن میں اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتا ہے۔ اکثر مواقع پر اپنی تحریروں کے ذریعے رَسل کے مخالف مؤقف کو نہایت کامیابی سے رَسل ہی سے منسوب کرتا رہا اُس کی تعیناتی کی منسوخی تین وجوہات کی بناء پر کی گئی اُس کی پہلی وجہ امریکا میں اس کے اجنبی ہونے کے ناطے سے بیان کی گئی۔

''سب سے پہلے درخواست دہندہ کا یہ کہنا ہے کہ ایجوکیشن قانون کا سیکشن 550 تقاضا کرتا ہے کہ ''اس شخص کو تعلیم پر مامور نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کسی کو تعلیم دینے کی اجازت ہوگی جو اس ملک کا شہری نہیں ہے۔ تاہم اس شق کا اطلاق اس غیر ملکی اُستاد پر نہیں ہوگا جو اس کے بعد مامور ہوا بشرطیکہ اس نے اپنی شہریت کے لیے درخواست دے رکھی ہو مزید یہ کہ وہ درخواست بعد میں قانون کے مطابق دیئے گئے وقت کے اندر اندر منظور ہو جائے'' اس بات کا تو اعتراف ہے کہ رَسل اس ملک شہری نہیں اور یہ بھی کہ اس نے شہریت کے حصول کے لیے درخواست بھی نہیں دے رکھی۔ سرکاری وکیل کا یہ بھی کہنا ہے کہ تعیناتی کے بعد بھی اُس کے پاس مناسب وقت ہے جس میں وہ شہریت کے لیے درخواست دے سکتا ہے اُس کا مزید یہ کہنا ہے کہ یہ شق سٹی آف نیویارک کالج کے اُستاد پر لاگو نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر سیکشن 550 کا اطلاق نیویارک سٹی کالج پر ہوتا ہے تو اکثر و بیشتر اساتذہ کی تعیناتی غیر قانونی قرار پائے گی کیونکہ نہ تو اُن میں سے کوئی گریجوایٹ ہے اور نہ ہی اُن اساتذہ کے پاس ایجوکیشن کمشنر کی طرف سے جاری کیے گئے تعلیم دینے کا لائسنس ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے اس شق کا اطلاق رَسل کی تعیناتی سے ملتی جلتی صورت حال کے لیے ہوسکتا ہے۔ یا یہ شق ایسی کسی صورت حال کے لیے منظور کی گئی ہو جبکہ کافی عرصے سے اس ملک میں مقیم ہو اور اس نے ابھی تک شہریت کے حصول کے لیے کوئی درخواست نہیں دی۔ مزید یہ کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد اس کو شہریت دینے سے انکار کر دیا جائے گا۔ اس شق کا اطلاق عام طور پر ''اساتذہ اور شاگردوں'' پر ہوتا ہے اور یہ کہ اس کا اطلاق ایلیمنٹری اور سیکنڈری سکول پر نہیں ہوتا۔ اس لیے عدالت اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اس شق کے تحت برٹرینڈ رَسل تعلیم دینے کے لیے نااہل پایا جاتا ہے۔ لیکن فیصلہ محض اسی وجہ کی بنیاد پر نہیں دیا گیا۔''

جج کے فیصلے میں جو وجوہات بیان کی گئی ہیں اُن میں کسی فاش غلطی کو تلاش کرنے کے لیے کسی کو بھی افلاطونی عقل و دانش کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ کیونکہ قانون ساز ادارے کے منظور کردہ جس ضابطے کا حوالہ دیا گیا ہے کے تحت یہ قانون اور مذکورہ شق پبلک سکول پر تو عائد ہوتا ہے لیکن کالج کا تو کہیں ذکر ہی نہیں اُس مذکورہ ضابطے میں اور بھی بہت سی شقیں موجود ہیں لیکن اُن میں سے کوئی بھی شق پروفیسر حضرات پر لاگو نہیں ہوتی بلکہ پبلک سکول میں بھی کسی غیر امریکی کو تعلیم دینے کی یہ ضابطہ اجازت دیتا ہے بشرطیکہ وہ امریکی

شہریت حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کرے جبکہ رَسل کے پاس پورا ایک سال پڑا تھا جس کے دوران وہ اس ارادے کا اظہار کسی بھی وقت کر سکتا تھا لہٰذا جج مگی ہان کو یہ حق کسی طور پر نہیں پہنچتا کہ وہ یہ فرض کرے کہ رَسل شہریت حاصل کرنے کے لیے درخواست نہیں دے گا اور نہ ہی اُسے ترکِ وطن کے محکمے کی طرف سے بولنے کا حق ہے کہ وہ اُس کو شہریت نہیں دیں گے۔

جج کی طرف سے اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے کی بناء پر کسی بھی اعلیٰ عدالت سے توقع تھی کہ وہ اس فیصلے کو رد کر دے۔ لہٰذا مگی ہان کے فیصلے کے بھونڈے پن اور اس کے اپنے جانبدارانہ رویئے کی بناء پر (جیسے کہ جج نے رَسل کو بدکردار اور اخلاقی مجرم قرار دے رکھا تھا) ترکِ وطن سے متعلق حکام نے نہ ہی کبھی پہلے اور نہ ہی کبھی فیصلے کے بعد رَسل کو امریکا سے واپسی کے بارے میں کچھ کہا۔

فیصلے کی رُو سے رَسل کی تعیناتی کو منسوخ کرنے کی دوسری وجہ یہ بیان کی گئی کہ اُس نے مقابلے کا امتحان ہی نہیں دیا۔ اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

> ''درخواست دہندہ کی طرف سے دوسرا نقطہ یہ اُٹھایا گیا ہے کہ تعیناتی کے وقت رَسل سے اُس کی اہلیت سے متعلق کسی بھی قسم کا امتحان نہیں لیا گیا جو کہ سٹی کالج آف نیویارک کی انتظامیہ کمیٹی کے اراکین کے اجلاس کے تحریری کارروائی سے ظاہر ہوتا ہے۔''

اِس قانون میں ایک شِق موجود ہے جس میں تسلیم کیا گیا ہے کہ جب امتحان عملی طور پر ناممکن ہو تب بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کو ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آیا کسی شخص کو بغیر امتحان دیئے ہی تعینات کر دیا جائے یا نہیں۔ مگی ہان اس شِق کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا چنانچہ اس کے لیے اس شِق کو نظر انداز کرنا مشکل تھا لیکن چونکہ اُسے ہر قیمت پر رَسل کو نااہل قرار دینا تھا لہٰذا اُس نے مذکورہ شِق سے بچنے کے لیے نئی اقسام کے دلائل تراش لیے جن کا بیان مندرجہ ذیل ہے:

> ''بورڈ نے اپنی طرف سے یہ فیصلہ کر لیا کہ فلسفے کے پروفیسر کی تعیناتی کے لیے مقابلے کا امتحان ناقابلِ عمل ہے جبکہ عدالت کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اس کی کارروائی پر اپنا فیصلہ دے چنانچہ بورڈ کی طرف سے مقابلے کے امتحان کو ناقابلِ عمل فرض کر لینے کا فیصلہ اندھا دُھند کیا گیا جبکہ اس کے لیے طویل سوچ بچار کی ضرورت تھی جسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا لہٰذا عدالت یہ سمجھتی ہے کہ وہ فیصلہ نہ صرف غیر مربوط ہے بلکہ نیویارک ریاست کے آئین کی خلاف ورزی پر مبنی ہے۔ اگر دُنیا میں ریاضی اور فلسفے کے بارے میں صرف ایک ہی شخص کو جانکاری ہوتی اور وہ صرف مسٹر رَسل ہی ہوتے

تو شاید ٹیکس ادا کرنے والے اس بات کی اجازت دے دیتے کہ رَسل کو بلا امتحان تعینات کر دیا جائے۔ لیکن یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ جہاں تعلیم کے شعبے میں بے پناہ اخراجات اُٹھائے جا رہے ہیں لیکن خود امریکا بھر میں کوئی ایک شخص بھی ایسا موجود نہ ہو جس کی اہلیت علم و اِخلاق کے اعتبار سے مُسلمہ ہو آخر دوسری یونیورسٹیاں اور کالج چاہے وہ سرکاری ہوں یا پرائیویٹ امریکی شہریوں کو ملازمت فراہم کر رہی ہیں۔ لیکن سٹی آف نیویارک کالج ہی ایسا کیوں ہے جو ایک اجنبی کو فلسفے کا پروفیسر مقرر کر رہا ہے اور وہ بھی بلا امتحان لیے ہوئے اور یہ جو بورڈ آف ہائر ایجوکیشن ہے اس کے لیے امتحان لینا کیوں ناممکن ہے۔ جبکہ امتحان لیے بغیر اس کی تعیناتی نہ صرف یہ کہ ریاست نیویارک کے آئین کی خلاف ورزی ہے۔ بلکہ سارے عوام کے اِختیار کی توہین ہے جنہوں نے پارلیمنٹ کو مُنتخب کیا ہے۔''

مگی ہان کے اس مؤقف سے اتفاق بہت مشکل ہے کہ بورڈ کی طرف سے رَسل کو امتحان کا پابند نہ کرنے کا فیصلہ بلا جواز تھا اور بلا سوچے سمجھے تھا یا بورڈ کی اپنی متلون مزاجی کا نتیجہ تھا اس سے زیادہ مشکل یہ فرض کر لینا تھا کہ جج جو کُچھ کہہ رہا تھا وہ واقعی اس کی نیک نیتی کا عکاس تھا اگر مقابلے کا امتحان حقیقتاً کالج اساتذہ کے لیے کوئی قانونی ضرورت ہوتی تب تو ریاست کے تمام کالجوں کے پروفیسر حضرات کو ملازمت سے نکال دینا چاہیے۔ ہائر ایجوکیشن ٹرسٹ کے ہر رُکن پر غیر قانونی تعیناتی کرنے کے الزام میں مقدمہ چلنا چاہیے مزید یہ کہ نیویارک سٹیٹ کمشنر آف ایجوکیشن کو باقاعدہ اس جرم میں کہ اس نے لاتعداد پروفیسروں کی غیر قانونی تعیناتی کی اجازت دے رکھی تھی سزا ہونی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ قانون کسی حال میں بھی بورڈ کو یہ منع نہیں کرتا کہ وہ اُن حالات کا جائزہ نہ لے جس میں یہ فیصلہ درکار ہو کہ آیا کسی کا امتحان لینا ممکن ہے یا نہیں۔ چاہے وہ اجنبی ہو یا امریکی شہری۔

مگی ہان کی منطق کو اگر درست مان لیا جائے تو کسی بھی غیر ملکی کی خدمات حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہو جائے کیونکہ جب یہ مفروضہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہر عہدے کے لیے مناسب قابلیت کا حامل امریکی موجود ہے اور یہ کہ اُسی کو ملازمت کا حق ہونا چاہیے تاہم ہر کوئی جانتا ہے کہ امریکا میں بڑے بڑے ادارے اعلیٰ تعلیم کے لیے باقاعدگی سے غیر مُلکیوں کی خدمات حاصل کرتے رہے ہیں۔ مگی ہان کی طرف سے تارکینِ وطن سے متعلق تشریح سے پہلے سرکاری طور پر تسلیم کرتے ہوئے غیر ملکی اساتذہ کی خدمات حاصل کرنے کے لیے کوٹہ مقرر ہو چکا تھا اور اُنہیں باقاعدہ استثناء حاصل تھا۔ ابھی حال ہی میں میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ ایک میونسپل کالج میں ایک نمایاں شہرت کے حامل کیتھولک پروفیسر کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جس کا نام

جیکس مارٹن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر ذی ہوش شخص کو اس کی تقرری کو خوش آمدید کہنا چاہیے۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے نہ تو اُس نے اپنی شہریت کے لیے درخواست دے رکھی ہے اور نہ ہی اُس سے کسی قسم کا امتحان لیا گیا ہے۔ میں بڑی سنجیدگی سے اس کا مُتجسس ہوں کہ مگی ہان کے پاس مارٹن کا کیس اگر آئے تو وہ اُن وجوہات کو کیسے بروئے کار لائے گا جو رَسل کے بارے میں وہ خود بیان کرتا آ رہا ہے۔

رَسل کی تعیناتی کو منسوخ کرنے کے حوالے سے جو تیسری وجہ بیان کی گئی اس پر جج نے اپنی طرف سے خصوصی توجہ دیتے ہوئے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ پہلی دو وجوہات بیان کرتے ہوئے اس کا رویہ قدرے معذرت خواہانہ سا تھا۔ لیکن تیسرے نطقے کو بیان کرتے ہوئے اُس نے جارحانہ رویہ اِختیار کر لیا۔ جب بچوں کی اِخلاقیات کا دفاع کرنے کا مسئلہ درپیش ہو تو اس کا بورڈ کے بارے شکوک و شبہات میں مبتلاء ہونا یقینی تھا۔ اس نُقطے پر فوری طور جج کا دھیما انداز ملائمیت اور شائستگی ہوا ہو گئی اور طیش بھرے مقدس غصے نے اُس کی پوری شخصیت کو اپنی گرفت میں لے لیا چُنانچہ یہ تعین کرنا مُشکل ہو گیا کہ آخر جج کس بنیاد پر رَسل کی تعیناتی کو منسوخ کر رہا ہے۔ کیونکہ اس نے بڑے عجیب و غریب طریقے سے تسلیم کر لیا کہ اُس کے بہت سے مشاہدات کیس سے غیر متعلق ہیں۔ البتہ وہ اس دوران جج ہونے کی بجائے ایک جنونی پادری معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے پیشِ نظر اور تو کچھ نہ تھا سوائے رَسل کا ''بدکردار'' ہونا اور اُس کی ہوس ناکی پر قائم تعلیمات تھیں۔

''ویسے تو جو اس سے قبل وجوہات بیان کی گئی ہیں درخواست دہندہ اُس ریلیف کا حق دار پایا جاتا ہے جس کی استدعا اُس نے کی ہے۔ لیکن جو اس کیس کے سلسلے میں اُس نے تیسرا نقطہ اُٹھایا ہے وہ نہ صرف اس کے لیے بلکہ خود عدالت کے لیے بھی بڑی شدید نوعیت کا ہے درخواست دہندہ کا مؤقف یہ ہے کہ برٹرینڈ رَسل کی تعیناتی نہ صرف ریاست کی پالیسی کی خلاف ورزی ہے بلکہ اس کی تعلیمات بھی غیر اِخلاقی نوعیت کی تھیں۔''

کیس کی کاروائی کے دوران یہ دلائل دیئے گئے ہیں کہ رَسل کی تحریروں اور اُس کی نجی زندگی کا اُس کی بطور فلسفے کے اُستاد کی تعیناتی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ریاضی کی تعلیم دیا کرے گا۔ تاہم اُس کی تعیناتی سٹی کالج کے فلسفے کے شعبے سے متعلق ہے۔

رَسل کے خلاف اپنے تمام تر تعصبات کے باوجود جج نے اُس پر کسی مذہبی حوالے سے حملہ کرنے سے گریز کیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں اُس پر مہربانی کرتا رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکا ایک سیکولر ریاست ہے۔ جس کا اُسے اچھی طرح علم تھا۔ اس لیے بڑے بڑے سیاستدان اپنی پُشت پناہی میں پا کر بھی اُس کی یہ ہمت نہ تھی کہ اس حوالے سے اُس پر حملہ آور ہوتا۔ اُسے اس بات کا ادراک تھا کہ وہ کسی

ایسی دُنیا میں نہیں رہ رہا تھا جو مقدس رومن ایمپائر کا حصہ تھی۔اس لیے وہ ہر اُس مرحلے پر جہاں رَسل کے وہ تنقیدی نظریات جو مذہب کے بارے میں شائع ہو چکے تھے اگر اُن کے زیرِ بحث آنے کا احتمال ہوتا تو وہاں ہر ممکن نرمی سے پیش آتا۔لیکن دوسرے معاملات میں اُس کے نزدیک دُرشت زبان استعمال کرنا ضروری تھا جس کا مظاہرہ اُس نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا:

''حکومت مخصوص اصولوں پر قائم ہے جب ایک ایسا شخص بطور اُستاد مقرر کیا جائے جو اچھے کردار کا حامل نہ ہو تو اس کی تقرری عمل میں لانے والے حکام کی طرف سے اُن لازمی اُصولوں کی خلاف ورزی ہوگی۔ایک اُستاد کے لیے اچھے کردار کا مالک ہونا لازمی شرط ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اس طریقہ کار کا اِطلاق پورے امریکا میں سول سروس میں تمام ملازمین پر ہوتا آ رہا ہے مزید یہ کہ ریاست کے تمام اداروں پر یہ اُصول عائد ہوتا ہے۔اس سلسلے میں مزید کسی دلیل کی ضرورت ہی نہیں۔یہ ایک طے شدہ اَمر ہے۔تعلیم پر بھی اس کا اسی طرح اطلاق ہوتا ہے۔خاص طور پر ایک اُستاد کے بارے میں یہ فرض کرنا تو لازم ہے کہ وہ نہ صرف کلاس روم میں اچھے کردار کی تعلیم دے بلکہ بذاتِ خود اُس کا اپنا شخصی کردار طالب علموں کے لیے مشعلِ راہ ہونا چاہیے۔ سٹی آف نیویارک کے ٹیکس دہندگان لاکھوں ڈالر تعلیم کے شعبے پر خرچ کرتے ہیں۔ اُن سے یہ رقم اس لیے نہیں ہتھیائی جاتی کہ وہاں ایسے اساتذہ کا تقرر کیا جائے جن کا کردار اچھا نہ ہو۔تاہم خود تعلیم کے شعبے میں بھی ایسا قانون موجود ہے جس میں اس اَمر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔''

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مگی ہان نے اپنے فیصلے میں رَسل کو تو بارہا ''بدکردار'' قرار دیا لیکن اس نے اپنی پوری تحریر کے دوران اُس پر لگائے گئے حقیقت پر مبنی یا فرضی الزامات کے ایسے کسی ثبوت کا ذکر نہیں کیا جس کی بنیاد پر اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا۔یہ یقین کرنا ناممکن ہے کہ اُس نے گولڈسٹین کے لگائے گئے الزامات کو قبول کر رکھا ہے کہ رَسل اور اس کی بیوی نے کبھی برہنگی کی حالت میں عام پبلک کے سامنے نُمائش کی تھی یا یہ کہ رَسل نے کبھی شہوت پر مبنی شاعری کی تھی۔بالکل اُسی طرح یہ جاننا بھی مُشکل ہے کہ جج نے اپنے نتائج کی بنیاد جنگِ عظیم اوّل کے دوران رَسل کی امن پسندی کی بناء پر اِنگلینڈ میں قید کو بنایا جس کے بارے میں خود گولڈسٹین اور دوسرے آئرش باشندے اُس وقت تک بے خبر تھے۔مجھے نہیں معلوم کہ وہ کونسا طریقہ کار اپنایا گیا جس کی رُو سے اتنے توہین آمیز الزامات لگائے گئے۔لیکن ذرہ بھر بھی اُن کو ثابت کرنے کے لیے شہادت پیش کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی گئی۔میری طرح کے بدقسمت لوگوں کو یہ سب کُچھ غیر اِخلاقی معلوم

ہوتا ہے اور اگر یہ کسی جج کی طرف سے اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں واقع ہو تو یہ اُس کے مرتبے پر دھبہ دکھائی دے گا۔

مطلب یہ کہ اُس کے نزدیک رَسل کا کردار بہت بُرا ہے لیکن اُس کا اندازِ فکر اُس سے بھی بُرا۔

''درخواست دہندہ کی طرف سے یہ نقطہ اُٹھایا گیا ہے کہ رَسل کی کتابوں میں جنس پر مبنی اِشتہاء انگیز تعلیمات کا پرچار کیا گیا ہے۔ درخواست دہندہ کی طرف سے جو کتابیں بطور شہادت پیش کی گئی ہیں اُن سے اُس کے مؤقف کو بہت تقویت ملتی ہے۔ میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اُس غلاظت کا یہاں تفصیل سے ذِکر نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔ تاہم ریکارڈ کے لیے اُس کی کتاب ''تعلیم اور جدید دُنیا'' صفحہ نمبر 119۔120 کا حوالہ دینا کافی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''اِخلاق اور عقل و دانش کے اعتبار سے یہ بہتر ہوگا کہ طالب علم اپنی اپنی یونیورسٹی لائف کے دوران اپنی شادی کو بچے کی پیدائش کے بغیر جاری رکھیں۔ اس سے جہاں جنسی خواہش کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور نہ ہی مال وزر کی ضرورت ہوگی۔ مزید یہ کہ ایک تو بے چینی نہیں رہے گی اور دوسرا یہ کہ اِدھر اُدھر فضول وقت ضائع ہونے کی بجائے تعلیم پر بھرپور توجہ دی جا سکے گی'' مزید یہ کہ رَسل کی اپنی کتاب ''شادی اور اِخلاق میں یہ کہنا ہے کہ''

> ''ایک ایسی شادی کو جس میں پہلے سے برتھ کنٹرول طے کر لیا جائے دُرست سمت میں ایک قدم قرار دیتا ہوں۔ اس سے بہت سی برائیوں سے بچا جا سکے گا۔ میرا نہیں خیال کہ یہی کافی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمام جنسی تعلقات کو خالصتاً نجی معاملہ سمجھا جانا چاہیے۔ اگر کوئی مرد اور عورت بچے کی پیدائش کے بغیر اکٹھے رہنا چاہتے ہیں تو سوائے اُن دونوں کے کسی اور کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے میں اس بات کو پسندیدہ نہیں سمجھتا کہ کوئی مرد یا عورت شادی جیسے سنجیدہ بندھن میں ملوث ہو جس کے نتیجے میں بچوں کی پیدائش ہو جائے۔ جبکہ اُنہوں نے آپس میں کبھی ماضی میں جنسی تجربہ نہ کیا ہو۔ یہ جو عجیب وغریب اہمیت زنا کو دی جاتی ہے یہ قطعی طور پر نامعقول قسم کی ہوتی ہے۔''
>
> (میرا نقطہ نظر صفحہ 50)

جج نے رَسل کی کتاب میں سے کسی بھی ''گندگی یا غلاظت'' کا حوالہ محض اس وجہ سے نہیں دیا کیونکہ وہاں غلاظت موجود ہی نہیں تھی۔ جیسے کہ جان ڈیوی نے ''دی نیشن'' کے آرٹیکل میں لکھا ''جو لوگ غلاظت اور فحاشی تلاش کرنے کے لیے رَسل کی تحریروں کی طرف رُخ کریں گے تو اُنہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ مبینہ قسم کی کوئی چیز وہاں پائی ہی نہیں جاتی اس کے باوجود رَسل پر اس قسم کے الزامات لگانا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ جن کی طرف سے وہ الزامات لگائے جا رہے ہیں وہ خود کتنے متلون مزاج ہیں اور

یہ کہ اِخلاقیات کے بارے میں کتنے حاکمانہ نظریات کے حامل ہیں اور یوں اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اگر اُن کو اِختیار حاصل ہو جائے تو وہ ہر قسم کی تنقیدی گفتگو پر پابندی لگاتے ہوئے اپنے تنگ نظر عقائد کو دوسروں پر کیسے زبردستی ٹھونسیں گے۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مگی ہان نے رَسل اور اس کی تعلیمات کے بارے میں اب تک جو کُچھ کہا تھا اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ ناکافی ہے کیونکہ رَسل کے بارے میں یہ سچ ثابت کر دینا کہ اُس کا اندازِ فکر جنس کی ترغیب فراہم کرتا ہے عدالت کو کسی قسم کی مداخلت کا حق نہیں دیتا۔ اس لیے اُسے کُچھ مزید کی ضرورت تھی۔ کوئی ایسی چیز جو زبردست ہو اور ڈرامائی نوعیت کی بھی ہو۔ اس کے لیے یہ ایک ایسی صورتِ حال تھی جس میں کوئی تخیلاتی ماحول تخلیق کیا جائے لہٰذا جج نے اس چیلنج کو بڑی خوبصورتی سے نبھانے کی کوشش کی۔ اُسے فوراً پروفیسر شُلز اور دوسرے مقدس فصاحت و بلاغت کے ماہرین کی طرح رَسل کو تعزیراتی قانون کی خلاف ورزی سے جوڑنے کے لیے اپنی زبان دانی کے فن کو استعمال کرنے کی سوجھی۔

''نیویارک کی ریاست کا تعزیراتی قانون عوام کی زندگی میں سب سے اہم عامل ہے یہاں مقیم ہونے کے ناطے سے اور یہاں کے شہری ہونے کے اعتبار سے ہم سب اس کے احاطہ تحفظ میں آتے ہیں۔ ایسے اِنسانی رویّے جو اس کی خلاف ورزی کے تحت آتے ہوں تو کسی صورت نظر انداز کرنا چاہیے اور نہ ہی اُن سے نرمی برتنی چاہیے۔ حتیٰ کہ بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کے بارے میں یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ اُس کو قانون ساز ادارے نے اساتذہ کی تقرری کے سلسلے میں مکمل اِختیارات سونپ رکھے ہیں تب بھی اس پر لازم ہے کہ وہ اس اُمر کا خیال رکھے کہ اس تعزیراتی قانون کی نہ تو خلاف ورزی کرے اور نہ ہی اس کی خلاف ورزی کی حوصلہ افزائی ہونے دے۔ لیکن جہاں اس کی کوئی کاروائی مذکورہ قانون کی خلاف ورزی کی سرپرستی یا حوصلہ افزائی کی صورت پیدا کرتی ہو جس سے پبلک ہیلتھ، سلامتی، تحفظ اور اِخلاقیات پر بُرے اثرات مرتب ہوں تو وہ غیر قانونی اور منسوخ تصور ہوگی۔ اس عدالت انصاف کو اس سلسلے میں پہلے سے ہی اتنے اِختیارات حاصل ہیں جن کی رُو سے سٹی آف نیویارک کے ٹیکس دہندگان کے مفادات کو بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کی کاروائیوں کی طرف سے تحفظ فراہم کیا جائے۔''

تعزیراتی قانون کی بڑے مدلل اور مؤثر انداز میں دفاع کرنے کے بعد جج نے بڑے جوش اور ولولے سے اس کی ترتیب وار شقیں گنوانا شروع کر دیں۔

''ریاست نیویارک کا تعزیراتی قانون اغواء کے جرم کا پوری طرح احاطہ کرتا ہے اور یہ کہ اگر کوئی شخص کسی لڑکی کو جس کی عُمر اٹھارہ سال سے کم ہو کسی ترغیب کے ذریعے جنسی فعل کے لیے حاصل کرتا ہے جبکہ وہ اس کا خاوند نہ ہو یا کوئی شخص کسی بھی غیر شادی شدہ خاتون کو چاہے وہ کسی بھی عُمر کی ہو لیکن اس کا

ماضی داغدار نہ ہو تو کسی بھی جگہ جنسی فعل کی نیت سے لے جانا اغواء کے جُرم کا مرتکب تصور ہو گا۔ جس کی زیادہ سے زیادہ سزا دس سال قید ہو گی (s.70) مزید یہ کہ تعزیراتی قانون کے مطابق 18 سال سے کم عمر لڑکی کے والدین میں سے کوئی بھی ایک یا اُس کا سرپرست اپنی مرضی سے لڑکی کو کسی کے ہمراہ جنسی فعل کی غرض سے بھجوائے اس قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ جس کی زیادہ سے زیادہ سزا دس سال قید ہو گی۔ (s.70)''

''جہاں تک زناء بالجبر کا تعلق ہے تعزیراتی قانون کے مطابق جو شخص سوائے اپنی بیوی کے اگر کسی لڑکی جس کی عمر 18 سال سے کم ہو کے ساتھ جنسی فعل کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگر ایسے حالات موجود ہوں جس میں پہلے درجے کا ریپ نہ ہو تو اس کو دوسرے درجے کا زناء بالجبر متصور ہو گا جس کی زیادہ سے زیادہ سزا دس سال قید ہو گی (s۔2010) (s۔100) تعزیراتی شِق کے مطابق زناء جُرم ہے، (s۔2460) تعزیراتی شِق کے مطابق دیگر امور کے علاوہ جو شخص کسی عورت کو اپنے ساتھ جنسی مقصد کے لیے رہنے کی ترغیب دے یا ترغیب دینے کی کوشش کرے سنگین جرم کا مرتکب ہو گا جس کی کم سے کم سزا دو سال قید جبکہ زیادہ سے زیادہ 20 سال ہو گی اور زیادہ سے زیادہ 5000 ڈالر جرمانہ ہو سکتا ہے۔''

جج نے جتنی بھی شقیں گنوائیں ان کا تعلق صرف اور صرف زناء سے تھا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ زناء کا تعلق تو اس کیس سے سطحی سا بھی نہیں جڑتا۔ کیونکہ رَسل نے کہیں بھی ''زناء بالجبر'' کی کہیں بھی تلقین نہیں کی اور نہ ہی کبھی کسی کو اغواء کرنے کا کہا۔ اُنہوں نے کبھی کسی کو یہ ترغیب بھی نہیں دی کہ وہ کسی عورت کو غیر اِخلاقی مقصد کے لیے اپنے ساتھ رہنے کے لیے کہے۔ حتیٰ کہ خود مگی ہان اپنی تمام تر ہنرمندی کے باوجود متن سے ماوراء ایسا حوالہ دینے میں ناکام رہا جس سے یہ اخذ کیا جا سکے کہ رَسل نے کسی کو جرم کے لیے کبھی اُکسایا ہو۔ تب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی زیادہ شِقوں کا حوالہ دینے کی ضرورت اُسے کیوں پیش آئی؟ مطلب صاف ظاہر ہے کہ جج یہ چاہتا تھا کہ جو لوگ رَسل کی کتابوں سے ناواقف ہیں کم از کم اُن کے ذہنوں میں یہ مفروضہ تو ڈال دیا جائے کہ اِن جرائم کا رَسل کی شخصیت کیساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ ماضی میں پوری امریکی تاریخ میں کسی بھی جج نے ایسا بے مثال لفاظی فریب کبھی کسی کیس میں استعمال نہیں کیا ہو گا۔

آئندہ فیصلے کو اس کے اپنے الفاظ میں بلا روک ٹوک پیش کرونگا تا کہ جج کے سلسلہ خیالات کو اُسی طرح جانا جا سکے جیسے کہ وہ ہیں جبکہ میں اپنی طرف سے کسی بھی قسم کے تبصرے سے گریزاں رہوں گا تا کہ اس کی علمی آزادی کو بہتر بنانے کے بارے میں بصیرت سے بھرپور خیالات اور اندازِ فکر کے بارے میں بھی پتہ چل سکے کہ کس طرح فلسفے، ریاضی اور فزکس کا اُستاد اپنے لیکچر کے دوران طالب علموں کی توجہ 18 سالہ

لڑکیوں کی طرف دلاتا ہے اور اُن سے جنسی فعل سرزد کرواتا ہے۔ جج کی طرف سے پیش کیے گئے نظریات جنہیں شائد بعد میں ''غیر معمولی اثر ورسوخ کا انداز فکر'' کا نام دیا جائے جو جہاں نہ صرف ماہر نفسیات کی دلچسپی کا سامان فراہم کرے گا بلکہ اُن کے لیے بھی جن کا تعلق ماورائے حسیات سے ہے۔

''جب ہم اُس بے پناہ رقم کا تصور کرتے ہیں جو ٹیکس دہندگان سے اس لیے وصول ہوتی ہے کہ مذکورہ شقوں کا نفاذ ہو سکے تو ہمیں یہ جان کر کتنا ناگوار گزرے گا کہ فلاح و بہبود کی بجائے بے پناہ اخراجات خود اِن شقوں کی خلاف ورزی کی حوصلہ افزائی پر خرچ ہو رہے ہیں۔ مانا کہ بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کو سٹی کالج کے اساتذہ کے چناؤ کے متعلق مکمل اختیارات حاصل ہیں۔ اس کی صوابدید پر نہ تو نظر ثانی کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کمی لائی جا سکتی ہے۔ تاہم یہ بلا شرکت غیرے اختیارات اس پیرائے میں استعمال ہرگز نہ ہونے چاہئیں جس سے تعزیراتی قانون کی خلاف ورزی کی حوصلہ افزائی یا مائل بہ خلاف ورزی ہو۔ فرض کیا کہ مسٹر رَسل سٹی کالج میں دو سال تک مسلسل پڑھاتے رہتے ہیں اور اپنے اندازِ فکر کو اس سارے عرصے میں بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ اس کی اشاعت کا بطور خاص اہتمام کرتے رہتے ہیں پھر بھی اُس کی تعیناتی قانون کی گرفت میں آتی ہے کیونکہ خود اُستاد کی شخصیت طالب علموں کی آراء کی تشکیل میں سب سے بڑا عامل ہوتی ہے۔ جس شخص سے ہم نفرت کرتے ہیں اور پھر وہ نالائق بھی ہو۔ وہ تو ہم پر اثر انداز نہیں ہو سکتا اور ایک شخص جسے ہم پسند کریں اور پھر وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک بھی ہو اُسے تو اپنی بات منوانے کی ضرورت ہی نہ ہو گی۔ یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ رَسل ایک غیر معمولی اِنسان ہے اور یہی بات اُسے خطرناک بناتی ہے۔ مسٹر رَسل کا فلسفہ اور اُس کا ماضی کا رویہ ریاست نیویارک کے تعزیراتی قانون سے براہ راست متصادم ہے۔ جب ہمارے سامنے یہ حقیقت آتی ہے کہ اِنسانی ذہن تعلیم دینے والے پروفیسر حضرات کے خیالات اور تعلیمات کے فلسفے سے کتنی جلد اثر پذیر ہوتا ہے تو بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کا عمل بھی ہمارے پیش نظر فوراً آ جاتا ہے کہ اُنہیں اس سے سروکار ہی نہیں ہوتا کہ اُن کے اس عمل سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اُن کے سامنے تو صرف نام و نہاد تعلیمی آزادی کا چیلنج ہوتا ہے وہ اس طرف دھیان ہی نہیں دیتے کہ مسئلے کے کئی اور بھی پہلو ہوتے ہیں جن پر توجہ دینا ضروری ہوتا ہے۔ جہاں تک تعلیمی آزادی کے سوال کا تعلق ہے اس کو معقول سمجھتے ہوئے عدالت نے کبھی مداخلت نہیں کی لیکن وہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی کہ تعلیمی آزادی کے بھیس میں لڑکوں کے اذہان میں ایسے خیالات کو جاگزیں کیا جائے جو تعزیراتی قانون کے تحت ممنوع ہیں لہٰذا یہ تعیناتی پبلک ہیلتھ، سلامتی اور سماجی اِخلاق کو بُری طرح متاثر کرتی ہے۔ اس لیے عدالت کا فرض ہے کہ وہ اس کی روک تھام لے لیے عمل کرے۔ تعلیمی آزادی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ کو محض تعلیم دینے کا لائسنس مل گیا ہے۔ آزادی کا مطلب ہے کہ اچھا عمل کریں اور بُرائی کی تعلیم سے گریز کریں۔ تعلیمی آزادی کا یہ مطلب

ہرگز نہیں ہوسکتا کہ آپ قتل اور غداری کو اچھا قرار دیں۔ نہ ہی براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس بات کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ طالب علموں کے درمیان جنسی فعل سرزد کرنے کی تعلیم دی جائے۔ جہاں لڑکی کی عُمر عام طور پر اٹھارہ سال سے کم ہوتی ہے۔ عدالت اس بات کی مجاز ہے کہ وہ کالج آف دی سٹی آف نیویارک کا جوڈیشنل نوٹس لے کیونکہ وہاں کے بچوں کی عُمر 18 سال سے کم ہے گو کہ اس کا اِمکان ہے کہ کُچھ بچوں کی عُمر اس سے زیادہ بھی ہو۔"

تعلیمی آزادی ہرگز یہ درس نہیں دیتی کہ اغواء آئین کے مطابق ہوتا ہے اور زناء کوئی پُرکشش چیز ہے جو سماج کے لیے مفید ہوتی ہے سچائی کے بھی کُچھ معیار ہوتے ہیں جن پر روایات اور رہن سہن کا طرزِ عمل قائم ہوتا ہے۔ اس کے لیے ہمارے آباؤ اجداد کسوٹی مقرر کر گئے ہیں خود ہماری اعلان آزادی کے افتتاحی الفاظ میں ان کی شناخت ملتی ہے جہاں قدرت کے قوانین اور قدرت کے خدا کا ذکر ہے۔ جو اندازِ فکر وہاں اختیار کیا گیا ہے اُسے آج تک تمام امریکی مقدس سمجھتے آرہے ہیں۔ اُسے نہ صرف یونائیٹڈ سٹیٹس کے آئین میں تحفظ دیا گیا ہے بلکہ دوسری ریاستیں بھی اس کا تحفظ کرتی ہیں۔ جبکہ اِن کے دفاع کے لیے سارے عوام اپنا خون تک دینے کے لیے تیار ہوتے ہیں اور وہ جو خالقِ کائنات نے اِنسان کو حقوق عطا کر رکھے ہیں وہ خود اِنسان کے جزو لاینفک کے طور پر تسلیم کیے جاچکے ہیں۔ لازم ہے کہ اُن کا تحفظ کیا جائے۔ جس شخص کی زندگی اور تعلیمات اس اندازِ فکر سے متصادم ہو جو بدی کی تعلیم دیتا ہو اور خود اس پر عمل کرنے کیساتھ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہو اور جس نے ریاست نیویارک کے تعزیراتی قانون کی دھجیاں بکھیرنے کی قسم کھا رکھی ہو اُسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس سرزمین کے کسی حصے میں بھی کسی بھی سکول میں تعلیم دے۔ ہمارے جمہوری اداروں کے زیرِ اثر حکومت کا شعبہ انصاف ابھی تک مخالفین کی کاوشوں سے اس حد تک ناکارہ نہیں ہوا کہ وہ عوام کے حقوق کے تحفظ کے قابل نہ رہا ہو لہٰذا جہاں پبلک ہیلتھ، سلامتی اور اخلاق کے معاملات ملوث ہوں کوئی بورڈ چاہے وہ اِنتظامی نوعیت کا ہو یا کوئی اور مطلق العنانی کے انداز میں کوئی غیر قانونی اور غیر اخلاقی کاروائی کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا ہے۔ یہ دعویٰ بھی نہیں کرسکتا کہ وہ کسی بھی عدالتی تحقیقات سے مستثناء ہے۔ دی بورڈ آف ہائر ایجوکیشن آف دی سٹی آف نیویارک نے اُستاد کی تعیناتی کرتے وقت دانستہ طور پر تمام اُن ضروری اُصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا جن پر کسی اُستاد کی تقرری ہونی چاہیے۔ یہ نقطہ نظر کہ مسٹر رَسل اپنے فلسفے کی بجائے صرف وہاں ریاضی کی تعلیم دیں گے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اس حقیقت کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اُستاد کی محض وہاں موجودگی طالب علموں کو یہ مستقل ترغیب دیتی رہے گی کہ وہ اس کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھیں اور اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں اور جتنا وہ اُن کے لیے پُرکشش ہوتا جائے گا اور جتنا زیادہ وہ اُس کی موجودگی سے متاثر ہوتے

چلے جائیں گے تو اس کا اثر و رسوخ اُن کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر چھاتا چلا جائے گا اور یوں طالب علم اپنے اُستاد کی تقلید میں ہر طرح بہتے چلے جائیں گے۔"

"اِس عدالت کے دائرہ اختیار کے پیشِ نظر بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کی طرف سے ڈاکٹر رَسل کے جائزے اور تعین کے سلسلے میں عدالت کی کاروائی نُمایاں طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا وہ جو ایسے متنازعہ اقدامات سے متعلق ہے جس میں یہ بذاتِ خود برائی نہیں ہے۔ اس حصے کا تعلق صرف قانون سے ہے گو کہ یہ بہت سے لوگوں کے نزدیک نہایت مکروہ اور گھناؤنا فعل ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جو عدالت کے نزدیک نفرت انگیز ہے۔ ڈاکٹر رَسل اپنی کتاب "تعلیم اور اچھی زندگی" کے صفحہ 211 میں مُشت زنی پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں، "جہاں تک طِفلانہ مُشت زنی کا تعلق ہے بظاہر یہ صحت پر بُرا اثر نہیں ڈالتی اور اس کے کردار پر بھی کوئی قابلِ دریافت بُرا اثر مرتب نہیں ہوتا اور ہاں اگر کوئی بُرے اثرات ظاہر ہوئے ہیں تو وہ اس کی روک تھام کی کوششوں کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ اسلئے چاہے طوعاً و کرہاً ہی سہی اس سلسلے میں بچے کو اکیلا چھوڑ دینا چاہیے اسی میں بہتری ہے" اسی کتاب کے صفحہ 212 میں برہنگی کے بارے میں اُن کا کہنا ہے کہ "ابتداء ہی سے بچے کو اجازت ہونی چاہیے کہ وہ اپنے والدین، بھائیوں بہنوں کو بغیر لباس کی حالت میں دیکھ پائے لیکن ایسا صرف فطری طور پر عام معمول کے مطابق ہونا چاہیے۔ مزید یہ کہ ایسے میں کسی طرح کی غیر معمولی گھبراہٹ یا بدمزگی کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے۔ قصہ مختصر یہ کہ اُسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ برہنگی کے بارے میں کُچھ مخصوص احساسات رکھتے ہیں" اس کے مذہبی و سیاسی نظریات اُس کی زندگی اور اس کا رویہ ان سب کی اشاعت کے بعد پیدا ہونے والی بدنامی عدالت کے نزدیک ایسے امور ہیں جن کی روشنی میں بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کو ڈاکٹر رَسل کا بطور پروفیسر جائزہ لینا ضروری ہے اور ان امور کے حوالے سے بورڈ کا فیصلہ حتمی ہے۔ لیکن اگر ان امور سے متعلق بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کا معیار عمومی شائستگی سے کم تر پایا جائے تو اس کی ذمہ داری اُس پر عائد ہوتی ہے جو کسی ایسے فرد کی تعیناتی کرے جس کا اخلاقی معیار پبلک کی اچھائی کے حوالے سے مناسب نہ ہو مزید یہ کہ اس کی تلافی بھی اُسی کی ذمہ داری ہوگی جبکہ ایسے رویئے کے بارے میں خود عدالت بھی بے اختیار ہے۔ کیونکہ بورڈ کو اس سلسلے میں پہلے ہی سے مکمل اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن جب معاملہ متنازعہ حدود سے نکل کر فوجداری قوانین کی حدود میں داخل ہو جائے تب عدالت کو بھی اختیار ہوتا ہے اور اُس پر عمل کرنا بھی اُس کے فرائض میں شامل ہو جاتا ہے کہ اُس کا تدارک کرئے۔ زناء کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے "ایجوکیشن اور اچھی زندگی" نامی کتاب صفحہ 221 میں ڈاکٹر رَسل کا کہنا ہے "میں یہ نہیں کہتا کہ اپنے ساتھی کیساتھ زندگی بھر کی وفاداری کوئی پسندیدہ فعل ہے یا یہ کہ مستقل شادی کو اس طرح سمجھ لینا چاہیے جیسے اُس میں سے ہر قسم کے عارضی قصے کو خارج کر دیا جائے" یوں

اس سے شاید یہ کہا جائے کہ وہ تو محض سنگین جرم کی بجائے خطا کاری کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ لیکن اس قسم کے اعتدال پسندانہ دلائل کو ایک خاص صورتِ حال میں رکھ کر دیکھنا خاص طور پر اس لیے بھی ضروری ہے کہ جب ہمارا سامنا خود رَسل کے اپنے بیانات سے ہو جن میں اس کی طرف سے ہم جنس پرستی کے مکروہ فعل کا دفاع کیا ہے۔ جبکہ ریاست نیو یارک کے قانون کے مطابق اس کی سزا زیادہ سے زیادہ 20 سال قید ہے۔ اس قسم کے فعل کے بارے میں ''ایجوکیشن اینڈ ماڈرن ورلڈ'' نامی کتاب کے صفحہ نمبر 119 میں اس کا کہنا کہ ''اس کا امکان ہے کہ لڑکوں کیساتھ ہم جنس پرستی کی نوعیت کے تعلقات ضرر رساں ثابت نہ ہوں۔ بشرطیکہ وہ برداشت کر لیے جائیں۔ لیکن اس کا خطرہ موجود رہتا ہے کہ مستقبل میں نارمل جنسی زندگی کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوں۔''

''اگر ڈاکٹر رَسل کے اُصولوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تو نہ صرف طالب علموں کا اخلاق تباہ ہو جائے گا بلکہ اس کا اندازِ فکر ان کو اور بعض حالات میں ان کے والدین کو بھی تعزیراتی قانون سے تصادم کی صورتِ حال میں لا کھڑا کر دے گا۔ اس لیے عدالت کو مداخلت کرنا پڑ رہی ہے۔''

یہ بات تو واضح تھی کہ جج اِس طرح رَسل کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ گویا وہ ہم جنس پرستی جیسے سنگین اور قابل مذمت فعل کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ جبکہ یہ رَسل کے خلاف ایسا بدترین الزام تھا جس کی صفائی کے لیے کسی طرح کے بھی عام الفاظ ناکافی تھے۔ جہاں تک میرے اپنے ذاتی علم کا تعلق ہے رَسل کی اپنی تمام تصانیف میں صرف دو عدد پیراگراف میں ہم جنس پرستی پر بحث کی گئی ہے ایک تو جج خود بیان کر چکا ہے اور دوسرا اس بارے میں ''شادی اور اخلاقیات'' نام کی کتاب کے صفحہ 90 میں اُن کا کہنا ہے کہ ''اگرچہ عورتوں کے درمیان تو نہیں البتہ مردوں کے درمیان ہم جنس پرستی انگلینڈ میں غیر قانونی ہے۔ یہ خاصا مُشکل ہو گا کہ اس سے متعلق ایسی دلیل دی جائے جس سے یہ ایک طرف تو غیر قانونی نہ رہے اور دوسری طرف یہ فحاشی کے زُمرے میں بھی نہ آئے۔ تاہم اس بارے میں ہر اُس شخص کو اچھی طرح سے علم ہے جس نے بھی اس موضوع پر باریک بینی سے مطالعہ کیا ہو کہ یہ قانون بربریت اور جاہلانہ توہم پرستی کے زیرِ اثر وجود میں آیا۔ جس کے خلاف کوئی بھی معقول دلیل کارگر نہیں ہو سکتی'' اس سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ہم جنس پرستی کے خلاف جو مروّجہ قانون موجود ہے رَسل کی رائے مخالفانہ پائی جاتی ہے۔ ابھی حال ہی میں لندن سے یہاں پہنچنے والی خبر سے معلوم ہوا ہے کہ رومن کیتھولک چرچ کی بااثر شخصیات کی طرف سے بھی یہ عندیہ دیا گیا ہے کہ اس قانون کو منسوخ کر دیا جائے۔ اس سے مزید یہ واضح ہوتا ہے کہ رَسل گو کہ اُس قانون کی مخالفت کرتا ہے لیکن کسی کو یہ ترغیب نہیں دے رہا کہ کوئی اس کی خلاف ورزی کرے۔ لیکن جج نے جس پیراگراف کا حوالہ دیا ہے اس میں تو کسی قانون کو تنقید کا نشانہ ہی نہیں بنایا گیا کجا اُس پر یہ اِلزام کہ وہ ہم جنس پرستی کی حوصلہ افزائی

کرتا ہے بلکہ اُلٹا اس نے تو اس کے بُرے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس کو بیسویں صدی کی منطق کہتے ہیں جس کے ذریعے سیاہ کو سفید، امن کو جنگ اور آزادی کو غلامی قرار دیا جاتا ہے۔ جنونیوں کے بارے میں یہ کتنا بڑا سچ ہے کہ وہ آہنی پردے کے دونوں اطراف میں ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں!

یہ کہ رَسل نے نہ تو جج کے حوالہ شدہ پیراگراف میں اور نہ ہی اپنی تصانیف میں کہیں اور زناء کی حوصلہ افزائی کی ہے وہ تو محض یہ کہتا ہے کہ غیر شادی شدہ لوگوں کے درمیان جنسی تعلقات غیر اخلاقی فعل نہیں ہے بشرطیکہ اُن کے درمیان باہمی محبت کے کافی حد تک جذبات پائے جائیں اور یہ کہ یہ اُن کا خالصتاً ایسا نجی فعل ہے جس سے ریاست کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے اور دوسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ شادی سے ماورا جنسی تعلقات خود شادی کے بندھن کو ختم کرنے لے لیے لازمی وجہ قرار دینا درست نہ ہوگا۔ رَسل اِس بارے میں اپنے عام بیانات میں جن خیالات کا اظہار کرتا رہا ہے اور جن کو مگی ہان نہایت احتیاط سے نظر انداز کرتا رہتا ہے وہ قطعی طور پر زناء کی حوصلہ افزائی کے زمرے میں نہیں آتے۔ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ رَسل کی طرف سے ایک ایسی شادی جس میں مکمل برتھ کنٹرول طے کر لیا جائے کی حمایت میں کسی طرح کی زناء کے بارے میں حوصلہ افزائی کا پہلو نکلتا ہے اور وہ تعزیراتی قانون کی زد میں آتا ہے لیکن اس قانون پر تو کبھی عمل ہی نہیں ہوا۔ اس کے متعلق تو ہر شخص کو بخوبی علم ہے شاید اس سے بڑی شہادت تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ جب مگی ہان خود برونکس کونٹی کا ڈسٹرکٹ اٹارنی ہوا کرتا تھا تو یہ قانون وجود میں آیا اور اب تک وہ مردہ حالت میں پڑا ہے اس دوران پے در پے طلاقیں عمل میں آئیں جو محض اس وجہ سے پایہ تکمیل کو نہ پہنچیں کہ اُن کے زناء کے بارے میں کافی شواہد پائے گئے لیکن سرکاری طور پر کسی ایک فریق کے خلاف بھی زناء کا مقدمہ درج نہیں ہوا۔

برہنگی کے بارے میں رَسل کے خیالات کو بذاتِ خود برائی قرار دیتے ہوئے جج نے اُنہیں نفرت انگیز اور مکروہ کہا تھا۔ اس نے رَسل کی ایک ابتدائی کتاب ''ایجوکیشن اور اچھی زندگی'' کا حوالہ دیا جس میں درج ہے کہ بچے کو ابتداء ہی مین اپنے والدین بھائیوں اور بہنوں کو برہنگی کی حالت میں دیکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ لیکن ایسا معمول کی صورتِ حال میں ہونا چاہیے۔ اس میں بدمزگی کا کوئی عنصر شامل نہیں ہونا چاہیے مزید یہ کہ بچے کو یہ بھی قطعی طور پر علم نہیں ہونا چاہیے کہ عام لوگ برہنگی کے بارے میں کچھ مخصوص خیالات رکھتے ہیں۔ اِس حوالے کو بطور شہادت کے پیش کیا گیا تا کہ اگر فلسفے کے لیے ایسے اُستاد کا تقرر کیا گیا تو یہ بہت بڑا غیر شائستہ فعل ہوگا اور سٹی کالج کے لیے کتنی بدنامی کا باعث ہوگا۔ یوں بظاہر مگی ہان یہ اُمید کیے بیٹھا تھا کہ مسٹر گولڈسٹین کی طرف سے رنگا رنگ قسم کی زبان کے استعمال کی وجہ سے جس میں رَسل کو ایک اِنتہائی شہوت پرست اِنسان ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور رَسل خود بھی جیسے کہ خاندان کے اندر برہنہ ناچ کی ترغیب دیتا ہو ثابت ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں جج نے رَسل کی تصنیف میں سے اُس حصے کو بطور خاص

نظر انداز کر دیا جس میں اُن وجوہات کو بیان کیا گیا تھا جس میں اُس کے اِن خیالات کی وضاحت کی گئی تھی۔ حالانکہ اُن پیراگراف میں جنہیں مگی ہان نے حذف کر رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس حصے میں اُس عمل کی مذمت کرتا ہے جس میں اِنسانی جسم کو ہر قیمت پر چھپائے رکھنے کا عزم کر رکھا ہو کیونکہ ''اِس عمل سے بچوں کے اندر پُراسراریت کا احساس جنم لیتا ہے جو آئندہ بڑھتے ہوئے جستجو کی صورت میں جنسی میلان کا رُوپ دھارتے ہوئے غیر معتدل رویوں کا باعث ہوسکتا ہے۔''

جج نے ''شادی اور اخلاقیات'' نامی کتاب میں سے بھی اس قسم کی بحث کو جان بوجھ کر گول کر دیا۔ حالانکہ یہ کتاب گولڈسٹین نے خود بطور شہادت کے رَسل کے خلاف عدالت کو پیش کر رکھی تھی جب کہ اس کو مگی ہان مبینہ طور پر خود پڑھ چکا تھا۔ جس کی رُو سے گولڈسٹین یہ الزام لگا چکا تھا کہ انگلینڈ میں رَسل نے برہنگی کی کوئی کالونی قائم کر رکھی ہے اور شاید اس مفروضے کو کتاب میں درج کچھ بیانات سے اخذ کیا گیا تھا جو کچھ اس طرح ہیں:

''جس موضوع کے حوالے سے برہنگی کا امتناع شائستگی کی راہ میں رکاوٹ ہے خاص طور پر ننھے بچوں کے حوالے سے اکثریت اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ بچوں کے لیے یہ بہتر ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو بغیر لباس کے دیکھیں اور اپنے والدین کو بھی معمول کے انداز میں برہنگی کی حالت میں دیکھ پائیں۔ امکانی طور پر تین سال کی عمر میں بچہ اپنے والد اور والدہ کے درمیان، خود اپنا اور اپنی بہن کے درمیان تمیز کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بچے کی یہ پُرتجسس حالت زیادہ دیر قائم نہیں رہتی اور جلد ہی وہ برہنگی میں دلچسپی لینا چھوڑ کر اچھے لباس میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔ اگر والدین اپنی برہنگی کو بچے سے صیغہ راز میں رکھنے کی کوشش کرتے رہیں گے تب لازم ہے کہ بچہ بھی یہ سمجھنے لگے گا کہ ضرور وہاں کوئی نہ کوئی پُراسراریت موجود ہے اور پھر اس احساس کے زیرِ اثر کھوج کی کیفیت میں نہ صرف مائل بہ جنس ہوگا بلکہ اُس کے کردار اور رویوں میں غیر شائستگی کا عنصر بڑھتا جائے گا اور اس غیر شائستگی کی روک تھام صرف پُراسراریت سے گریز ہی سے ممکن ہوتی ہے۔ برہنگی کے حق میں صحت کے اعتبار سے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر سازگار حالات میں اچھے موسم کے دوران سورج کی کرنوں میں گھر سے باہر برہنہ قیام کے دوران جلد پر بے پناہ خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ اگر کوئی شخص بچوں کو کھلی فضا میں اِدھر اُدھر بھاگتا ہوا غور سے دیکھے تو اُسے یہ حقیقت معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ بچے برہنگی کی حالت میں زیادہ پُراعتماد

دکھائی دیتے ہیں۔ ننگ بدن وہ زیادہ پُر وقار انداز میں اِدھر اُدھر گھومتے ہیں۔ بہ
نسبت اس کے وہ لباس زیب تن کیے ہوں۔ برہنگی کی سب سے معقول اور مناسب
جگہ باہر کھلی فضا میں عام طور پر سورج کی روشنی میں پانی کی قربت ہوتی ہے اور اگر
ہماری روایات ہمیں اجازت دیں تو جب سورج کی کرنیں کھلی اور تازہ ہوا کیساتھ
ہماری جلد پر پڑتی ہیں نہ صرف اُس وقت ہمیں حد سے زیادہ فرحت محسوس ہوگی بلکہ
ہماری صحت پر دُور رَس اچھے اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں اور ساتھ ہی صحت ہی کے
حوالے سے ہماری جسمانی ساخت، ڈیل ڈول اور چہرے کی رونق میں بہتری آتی
ہے وہیں ہمارے ذوقِ جمال میں بھی اضافہ ہوتا ہے اس حوالے سے یونانی بے حد
قابلِ تعریف ہیں۔''

مجھے اعتراف ہے کہ اس موضوع پر مذکورہ بالا متن میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اتنے معقول اور صحت مندانہ ہیں کہ ان سے بہتر کا اپنے تصور میں بھی نہیں لا سکتا۔ جبکہ مگی ہان کا ردِعمل اس صدی کے آغاز میں بے حد مشہور ہونے والے کارٹون کی یاد دلاتا ہے جب ایک جج کا انتھونی کوسٹاک نامی روحانی باپ برہنہ تصویروں اور اِنسانی مجسموں کے خلاف مہم چلا رہا تھا اس کارٹون میں کوسٹاک عدالت میں ایک عورت کو گھسیٹتے ہوئے لا کر کہتا ہے ''مائی لارڈ! اِس عورت نے ایک برہنہ بچے کو جنم دیا ہے۔''

جج مُشت زنی کے موضوع کے بارے میں بھی عین معمول کے مطابق رَسل کے خلاف دودھاری تلوار استعمال کرتے ہوئے اس کی تحریروں کو غلط انداز میں مسخ کر کے پورے متن اور پس منظر سے الگ کر کے پیش کرتا رہا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُس نے اپنے فیصلے میں رَسل کے تحریر کردہ پیراگراف کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے بڑی ڈھٹائی سے بد دیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اصل مطلب کو مسخ کر کے تحریر کیا۔ جج نے اپنے تائیں پوری کوشش کی کہ کسی طرح رَسل کی صورت اس طرح ظاہر ہو جیسے کہ وہ اصل میں مُشت زنی کے عمل کا سرپرست ہو۔ جج نے جس پیراگراف کا حوالہ دیا اُس میں تو اُس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا سوائے اس کے کہ بچے کو مُشت زنی سے باز رکھنے کے لیے دھمکیوں کے استعمال کرنے سے بہتر ہے کہ بچے کو اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ اُسی پیراگراف میں رَسل نے مُشت زنی کو بڑھاوا دینے کی بجائے اُلٹا اس کی روک تھام کے لیے براہ راست ممانعت کی بجائے ایسے طریقہ ہائے کار اختیار کرنے کے لیے تجاویز پیش کیں جن سے اس کا تدارک ہو سکے جہاں تک اس بارے میں رَسل کے حقیقی خیالات کا تعلق ہے بڑے طویل عرصے سے طبی ماہرین کے درمیان زیرِ بحث چلے آ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں دی ریپبلک نے بجا طور پر یہ لکھا کہ جج نے اپنا فیصلہ سُناتے ہوئے ''نفسیاتی، سائنسی اور طبی میدان میں اپنی جہالت اور کم علمی کا بھرپور

دکھائی دیتے ہیں۔ ننگ بدن وہ زیادہ پُر وقار انداز میں اِدھر اُدھر گھومتے ہیں۔ بہ نسبت اس کے وہ لباس زیب تن کیے ہوں۔ برہنگی کی سب سے معقول اور مناسب جگہ باہر کھلی فضا میں عام طور پر سورج کی روشنی میں پانی کی قربت ہوتی ہے اور اگر ہماری روایات ہمیں اجازت دیں تو جب سورج کی کرنیں کھلی اور تازہ ہوا کیساتھ ہماری جلد پر پڑتی ہیں نہ صرف اُس وقت ہمیں حد سے زیادہ فرحت محسوس ہوگی بلکہ ہماری صحت پر دُور رَس اچھے اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں اور ساتھ ہی صحت ہی کے حوالے سے ہماری جسمانی ساخت، ڈیل ڈول اور چہرے کی رونق میں بہتری آتی ہے وہیں ہمارے ذوقِ جمال میں بھی اضافہ ہوتا ہے اس حوالے سے یونانی بے حد قابلِ تعریف ہیں۔"

مجھے اعتراف ہے کہ اس موضوع پر مذکورہ بالا متن میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اتنے معقول اور صحت مندانہ ہیں کہ ان سے بہتر کا اپنے تصور میں بھی نہیں لا سکتا۔ جبکہ نگی ہان کا ردِ عمل اس صدی کے آغاز میں بے حد مشہور ہونے والے کارٹون کی یاد دلاتا ہے جب ایک جج کا انتھونی کوسٹاک نامی روحانی باپ برہنہ تصویروں اور انسانی مجسموں کے خلاف مہم چلا رہا تھا اس کارٹون میں کوسٹاک عدالت میں ایک عورت کو گھسیٹتے ہوئے لا کر کہتا ہے "مائی لارڈ! اِس عورت نے ایک برہنہ بچے کو جنم دیا ہے۔"

جج مُشت زنی کے موضوع کے بارے میں بھی عین معمول کے مطابق رَسل کے خلاف دو دھاری تلوار استعمال کرتے ہوئے اس کی تحریروں کو غلط انداز میں مسخ کرکے پورے متن اور پس منظر سے الگ کر کے پیش کرتا رہا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُس نے اپنے فیصلے میں رَسل کے تحریر کردہ پیراگراف کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے بڑی ڈھٹائی سے بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اصل مطلب کو مسخ کر کے تحریر کیا۔ جج نے اپنے تائیں پوری کوشش کی کہ کسی طرح رَسل کی صورت اس طرح ظاہر ہو جیسے کہ وہ اصل میں مُشت زنی کے عمل کا سرپرست ہو۔ جج نے جس پیراگراف کا حوالہ دیا اُس میں تو اُس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا سوائے اس کے کہ بچے کو مُشت زنی سے باز رکھنے کے لیے دھمکیوں کے استعمال کرنے سے بہتر ہے کہ بچے کو اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ اُسی پیراگراف میں رَسل نے مُشت زنی کو بڑھاوا دینے کی بجائے اُلٹا اس کی روک تھام کے لیے براہ راست ممانعت کی بجائے ایسے طریقہ ہائے کار اختیار کرنے کے لیے تجاویز پیش کیں جن سے اس کا تدارک ہو سکے جہاں تک اس بارے میں رَسل کے حقیقی خیالات کا تعلق ہے بڑے طویل عرصے سے طبی ماہرین کے درمیان زیرِ بحث چلے آرہے ہیں۔ اس سلسلے میں دی ریپبلک نے بجا طور پر یہ لکھا کہ جج نے اپنا فیصلہ سُناتے ہوئے "نفسیاتی، سائنسی اور طبی میدان میں اپنی جہالت اور کم علمی کا بھرپور

مظاہرہ کیا ہے'' چنانچہ اس سے تو شاید یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک کالج پروفیسر کے لیے اپنے مضمون میں مقابلے کا امتحان دینا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ ایک اچھے جج کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُسے طبی نفسیات کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات فراہم کی جائیں صرف یہی نہیں کہ مگی ہان نے رَسل کے مخصوص موضوعات پر اُس کے خیالات کو مسخ کر کے پیش کیا بلکہ اُس کے ارادے کی بدترین خصوصیت یہ تھی کہ کسی طرح رَسل کی طرف سے متنازعہ اخلاقیات پر تنقید کے پورے مقصد کو ہی مسخ کر دیا جائے کوئی بھی شخص مگی ہان کی تمام تر تحریر کے مطالعہ کے باوجود یہ پتہ نہیں چلا سکتا کہ رَسل کی جنسی اخلاقیات پر کتنی گہری نظر تھی۔ مزید یہ کہ اُس کا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ ہر قسم کے اخلاقی بندھنوں کی بیخ کنی کر دی جائے بلکہ اس سلسلے میں اس جذبے کے تحت کام میں مصروف رہا کہ کسی طرح اِنسانی خوشی ورحم دلی پر قائم ایسا ضابطہ طے پا جائے جس سے پوری اِنسانیت فیضیاب ہو۔ رَسل کا تحریر کردہ میں یہاں حوالے کے طور پر ایک پیراگراف پیش کرتا ہوں جو غالباً مگی ہان نے کبھی پڑھنے کی زحمت نہیں کی وہ لکھتے ہیں، ''جس طرح کاروبار، کھیل کے میدان میں یا کسی بھی سائنسی شعبے میں تحقیق ودیگر اِنسانی سرگرمیوں کے سلسلے میں ایک مخصوص ضابطے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح جنس کے میدان میں بھی اخلاقیات کے بارے میں مخصوص ضابطوں کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ لیکن یہ اُس اخلاق اور ضابطے کا پابند بھی نہیں رہ سکتا جو قدیم زمانے میں جُہلاء کے تجویز کردہ اُن پابندیوں پر مُشتمل ہے جو اُن سماجوں پر عائد کی گئی تھیں جو آج کے ہمارے سماج سے بالکل مختلف تھے۔ معاشیات وسیاسیات کی طرح جنس پر اب بھی خوف کی حکمرانی ہے اور جس کو آج کی جدید دریافتوں نے نامعقول قرار دے رکھا ہے اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ قدیم کی طرف سے جدید کی طرف سفر کی اپنی مُشکلات ہوتیں ہیں۔۔۔ جس اخلاقیات کی میں وکالت کرتا ہوں بڑوں اور نوجوانوں کے لیے اس مقولے پر مُشتمل نہیں کہ ''جاؤ اور جو تمہارے دِل میں آئے اپنے مزے کی خاطر کرو'' بلکہ میرے نزدیک زندگی میں استقامت ہونی چاہیے۔ تسلسل کیساتھ ایسی کاوشیں ہونی چاہیں جو ایسے مقاصد کے حصول میں مددگار ہوں جو اگرچہ فوری طور پر سودمند ثابت نہ ہوں اور ہر لحہ پُرکشش نہ بھی معلوم ہوں لیکن دوسروں کے بارے میں بھی غور وفکر ہونا چاہیے اور اخلاقی راست بازی سے متعلق بھی مخصوص معیار ہونے چاہیں''، ''شادی اور اخلاق'' نامی کتاب میں اُس کا کسی جگہ کہنا ہے کہ ''جنسی اخلاقیات کچھ اُن مخصوص اُصولوں کے زیرِ اثر ہی اخذ کرنا پڑے گی جن پر اُن کے نتائج کے اعتبار سے وسیع پیمانے پر اتفاق بھی پایا جاتا ہے اور اختلاف بھی۔ اُن میں سب سے اہم اور پہلی شرط یہ ہے کہ مرد وعورت کے درمیان آپس میں ایسی والہانہ لگن اور محبت ہونی چاہیے جو اُن دونوں کو باہم ملا کر یکجان اور دو قالب کر دے۔۔۔ دوسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ اُن دونوں کے درمیان بچوں کی نفسیاتی اور جسمانی نشوونما کے بارے میں محتاط رویوں پر متفق ہونا ضروری ہے'' حقیقت یہ

ہے کہ رَسل نے نہ تو کبھی ''جنگلی زندگی'' کی وکالت کی ہے اور نہ ہی وہ خاندان کا بطور ادارہ کے دُشمن ہے۔ اس کے نزدیک شادی ''دُنیا میں دو اِنسانوں کے درمیان بہترین اور اہم ترین تعلق ہے جس کی کوئی اور مثال ہو ہی نہیں سکتی'' وہ اپنے اس مؤقف پر بڑی استقامت سے قائم رہتے ہوئے کہتا ہے کہ ''یہ ادارہ دو اِنسانوں کے درمیاں باہمی تعلق اور فرحت انگیزی سے زیادہ سنجیدہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ اسی کے ذریعے سے بچوں کی پیدائش معرضِ وجود میں آتی ہے اور اسی سے ہی سماج کا پورا تانا بانا بُنا ہوتا ہے لہٰذا اس کی اہمیت میاں بیوی کے باہمی احساسات سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ ایسے خیالات کو کسی بھی حوالے سے خطرناک قرار دیا جا سکے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اخلاق کے نام نہاد علمبردار مگی ہان اور اس کے ساتھیوں کو سٹی کالج کے اُن طلباء کی معصومیت اور راست بازی کے بارے میں کسی بھی قسم کی فکر لاحق نہ تھی چاہے اُن بچوں کی عُمر اٹھارہ سال سے کم تھی یا زیادہ کیونکہ اُن کے لیے یہ معلوم کرنا کوئی مُشکل کام نہ تھا کہ آیا سٹی کالج میں رَسل کی موجودگی کسی طرح کے اغواء یا ڈسپلن کا عدم موجودگی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اُنہیں معلوم تھا کہ رَسل کی زیادہ تر زندگی انگلینڈ، چین اور امریکا میں تعلیم دیتے ہوئے گذری ہے وہ جن اداروں میں بھی تعلیم دے چکے تھے اُن سب کے سربراہوں، وہاں کے اساتذہ اور خود اُن طلباء سے بھی معلومات حاصل کر سکتے تھے جو اُس کے زیرِ تعلیم رہ چکے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں ہر قسم کی رپورٹیں دستیاب تھیں۔ کیونکہ ہر رپورٹ میں رَسل کی صرف تعریف ہی موجود تھی لہٰذا خود جج کو ان سے کوئی سروکار نہ تھا اُسے تو ایسی رپورٹ کی ضرورت تھی جو اس کو بد کردار ثابت کرے۔ لیکن چونکہ ایسی کوئی رپورٹ موجود نہ تھی تو اُس نے بھی کسی بھی رپورٹ کو حاصل کرنے میں دلچسپی نہیں لی صورتِ حال اُس وقت یہ تھی کہ ممتاز دانشوروں، ادیبوں، طالب علموں اور ملک کے تمام تعلیمی اداروں، ایسوسی ایشنز کی طرف سے رَسل کے حق میں آوازیں بُلند ہو رہیں تھیں۔ سمتھ کالج کے صدر نے ایک بیان جاری کیا جس میں یہ کہا گیا کہ ''مسٹر رَسل نے اپنے لیکچروں کے دوران ایسے متنازعہ مسائل پر کبھی گفتگو نہیں کی جن کو اُن کے مخالفین اُچھال رہے ہیں۔۔۔ مسٹر رَسل اول و آخر ایک فلسفی ہیں اور تعلیم دینے کے دوران یہ حقیقت ہمیشہ اُن کے پیشِ نظر رہتی تھی۔ مجھے خود زندگی بھر رَسل کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو پایا تھا کہ اُن کے شادی بیاہ، طلاق، خدا کو ماننے یا اُس کے نہ ماننے کے بارے میں کیا آراء ہیں اگر موجود ہنگامہ آرائی یا شور و غوغا نہ ہوتا اور یوں مجھے صرف اخبارات کے ذریعے سے ہی معلوم ہو پایا ہے'' واضع رہے کہ مذکورہ خاتون برٹش انسٹیٹیوٹ آف فلاسفیکل سٹڈیز میں رَسل کی دو دفعہ اپنے کورس کی تکمیل کے لیے زیرِ تعلیم رہ چکی تھی۔ اس قسم کی تصدیق کئی اطراف سے ہو چکی تھی۔ لیکن اگر یہ کہا جائے تو بالکل بجا ہو گا کہ جج کی نگاہیں حقائق پر بھی نہ تھیں۔

VI

فیصلہ توقعات کے عین مطابق آیا جس سے رَسل کے حامیوں کو تو بڑی مایوسی ہوئی لیکن اپوزیشن بہت خوش۔ اَب رَسل کے حامیوں کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بورڈ آف ہائر ایجوکیشن پر اتنا سیاسی دباؤ آ جائے کہ وہ اس فیصلے کے خلاف اعلیٰ عدالت میں اپیل داخل کرنے میں ناکام رہے۔ یہ تشویش بعد میں پیش آنے والے واقعات نے ثابت کر دیا کہ بلا جواز تھی۔ دی نیشنل کونسل آف دی امریکن ایسوسی ایشن کی یونیورسٹی کے پروفیسروں نے شکاگو میں منعقدہ ایک اجلاس میں ایک مُتفقہ قرارداد پاس کی جس کے ذریعے میئر لاگارڈیا اور بورڈ پر زور دیا گیا کہ اس فیصلے کے خلاف جدوجہد جاری رکھیں۔ امریکن ایسوسی ایشن آف سائنٹیفک ورکرز اور دی پبلک ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے علاوہ دیگر اداروں کی طرف سے بھی یہی مطالبہ کیا گیا۔ چنانچہ برٹرینڈ رَسل کی شخصیت امریکا میں تعلیمی آزادی کی علامت کی صورت اختیار کر گئی اُنہیں کے نام کی ایک سپیشل تعلیمی آزادی کے لیے کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے سربراہ کولمبیا کے مونٹیگ اور پروفیسر جان ہرمین رینڈل جونیئر سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس کے فوراً بعد نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کی ساتھ رُکنی کمیٹی نے مالی مدد فراہم کرنے کیساتھ رَسل کے لیے اُس کی طرف سے اخلاقی مسائل پر دانشورانہ مؤقف رکھنے پر تعریفی کلمات بھی اُرسال کیے۔ اس کے علاوہ کمیٹی فار کلچرل فریڈم نے میئر لاگارڈیا کو ایک ٹیلی گرام ارسال کیا جس میں کہا گیا کہ مگی ہان نے اپنا فیصلہ اس انداز میں لکھا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے جیسے مسٹر رَسل کوئی بدچلن، بدکردار اور بدمعاش قسم کا اِنسان ہے، ہم اس پر احتجاج بھی کرتے ہیں اور اس کی تردید کے لیے اُن تمام یونیورسٹیوں کی طرف سے تصدیق شدہ دستاویزات بھی ارسال کر رہے ہیں جن میں برٹرینڈ رَسل تعلیم دیتے رہے ہیں۔

امریکن کمیٹی فار ڈیموکریسی اینڈ اِنٹلیکچوئل فریڈم کے تحت ایک احتجاجی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں کولمبیا اور نیویارک کے ممتاز پروفیسروں نے خطاب کرتے ہوئے مگی ہان کے فیصلے کی بھرپور مذمت کی گئی۔ خود سٹی کالج آف نیویارک (جس کے طالب علم بقول مگی ہان قدرے کرپٹ تھے اور جن کو رسل صحت اور اخلاق کے اعتبار سے اپنی تعلیم کے ذریعے مزید کرپٹ بنانے والا تھا) کے گریٹ ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں ایک اور اہم کالج کی طرف سے پیغام پڑھ کر سُنایا گیا کہ جج اور بشپ کی طرف سے وسیع پیمانے پر اشاعت کی گئی ''یہ حقیقت ہے کہ انگلینڈ کی طرف سے علم کے اعتبار سے وقت کی اہم شخصیت ہمیں اُدھار کے طور پر دی گئی ہے''، ہم تنبیہ کرتے ہیں کہ جنس کے بارے میں فضول انٹ شنٹ باتیں کرنے والوں کو ''ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ہمیں برٹرینڈ رَسل جیسی اعلیٰ پایہ کی شخصیت کی خدمات سے محروم کر دیں'' پروفیسر بَرائی سن نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''سرکاری سرپرستی میں چلنے

والوں کو اگر وہ آزادی حاصل نہیں جو دوسروں کو حاصل ہے تب ہماری دانشورانہ ترقی کے لیے وہ جتنا بھی اہم کردار ادا کر رہے ہوں اُن کا مستقبل تاریک ہی رہے گا'' لیکن یہ آخری بات اپنے آپ میں کتنی ہی قدر و قیمت رکھتی ہو جج مگی ہان جیسے لوگوں کے لیے کوئی وقعت نہیں رکھتی وہ بھی اپنی دُھن کے پکے تھے رُجعت پسندی وقدامت پسندی اُن کی گُھٹی میں پڑی ہوئی تھیں۔

چونکہ رجعت پسندوں کے نقطہ نظر سے اس سارے معاملے سے بہت عرصہ قبل ہی سٹی کالج پر کرپشن کا راج تھا اسلیئے کالج کے تمام ڈائریکٹر حضرات نے اپنے ایک اجلاس میں متفقہ ووٹ کے ذریعے فیصلے کے خلاف اپیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُن 18 اراکین میں سے ایک سپریم کورٹ کے جج بھی تھے۔ جنہیں شاید رجعت پسند اپنی تعلیمات سے فیضیاب کرنے میں ناکام رہے تھے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمام جج تعزیراتی قانون کے بارے میں اُتنا گہرا ادراک نہیں رکھتے تھے جتنا کے خود مگی ہان کیونکہ اُس کے فوری بعد جو کچھ کیلیفورنیا میں ہوا اُس سے تو یہ پوری طرح عیاں ہو گیا۔ چنانچہ 30 اپریل کو لاس اینجلس میں ایک وزیر نے عدالت میں برٹرینڈ رَسل کے خلاف الزام لگاتے ہوئے اُس کے اندازِ فکر کو امریکی اخلاق اور مذہب کو جڑ سے اُکھاڑ باہر پھینکنے کے مترادف قرار دیا اور اِستدعا کی کہ اُسے کیلیفورنیا یونیورسٹی سے برطرف کیا جائے لیکن نیویارک کی عدالت کے رویئے کے برعکس کیلیفورنیا میں اُس رِٹ کو فوراً خارج کر دیا گیا۔

VII

یہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ رَسل کے مخالفین مگی ہان کے فیصلے کو ایک عظیم کارنامہ قرار دیتے تھے۔ اب جج دائیں بازو کے جرائد میں اپنی حمد وثناء کا مرکز بن چُکا تھا۔ ایک ہفتہ واردی جیسیوٹ امریکا کے مطابق 'وہ صرف امریکی نہیں بلکہ پکا امریکی مردِ میدان ہے اس سے بھی بڑھ کر وہ ایک خالص اور قابلِ احترام قانون دان ہے اور درجہ بندی کے اعتبار سے وہ ایک اعلیٰ پایہ کا ایسا شخص ہے جسے قانون پر اتھارٹی حاصل ہو مذہب اُس کے دِل ودماغ میں روح تک میں سمایا ہوا ہے وہ چھ فُٹ قد کا سخن فہمی اور رحم دلی کا مجسمہ ہے۔ اس کی خوبیاں یہیں پر ختم نہیں ہوتیں جیسے کہ رَسل نے الزام لگایا تھا کہ یہ جج ایک بہت بڑا جاہل شخص ہے' سچ پر مبنی نہیں بلکہ وہ تو اول درجے کا دانش ور ہے۔ علم ودانش اور تیز فہمی اس کا طرہ امتیاز ہے وہ ہُومر کو اُس کی اصل شکل یونانی میں مطالعہ کرتا ہے ہورس اور سِسرو سے لاطینی میں لُطف اندوز ہوا کرتا ہے، چنانچہ اس آواز کیساتھ بے شمار آوازوں نے مل کر ایک ہی سُرتال کیساتھ ایک ہی طرح کا اس کی تعریف میں نغمہ گانا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں کیتھولک ٹیچرز ایسوسی ایشن کے صدر نے مگی ہان کے فیصلے کو ''قانون اور انصاف کی تاریخ میں ایک رزمیہ باب'' قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''یہ اخلاق، شائستگی اور حقیقی تعلیمی آزادی کی فتح

ہے''، دی ٹیبلٹ نے رَسل کی تعیناتی کے ذمہ داروں کے خلاف تحقیقات کا مطالبہ کرتے ہوئے مگی ہان کے فیصلے کو'' لائق تحسین، سادگی اور اخلاص کا نمونہ قرار دیا۔''

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ اب رَسل اکیلا خطا کار نہیں رہ گیا تھا جسے سزا دی جاتی بلکہ بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کے ارکان کی اکثریت اس الزام میں برابر کی شریک تھی لٰہذا اس کے خلاف بھی کاروائی بہت ضروری تھی۔ چنانچہ نیویارک سٹیٹ ایجوکیشن کونسل کے تحت ایک اجلاس منعقد ہوا (یہ کونسل میرے خیال میں یونائیٹڈ سٹیٹس کی ریاستوں میں سے دائیں بازو کی پاگل پن کی حد تک حاشیہ بردار تھی) جس میں پروفیسر جان ڈیوی اور مسز فرینکلن ڈی روز ویلٹ کی طرف سے صبر، حوصلہ اور بُردباری کی تلقین کو شدید مذمت کا نشانہ بناتے ہوئے اُن کی طرف سے کمزوری کی علامت قرار دیا۔ اُسی اجلاس میں چیئرمین آف دی نیشنل کمیٹی فار ریلیجیئس ریکوری لیمبر ڈ فیر چائلڈ نے بورڈ کے اُن اکثریتی ارکان کی سخت الفاظ میں مذمت کی جو اُس تعیناتی کے ذمہ دار تھے اور اُنہیں ''مُرتد یہودی اور منحرف مسیحی'' قرار دیا اور اس مطالبے پر زور دیا کہ انہیں برطرف کر کے ایسے اشخاص کو مقرر کیا جائے جو اب بھی اپنے ملک اور مذہب پر یقین رکھتے ہیں۔ چارلس ای کیگن جو اپنے مزاج میں تو خاصا دھیما تھا لیکن وہ بہت پہلے ہی رَسل کو 'کتا' اور 'آوارہ گرد' قرار دے چکا تھا اب اس مسئلے کو سٹی کونسل میں اُٹھاتے ہوئے رَسل کو ایسے ففتھ کالمسٹ سے تشبیہہ دی جس نے نازیوں کی فتوحات میں مدد کی ہو جبکہ اب وہ ''پکا کمیونسٹ'' ہے اُس نے زور دیکر مطالبہ کیا کہ اُن لوگوں کو جو کالج فیکلٹی میں اُسے جگہ دینے پر اصرار کرتے رہے برطرف کیا جائے۔ اس نے کونسل میں ایک قرارداد پیش کی جس میں میئر سے مطالبہ کیا گیا کہ بورڈ کو اس صورت میں تسلیم کرے جس میں نئے سرے سے ایسے لوگ مقرر ہوں جن سے شہر کی زیادہ بہتر انداز میں خدمت کی توقع کی جا سکے یہ قرارداد 5 کے مقابلے میں 14 ووٹوں سے منظور کر لی گئی۔ لیکن یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ میئر کو بورڈ کے ممبران کو برطرف کرنے کا اختیار حاصل ہی نہیں تھا۔ لٰہذا اس قرارداد کی حیثیت محض ایک علامت کی سی رہ گئی۔

رَسل کی تعیناتی کی روک تھام کرنے اور بورڈ کے اُن ارکان کو جنہوں نے اُس کی حمایت کی تھی نکال باہر کرنا ہی کافی نہ تھا بلکہ عام پبلک کو یہ بتانا بھی ضروری تھا کہ آزادی کی سچی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس کے متعلق بہت سے امریکی غلط فہمی میں مبتلاء تھے۔ اس کی غالباً بڑی وجہ جیفرسن اور تھامس پائین کے پھیلائے ہوئے مُلحدانہ واہمے تھے۔ اسلئے مگی ہان اور مُولسیئے کے خیالات کو عام کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں مونسیگنور فرانس ڈبلیو والش نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ ہوٹل آسٹور میں نیویارک پوسٹ آفس ہولی نیم سوسائٹی کے تحت ناشتے کے وقت ایک دُعائیہ تقریب میں سٹیج پر سے مائیک پکڑ کر عدالت کے عظیم فیصلے کا سرسری تعارف کروایا اور اُس کے بعد تقریب کے آخر میں ایک نہایت ہی غلیظ لفظ'' آزادی'' پر

اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا چونکہ بنی نوع انسان خدا کے قانون فطرت اور موسیٰ کے وضع کئے ہوئے دس احکام کی تابعداری میں ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ تب ہمارے اپنے امریکا میں کسی کو آزادی کے نام پر خدا کے قانون کا مذاق اُڑانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ آزادی کے پلیٹ فارم پر آکر خود آزادی کی پشت پر چھرا گھونپے جیسے کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اس کا اطلاق جہاں کمیونسٹوں اور اُن کے ہمراہ آنے والے ساتھیوں پر ہوتا ہے۔ وہیں اس کا نازیوں، فاشسٹوں اور اُن لوگوں پر بھی ہوتا ہے جو ریاست کے قانون کو خدا کے قانون سے برتر ٹھہراتے ہیں۔ مزید یہ کہ کالج پروفیسروں، پبلشروں، کتابوں اور ہر اس شخص پر ہوتا ہے جو یونائیٹڈ سٹیٹس کی علاقائی حدود کے اندر آتے ہیں'' آزادی کو بدی قرار دینے میں جس مہارت کا مظاہرہ مسٹر والش نے کیا یہ اُنہیں کا حصہ ہے اس پر اُنہیں بجا طور پر ماہر ہونے کا اعزاز حاصل رہے گا۔''

VIII

دی نیویارک ٹائمز کا اس معاملے میں کردار ایسا تھا کہ اگر اس کا ذکر نہ کیا جائے تو یہ کہانی نامکمل رہ جاتی جب تک اس معاملے میں مذہبی گروپ ملوث نہیں ہوئے تھے اخبار عام طور پر اختیارات کے بے جا استعمال پر اکثر اپنے ردِعمل کا اظہار کر دیا کرتا تھا۔ رَسل کے کیس میں اس کی رپورٹیں بڑی معقول اور جامع ہوا کرتی تھیں تاہم مارچ کے پورے مہینے کے دوران جب رَسل اور بورڈ کے ارکان کو بے جا انتہائی مہلک تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا تھا دی ٹائمز نے مکمل خاموشی اختیار کئے رکھی۔ مگی ہان کی طرف سے کیس کا فیصلہ آنے کے تین ہفتے بعد تک بھی اُس کے اداریئے میں ایک حرف بھی بطور تبصرہ نہ لکھا گیا۔ بلاآخر 2 اپریل کو نیویارک یونیورسٹی کے چانسلر کی طرف سے لکھا گیا ایک خط شائع ہوا جس میں مگی ہان کی کاروائی میں کچھ پیچیدگیوں کا ذکر تھا جن کے بارے میں اُن کا کہنا تھا ''جہاں تک میں جانتا ہوں اب تک اعلیٰ تعلیم کی تاریخ میں اصل نوعیت کا سوال کبھی اُٹھایا ہی نہیں گیا۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ کھٹکنے والی بات یہ ہے کہ کوئی ایسا تعلیمی ادارہ جو مکمل یا جزوی طور پر سرکاری طور پر چل رہا ہو موجودہ ٹیکس دہندگان کی طرف سے مقدمے کے پیشِ نظر محض ایک شخص کی رائے کی بنیاد پر اساتذہ کی تعیناتی منسوخ ہو سکتی ہے یوں اگر عدالت کے دائرہ اختیار کو تسلیم کر لیا جائے۔ تب پھر یہ یونائیٹڈ سٹیٹس کے ہر سرکاری کالج اور یونیورسٹی کے اُستاد کی دانش ورانہ آزادی و خود مختاری پر ضرب کاری ہوگی جس کے بے انداز تباہ کُن نتائج برآمد ہونگے۔''

اس کے بعد ہی دی ٹائمز کو بھی کچھ حوصلہ ہوا کہ وہ بھی اپنے اداریئے میں اس موضوع پر اپنے مؤقف کا اظہار کرے چنانچہ اپنے عمومی قسم کے تبصروں سے جن میں بدقسمتی پر مبنی اُس متنازعہ بحث کے اثرات پر افسوس کا اظہار کیا گیا جو ملک کے چاروں اطراف میں چھڑ چکی تھی۔ دی ٹائمز نے برٹرینڈ رَسل کی تعیناتی کے تنازعہ کے بارے میں لکھا کہ ''اس سے ہمارے سماج کو بہت زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔ ہماری

سوسائٹی میں ایسے تلخ احساسات نے جنم لیا ہے جن کے اثرات کا ہمارا ملک متحمل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جمہوریت کو جس کا ہم سب حصہ ہیں ہر طرف سے خطرات نے گھیر لیا ہے'' اپنے اداریئے میں غیر جانبداری کا رویہ ظاہر کرتے ہوئے اخبار لکھتا ہے کہ ''اس معاملے میں ملوث تمام فریقین کی طرف سے غلطیوں نے ہمیں اِس نہج پر پہنچا دیا ہے۔ شروعات ہی میں برٹرینڈ رَسل کی تعیناتی غیر متوازن اور غیر دانشمندانہ تھی۔ برٹرینڈ رَسل کا علمی پایہ کا معیار ہونا اور بطور اُستاد کے اہلیت رکھنے سے قطع نظر یہ حقیقت پیش نظر رکھنا زیادہ ضروری تھا کہ اُس کی طرف سے بہت سے مواقع پر جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا سماج کا بہت بڑا حصہ اُس کی تعیناتی پر مشتعل ضرور ہوگا'' ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اُس کی تعیناتی متوازن تھی یا غیر متوازن اس سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ آیا اُستاد اُس علم اور اہلیت پر پورا اُترتا ہے یا نہیں۔ یہ ایک لبرل اخبار کا عجیب وغریب اور انوکھا اندازِ فکر تھا۔

جہاں تک مگی ہان کے فیصلے کا تعلق ہے ''دی ٹائمز'' اِس کے متعلق صرف اُسے ''خطرناک حد تک بھونڈا'' ہی قرار دے سکا۔ اُس نے نہ تو جج کے متعلق کچھ کہا اور نہ ہی اُسے میئر کی طرف سے بزدلی کا مظاہرہ نظر آیا۔ اُس کی ناپسندیدگی تو محض اُس بیچارے رَسل ہی کے لیے تھی جو خود اُس یلغار کا نشانہ تھا۔ ''دی ٹائمز'' کا کہنا تھا کہ ''مسٹر رَسل کو فوراً اُسی وقت بذاتِ خود اُس تعیناتی سے دستبردار ہو جانا چاہیے تھا جب اُس کے ضرر رساں اثرات ظاہر ہونا شروع ہوگئے'' جس کے جواب میں رَسل کا ایک خط 26 اپریل کو شائع ہوا۔

> ''میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنے اُن حوالہ جات پر تبصرہ کرنے کی اجازت دیں گے۔ جب نیویارک سٹی کالج میں میری تعیناتی پر تنازعہ کھڑا ہو گیا تب آپ کی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ جُونہی اُس کے ضرر رساں اثرات ظاہر ہونے لگے تھے تو مجھے فوراً اپنی تعیناتی سے دستبردار ہو جانا چاہیے تھا۔''

''ایک لحاظ سے یہ فیصلہ انتہائی دانشمندانہ ہوتا جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے یہ میرے اپنے حق میں نہ صرف دوراندیشی پر مبنی ہوتا بلکہ خود میرے اپنے لیے بھی بے حد خوشگوار ہوتا اگر خود میں نے اپنے ذاتی مفاد اور میلان کے بارے میں سوچا ہوتا تو مجھے واقعی فوراً ریٹائرڈ ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن میرے ذاتی نقطہ نظر کے حوالے سے چاہے یہ کتنا ہی دانشمندانہ ہوتا۔ لیکن میرے ضمیر کے مطابق میری دستبرداری بزدلی اور خود غرضی کے مترادف ہوتی۔ بے شمار ایسے لوگ موجود ہیں جنہیں احساس ہے کہ اُن کی اپنی دلچسپیاں رواداری کے اصول آزادی اظہار داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔ وہ ابتداء ہی سے اس تشویش میں مبتلاء تھے کہ اس بحث و مباحثہ کو جاری رہنا چاہیے۔ اگر میں دستبردار ہو گیا ہوتا تو جہاں یہ میرا فعل اُن کو اُن کے جائز مقاصد سے محروم کرنے کے مترادف ہوتا بلکہ میری طرف سے ایسے مخالفین کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہوتا جو اپنی

طاقت اور اکثریت کے بل پر کسی بھی سرکاری عہدے پر فائز شخص کو اُن خیالات کی بنا پر جو اُن کے نزدیک ناگوار ہوں نکال باہر کریں جو میرے نزدیک انتہائی غیر اخلاقی ہے۔''

''یہ میرے دادا ہی تھے جو سٹیٹ اینڈ کارپوریشن ایکٹ کی منسوخی کا باعث بنے جس کے تحت کوئی بھی ایسا شخص جو چرچ آف انگلینڈ کا رُکن نہ ہو کسی بھی سرکاری عہدے کے لیے نااہل قرار پایا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ خود اس کے ایک رُکن تھے مجھے خود یہ اچھی طرح یاد ہے کہ میری زندگی کے ابتدائی ایام میں میتھوڈسٹ اور اور ویزلیان فرقوں کے لوگوں کی تقرری کے بعد مذکورہ قانون کی منسوخی کی پچاسویں سالگرہ پر وہ لوگ کھڑکی سے باہر ہاتھ ہلا ہلا کر منا رہے تھے اگرچہ اس قانون کے ذریعے خود کیتھولک لوگ جو اس وقت سب سے بڑی اکثریت تھے بُری طرح متاثر ہوئے۔''

''میرا نہیں خیال کہ عمومی معاملات میں متنازعہ بحث مباحثہ کوئی بُری بات ہے کُھلے عام اختلافات اور عام مباحثہ جمہوریت کے لیے خطرہ نہیں ہوتے اس کے برعکس یہ خود جمہوریت کی بقاء کے ضامن ہوتے ہیں بلکہ یہ جمہوریت کے ایسے عناصر ہیں جو اکثریت کو ایسے گروپوں سے اختلاف کو برداشت کرنے کا حوصلہ دیتے ہیں جو تعداد کے اعتبار سے کتنے ہی قلیل کیوں نہ ہوں اور چاہے اُن کے جذبات اکثریت کے لیے کتنے ہی اشتعال انگیز کیوں نہ ہوں''

لہٰذا ایک جمہوریت میں یہ ضروری ہے کہ لوگ انتہائی اشتعال انگیز جذبات پر مبنی گفتگو کو بھی صبر و تحمل سے سُننے کا حوصلہ پیدا کرنا سیکھیں۔

20 اپریل کے اداریئے کے اختتام پر دی ٹائمز نے چانسلر چیڈ کی حمایت کرتے ہوئے اس کے اس مؤقف کی تائید اس امید پر کی کہ مگی ہان کے فیصلے پر اعلیٰ عدالت ضرور نظر ثانی کرے گی۔ لیکن جب بعد میں میٹر لاگارڈیا اور خود جج کی ملی بھگت کی بدولت بڑی ہنرمندی سے نظرِ ثانی رُکوا دی گئی تو مذکورہ اخبار نے بطور احتجاج ایک لفظ بھی نہ لکھا۔ اس کیس کے بارے میں دُنیا کے سب سے بڑے اخبار کا یہ حال تھا۔ میرے نزدیک یہ تحریر کرنا اس لیے ضروری تھا تاکہ ریکارڈ دُرست رہے۔

IX

جب مگی ہان کا فیصلہ عام پبلک کے لیے اشاعت پذیر ہوا تو رَسل کے مخالفین کو یہ فکر لاحق ہو گئی کہیں اعلیٰ عدالتوں میں یہ مسترد نہ ہو جائے۔ چنانچہ اینڈ ریمن لیمبرٹ نے اس فیصلے کو 'شائستہ قوتوں کی عظیم فتح' قرار دیتے ہوئے جہاں اپنی طرف سے بے حد خوشی کا اظہار کیا وہیں یہ بھی کہا کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی اور عدلیہ کی خودمختاری کے لیے عزت و احترام کا اظہار کرتے ہوئے اپیل کی کہ 'شائستہ اور نفیس لوگوں کا فرض ہے کہ وہ متحد رہیں تاکہ کسی عدالت کو اس فیصلے کی ہیت بدلنے کی جرأت نہ ہو سکے۔'

ایلڈرمین کے تفکرات قطعی طور پر غیر ضروری تھے۔ میئر لاگارڈیا نے اپنے سٹی کونسل کے کئی ممبران سے مِل کر جوڑ توڑ اور کاغذی کاروائیوں میں مصروف ہو کر رات دِن ایک کر دیئے تاکہ اس اَمر کو یقینی بنایا جاسکے کہ اگر دوسری عدالتوں نے مگی ہان کے فیصلے کے خلاف شنوائی شروع بھی کر دی تو ایسا بندوبست پہلے سے ہی کر لیا جائے کہ رَسل اپنے عہدے پر کسی صورت بحال نہ ہو سکے۔ میئر نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نہایت رازداری سے بجٹ میں سے اُس رقم کو ہی خارج کر دیا جو رَسل کو امکانی طور پر اُس کی تعیناتی کے بعد ملا کرتی۔ چنانچہ جب اُس نے انتظامی بجٹ کا اعلان کیا تو اس بارے میں ایک لفظ بھی کہنے سے گریز کیا۔ لیکن جب اس سلسلے میں سوال ہوا تو اُس نے بڑی منافقت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا ''ایسا خالی آسامیوں کو خارج کرنے کی پالیسی کے تحت کیا گیا ہے'' اس پر سوِل لبرٹی یونین کے ڈائریکٹر روجر بالڈوِن نے فوری طور پر میئر کو ایک ٹیلی گرام ارسال کیا جس میں ہر اُس شخص کے خیالات کی ترجمانی کی گئی تھی جو اس کیس کا گہری نظر سے جائزہ لے رہا تھا۔ اُس میں کہا گیا تھا کہ '' آپ کی کاروائی بورڈ آف ہائر ایجوکیشن کی کاروائی کی نفی کرتی ہے جو کہ جسٹس مگی ہان کے اپنے تعصبات سے بھرپور فیصلے سے بھی زیادہ قابلِ مزمت معلوم ہوتی ہے'' حقیقت یہ ہے کہ میئر کی یہ حرکت تاریخی طور پر بے مثال تھی۔ ماہرین کی رائے کے مطابق اُس کی کاروائی کی پشت پر نہ تو کوئی قانونی قوت تھی اور نہ ہی اس کا کوئی اخلاقی جواز کیونکہ سکول کا اپنا بجٹ تھا اور بورڈ آف ایجوکیشن اُسے آزادانہ طور پر خرچ کرنے کا مجاز تھا اور وہی اُس کو کنٹرول کیا کرتا تھا لہٰذا میئر کا اس سلسلے میں کوئی عمل دخل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اتنا ہی کافی نہ تھا کہ بجٹ میں سے رَسل کی آسامی کے لیے مختص رقم کو خارج کر دیا جائے بلکہ اس کا بندوبست کرنا بھی ضروری تھا کہ رَسل کسی اور عہدے پر فائز نہ ہو سکے۔ اس لیے اُن تمام راستوں کو بھی بند کرنا لازم تھا جہاں سے بھی رَسل کا داخلہ ممکن ہو سکتا تھا۔ چنانچہ بورڈ آف مینجمنٹ کے اجلاس میں اگلے بجٹ کے لیے ایک قرارداد کے ذریعے بطور خاص یہ اہتمام کیا گیا کہ '' بجٹ میں کسی بھی رقم کو برٹرینڈ رَسل کی ملازمت میں کسی طور خرچ نہ ہوگی۔''

اِن مذکورہ اِقدامات نے رَسل کی حقیقی بحالی کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا تاہم بطور اصول کے بورڈ آف ہائر ایجوکیشن نے معاملے کو اعلیٰ عدالتوں سے رجوع کرنے کا فیصلہ کر لیا اس مرحلے پر بورڈ کے وکیل نے مزید آگے اپیل کرنے سے معذرت کر لی تاہم بورڈ سے اس بات پر اِتفاق کیا کہ مگی ہان کا فیصلہ کسی بھی ٹھوس بنیاد پر قائم نہیں بلکہ اُس نے بورڈ کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اس فیصلے کو نظر انداز کرتے ہوئے آئندہ کوئی بھی تعیناتی اپنی مرضی سے کرنے کا مجاز ہے یہ بھی سفارش کی کہ اس کیس کی مزید پیروی نہ کی جائے کیونکہ اس سے مذہبی بحث مباحثہ مزید تیز ہو جانے کا خدشہ پایا جاتا ہے جس سے متاثر ہو کر اعلیٰ عدالتیں بھی دباؤ کا شکار

ہو کر اس فیصلے کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔ اُسی وقت میئر کی طرف سے بورڈ کے وکیل کی مزید کاروائی سے انکار کا خیر مقدم کیا گیا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ وہ اِس سے مزید شیر ہو گیا۔

چنانچہ بورڈ کی اکثریتی رائے کے پیشِ نظر مسٹر بکنر کو وکیل مقرر کیا گیا جس نے رضا کارانہ طور پر کیس لڑنے کا فیصلہ کیا مسٹر بکنر نیویارک کے جنوبی ضلع میں سابق اٹارنی رہ چکے تھے اور اب اُن کی مدد کے طور پر ایک دوسرے وکیل مسٹر جان ایچ ہارلان بھی موجود تھے۔ چنانچہ ماضی کی بہت سی مثالوں کو بنیاد بنا کر مسٹر ہارلان نے جج مگی ہان کو درخواست دی کہ چونکہ بورڈ کے سابق وکیل نے مقدمے کی پیروی سے معذرت کر لی ہے چونکہ اس سے قبل کوئی رسمی جواب داخل نہیں ہو سکا اس لیے اُسے حق حاصل ہے کہ وہ اس کی دوبارہ سماعت کروائے۔ میرے خیال کو بھی قاری یہ معلوم کر کے حیرت زدہ نہ ہو گا جو اُس مقدس مجاہد کو کوئی بھی ایسی شئے نظر نہ آئی جس کی بناء پر اُس کی گزارشات کو قبول کر لیا جاتا۔ چنانچہ مگی ہان نے فیصلہ دے دیا کہ اس کی مرضی کے بغیر سابقہ وکیل کو نہیں بدلا جا سکتا اور پھر نفرت سے بورڈ کی اکثریت کا حوالہ دیتے ہوئے اُنہیں ناراض اور مایوس گروپ قرار دیا اور مزید کہا کہ اُنہیں اس کیس میں دوبارہ مقدمہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا جس کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہو۔ اس حکم نامے کی بدولت اعلیٰ عدالتوں میں تمام اپیلیں مسترد ہو گئیں۔ جبکہ بورڈ کے سابقہ وکیل کی طرف سے مزید پیروی سے معذرت کی وجہ سے بذاتِ خود بورڈ بے دست و پہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا مگی ہان کا فیصلہ برقرار رہا اور رَسل کی تعیناتی کی کوئی صورت باقی نہ بچی تھی۔

جب رَسل کی کردار کشی سمیت مگی ہان کے تفصیلی فیصلے کی اشاعت ہوئی تب رَسل کو مشورہ دیا گیا کہ کسی خود مختار وکیل کے ذریعے جج کے سامنے پیش ہوں۔ چنانچہ امریکن سول لبرٹی یونین کے مشورے پر مسٹر آسمونڈ کے فرینکل کو وکیل کیا گیا جس نے فوری طور پر رَسل کی طرف سے کاروائی میں حصہ لینے کے لیے درخواست دائر کر دی اُس نے یہ بھی درخواست دی کہ گولڈسٹین کی طرف سے رَسل پر لگائے گئے بے بنیاد و شرمناک الزامات کا جواب دینے کی اجازت دی جائے۔ لیکن مگی ہان نے اپنی روایتی ڈھٹائی کا استعمال کرتے ہوئے یہ کہہ کر کہ رَسل کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کیس میں حصہ لے درخوست مسترد کر دی۔ اس فیصلے کو مسٹر فرینکل نے اپیلیٹ ڈویژن آف سپریم کورٹ میں چیلنج کیا لیکن بنچ میں موجود تمام ججوں نے اپنی کاروائی میں کسی وجہ کا ذکر کیے بغیر متفقہ طور پر مگی ہان کے فیصلے کو برقرار رکھا مزید یہ کہ کورٹ آف اپیلز میں یہ فیصلہ لے جانے کی درخواست کو بھی رَد کر دیا۔ غرضیکہ مزید چند ایک اپیلیں جو رہ گئیں تھیں وہ بھی اسی طرح رائیگاں ہو گئیں۔ اس سارے معاملے میں سب سے حیران کُن معاملہ یہ تھا کہ یہ کیس مسز کے کی طرف سے دائر کیا گیا تھا جس کی بیٹی اس قابل نہیں تھی کہ وہ رَسل کی طالب علم ہو سکتی چنانچہ مسز کے کا اس کیس سے بظاہر دُور کا بھی واسطہ نہ تھا لیکن اُس کو تو مقدمہ دائر کرنے کا حق دیا گیا۔ لیکن رَسل جس کی اپنی شہرت اور روزی

روٹی براہ راست داؤ پر لگی ہوئی تھی اُس کا اس کیس سے کسی بھی قسم کا تعلق نہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ پروفیسر کوہن نے تبصرہ کرتے ہوئے بجا طور پر کہا کہ اگر یہ قانون ہے تب پھر ڈِکن کی کی زبان میں "یہ فضولیات ہے"۔

یوں بورڈ آف ہائر ایجوکیشن اور برٹرینڈ رَسل کو مؤثر طریقے سے اپیل کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا اور مگی ہان کا فیصلہ حتمی ہو گیا۔ اس پر جان ڈیوی کا کہنا تھا کہ "بطور امریکن ہمارے سر شرم سے جُھک گئے اس فیصلے نے ہماری انصاف و مساوات کی شہرت کو گہنا دیا ہے۔"

X

کیلیفورنیا سے رَسل ہارورڈ یونیورسٹی پہنچ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مگی ہان کے اعلان سے رَسل اس سرزمین کے کسی بھی سکول یا کالج میں تعلیم دینے کا اہل نہیں ہارورڈ کے صدر اور اس کے ساتھی ذرہ بھر بھی متاثر نہ ہو سکے چنانچہ تھامس ڈورگن کے ایک جوابی بیان میں کہا گیا ہم نے اس تعیناتی پر تنقید کے بارے میں ہر طرح کی آگاہی حاصل کر رکھی ہے لیکن اس کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ رَسل کی یہاں تعیناتی خود یونیورسٹی کے بہترین مفاد میں ہے لہٰذا اُنہوں نے اس کی دوبارہ تصدیق کر دی ہے۔ ہارورڈ میں رَسل کے لیکچر بلا روک ٹوک جاری رہے۔ اگرچہ وہاں زنا بالجبر اور اغواء کے واقعات معمول سے قدرے بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد رَسل بارنیز فونڈیشن پنسلوانیا میں کئی سال تک تعلیم دینے میں مصروف رہے آخر 1944ء میں واپس انگلینڈ آ گئے جہاں جارج ششم نے اُنہیں آرڈر آف میرٹ عطا کیا۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کو شاید تعزیراتی قانون کی اہمیت کا علم نہیں تھا۔ تاہم اس کی طرف سے اس بارے میں لاتعلق رہنا افسوسناک تھا۔ 1950ء میں رَسل نے کولمبیا یونیورسٹی میں لیکچر دیا جہاں اُس کا اتنا شاندار استقبال ہوا کہ وہاں موجود لوگ اُسے زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس زوردار استقبال کو 1784ء میں والٹیئر کے پیرس واپسی میں اُس شاندار استقبال سے تقابل کرتے ہیں جہاں اُسے جیل میں ڈالا گیا تھا اور پھر جہاں سے اُسے ماضی میں ملک سے در بدر کیا گیا تھا اور پھر اُسی سال یعنی 1950ء ہی میں سویڈن کی ایک کمیٹی نے (جس کے بارے میں مفروضہ تھا کہ اُس کا معیار عمومی شائستگی سے گھٹیا درجے کا تھا) لٹریچر کا نوبل اِنعام برٹرینڈ رَسل کو دیا۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ اس پر نہ تو مسز کے کی طرف سے کوئی تبصرہ آیا اور نہ ہی گولڈسٹین اور مگی ہان نے کُچھ کہنے کی زحمت کی لیکن اگر کچھ کہا تو شائع نہیں ہوا۔

✢✢ ✢ ✢✢